

# کھنڈ



ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

## دیباچہ

جادوئی دنیا اور اس کے واقعات، پراسراریت اور مافوق الفطرت سلسلے کائنات کی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہیں۔ اور پھر ہمارا الف لیلوی ادب بھی اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے جس میں مشہور زمانہ داستان، داستانِ امیر حمزہ بھی آفاقی شہرت کی حامل ہے۔ لہذا موضوع کوئی بھی ہو، سلسلہ کوئی بھی ہو، خیر و شر کی جنگ ہر جگہ موجود ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایسے ہی دلچسپ، پراسرار اور مافوق الفطرت واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار سچائی کا پرستار اور قوتِ ایمان کی پختگی کا مالک شوکت حسین ہے۔ جبکہ ”جگدوش“ طلسماتی دنیا کا سب سے بڑا اور منفی کردار ہے۔ مذکورہ داستان میں ”کالی باؤلی“ نامی طلسماتی سرزمین پر ہونے والے انوکھے اور پراسرار واقعات قارئین کے لئے ایک انوکھی طلسم ہو شر با سے کم نہیں۔

قارئین! خیر و شر کے درمیان ہونے والی جنگ کے ناقابلِ یقین اور سنسنی خیز واقعات کا سنگم آپ کو اس وقت تک گرفت میں رکھے گا جب تک آپ آخری صفحہ نہ پڑھ لیں۔

رانی کو آج پھر جناتی دورہ پڑا تھا..... مگر میں جانتا تھا کہ وہ یہ ڈرامہ کیوں ہر دوسرے تیسرے دن دہرایا کرتی تھی لیکن مجبوراً مجھے بھی تایا اور تائی کے ساتھ سنبھالنا پڑتا تھا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور پورا جسم اینٹھ رہا تھا۔ تائی کا رو رو کر برا حال تھا۔ تایا اس کی چار پائی کے سرہانے کھڑے قرآنی آیات کا زیر لب ورد کر رہے تھے۔ میں پانی کا گلاس بھر لایا۔ مگر رانی نے اپنے ہونٹ دانت چبانے کی حد تک بھیج رکھے تھے۔ پھر اس نے غراتی ہوئی کھر دری آواز میں مجھے زور سے جھڑک دیا اور جب میں نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں کے قریب کیا تو اس نے غیر انسانی غراہٹ کے ساتھ میرا گلاس والا ہاتھ دھک دیا۔ جست کا میڑھا میڑھا گلاس دور جا پڑا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا۔ دل چاہا رانی کے اس مکر کا اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش سے جواب دوں مگر تایا اور تائی کی موجودگی میں یہ نہ کر سکا۔ بلاآخر بیزار ہو کر ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

”ہائے رانی کے ابا تو کسی پیر فقیر کو کیوں نہیں بلا لیتا۔ نجانے کون کم بخت آسیب میری بچی کے سر پر سوار ہو گیا ہے۔“ تائی نے بدستور روتے ہوئے تایا سے کہا۔

”اری نیک بنتے پوری گرائیں (گاؤں) میں ڈھونڈ چکا ہوں پر یہاں ایسا کوئی اللہ والا فقیر نہیں ملا۔ پاس کے گاؤں میں بھی گیا تھا۔“ تایا نے جواباً پریشانی سے کہا۔

”شہر تو مل جائے گا ناں کوئی اللہ والا فقیر..... تو ایسا کر رانی کے ابا کہ صبح تڑکے شہر چلا جا..... دیکھ تجھے اللہ کا واسطہ..... میری پھول سی بچی کا کچھ کر لے.....“ تائی

نے داد فریاد کے سے انداز میں کہا۔

پھر تھوڑی دیر بعد رانی کی حالت بتدریج سنبھلنے لگی۔

رانی کی جتنی حالت کے پیش نظر تائی اسے اپنے ساتھ کمرے میں سلاتی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے اس لئے سب اپنے اپنے کمروں میں سویا کرتے تھے۔

میرا تایا اور تائی کے سوا دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔ میرے والدین بچپن میں ہی 6 ستمبر کی جنگ میں شہید ہو چکے تھے۔ میں اپنے والدین کی واحد اولاد تھا۔

سیالکوٹ سے تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر مضافاتی علاقے میں ایک دور افتادہ گاؤں ”بج گرائیں“ کے نام سے موسوم تھا۔ میں ادھر ہی پیدا ہوا تھا۔ چند سو نفوس پر مشتمل یہ گاؤں بڑا خوبصورت، ہرا بھرا، کھیتوں، کھلیانوں سے مالا مال تھا۔ میرے والدین کے شہید ہونے کے بعد میرے تایا اکبر خان نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ ان کی گاؤں میں کھاد کی دکان تھی۔ خوب اچھی آمدنی ہوتی تھی۔ میں بھی دکان سنبھالتا تھا۔ رانی ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ مجھ سے دو تین سال چھوٹی تھی۔ اپنے ڈیل ڈول کے لحاظ سے وہ گاؤں کی ایک الہزنیارن لگتی تھی۔ سرو کی طرح لانا قد اور پر شباب بدن بس یہی اس کے حسن کی تعریف تھی۔ رنگت صاف تھی اور بالوں کی دو چٹیاں ہر وقت کسے رکھتی تھی۔ میں خود میں بانیس کے پیٹے میں تھا۔ بچپن میں میرا قد تو لڑکپنہ تک تیزی سے لانا ہوا تھا مگر میرے جسم میں بوٹی نام کی چیز تک نہ تھی۔ مگر میں نے جب رحمن بابا المعروف گامو پہلوان کے اکھاڑے میں کسرت کرنا شروع کی تو تیزی کے ساتھ میرے جسم کی بناوٹ بدلتی چلی گئی۔

دکان پر زیادہ تر میں ہی بیٹھنے لگا تھا۔ اسی لیے میرے تایا نے بھی مجھے کھلا خرچ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس لئے میں نے ورزش کے ساتھ ساتھ خالص دودھ اور مکھن کے ساتھ ویدھی کے گوشت کا باقاعدہ استعمال شروع کر دیا تھا۔ تایا مجھ سے واقعی بہت محبت کیا کرتے تھے۔ وہ مجھے حقیقتاً اپنا ہی خون سمجھتے تھے۔ یوں تو تائی بھی مجھ سے متا بھری محبت برتا کرتی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس کی ”محبت“ میں ایک غرض کا دخل

تھا اور وہ غرض مجھے اپنا داماد بنانے کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں تائی نے مجھ سے ناروا سلوک برتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے احساس ہونے لگا کہ میں ان کی مجبوری بن چکا تھا۔ تایا جان اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ دکان پوری طرح میں نے سنبھال رکھی تھی۔ دکان سے گھر تک کا جو بھی کام ہوتا تھا رفتہ رفتہ میرے ہی سپرد ہو گیا تھا۔ جب رانی پھول سے پھل دار درخت بن گئی تو تائی کو میں ایک بیگار ملازم کی بجائے گھر داماد اور کماؤ پوت نظر آنے لگا۔ یوں بتدریج اس کے رویے میں متا بھری حلاوت گھٹنے لگی۔

چوں کہ میں رانی کے ساتھ ہی کھیل کود کر جوان ہوا تھا اس لئے وہ مجھے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ میں اس کی چور نگاہوں کا مطلب خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ جب ”چوری“ سے کام نہ چلا تو وہ واشگاف انداز میں میرے گلے کا ہار بننے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کبھی رانی کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا جن نظروں سے وہ مجھے اب تک دیکھتی آئی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ میری بے اعتنائی نے اسے منہ زور گھوڑی بنا دیا۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ اس وقت تایا دکان پر تھے۔ میں ان کیلئے روٹی لینے آیا تھا۔ تائی بھی پڑوس میں گئی ہوئی تھی اور رانی گھر پر اکیلی تھی۔ میں اپنی بھی روٹی دکان پر ہی لے جا کر تایا کے ساتھ کھایا کرتا تھا۔ موقع تنہائی ملتے ہی رانی میرے گلے کو آگئی۔ ”وے شو کے ظالماں تو مجھ سے اتنا کھچا کھچا کیوں رہتا ہے۔ دیکھ میں تیرے لئے کتنی بے چین رہتی ہوں اور تو ہے کہ.....“

”رانی..... یہ کیا حرکت ہے..... ہٹ پرے۔“ میں نے اسے جھڑک کر خود سے دور کیا۔ وہ بدستور مجھے اپنائیت بھری نگاہوں سے تنکے لگی پھر دانستہ تو بہ شکن انگڑائی لے کر ایک ادائے دلربا انداز میں بولی۔ ”شو کے! تو مجھ سے دور کیوں بھاگتا ہے..... کیا میں جوان نہیں..... کھوب صورت نہیں..... دیکھ پورے گرائیں کے منڈے مجھ پر مرتے ہیں اور میں صرف تجھ پر مرتی ہوں..... اتنا بے مروت کیوں بنتا ہے..... ہم دونوں کوئی غیر تھوڑا ہی ہیں..... عنقریب ہماری شادی بھی ہونے والی ہے۔“

میں اس کی شادی والی بات پر پریشان سا ہو گیا اور بے اختیار میرے دل کی بات مارے بوکھلاہٹ کے زبان پر آ گئی۔

”میں نے نہیں کرنی شادی وادی..... تجھ سے..... یہ خیال دل سے نکال دے۔“

میری بات پر اس کا کھلا کھلا چہرہ یکدم بجھ کر رہ گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ ٹھٹھک کر بولی۔

”دیکھ لے مجھ سے شادی نہ کر کے تو نقصان اٹھائے گا۔“

”مثلاً.....“ میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”میری بے بے کو تو جانتا ہی ہے وہ تو تجھے کب سے گھر داماد بنانے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ پھر میرا ابا بھی وہی ارادہ کیے ہوئے ہے۔ تیرے انکار سے دونوں کے دل خراب ہو جائیں گے۔ پھر تیرے یہاں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ تو در کی ٹھوکریں کھائے گا۔“ وہ سفاک لہجے میں کہتی چلی گئی۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

تب پہلی بار مجھے اس کی خود غرضانہ سوچ سے نفرت ہونے لگی۔ میری خاموشی کو اس نے جانے کیا سمجھا کہ وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی اور پھر جلدی سے مجھے رہنمائی کی غرض سے میرے قریب آئی اور اپنی دونوں بانہیں میری گردن کے گرد حائل کرتے ہوئے اٹھلا کر بولی۔

”دیکھ میری بات مان لے..... سکھی رہے گا..... تجھے میں بہت پیار دوں گی..... یہ لے.....“ اس نے محبت کے نشے میں ایک بے ہودہ سی جسارت کر ڈالی۔ میری جگہ اس وقت کوئی اور ہوتا تو وہ..... رانی کے پرشباب سپر ڈالنے پر فوراً ہبک جاتا لیکن مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ آ گیا اور میں نے زور سے اس کے چہرے پر تھپڑ جڑ دیا۔

بس اس دن کے بعد سے رانی پر جتنی دورے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ جن جھپٹ اتارنے والے پیر قسم کے لوگ کسی آسیب زدہ

انسان کے سر سے جن اتار نے کیلئے اس کی خوب پھینٹی لگایا کرتے تھے اس لئے میں تائی کی بات سے متفق تھا کہ رانی کا جن اتار نے کیلئے کسی ایسے ہی پیر کو لایا جائے۔ مجھے یقین تھا رانی کو دو چار ہی ٹھیک ٹھاک قسم کے ”جھاڑ“ پڑ جاتے تو نہ صرف اس کے سر سے عشق کا بھوت بلکہ جن بھی اتر جائے گا۔

چنانچہ یہ کار خیر میں نے کرنے کی ٹھانی اور ایک روز کسی قریبی گاؤں سے پہنچے ہوئے فقیر کو لے آیا۔ یہ ایک ہندو سادھو تھا اور کالے منتر کی مہارت رکھنے کے طور پر اس کی خاصی شہرت تھی۔

سادھو نے آتے ہی سب سے پہلے حزل کی جھاڑی کی دھونی پورے گھر میں دی اور شروع ہو گیا۔

میں اور تائی دوسرے کمرے میں تھے اور ہمیں باہر نکلنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی جبکہ رانی کے کمرے میں صرف تایا جان اور وہ سادھو تھا۔ ذرا ہی دیر بعد مجھے رانی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں لگیں اور اس کے ساتھ ہی سادھو کے غصیلے انداز میں بڑبڑانے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔ تائی اپنی بیٹی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر پریشان ہو گئی جبکہ میں دل ہی دل میں رانی کی درگت بنتے دیکھ کر خوش ہو رہا۔

گھنٹے بھر بعد میں نے رانی کے چیخنے چلانے والی آوازوں کو یکدم قہر آلود غراہٹ میں بدلتے سنا۔ وہ شاید سادھو کو دھمکا رہی تھی۔

”اوائے سادھو..... دفع ہو جا یہاں سے..... تو..... میرا مقابلہ نہیں کر سکتا..... دفع ہو جا ورنہ بے موت مارا جائے گا..... ہا..... ہا..... ہا.....“ اچانک مجھے غیر انسانی قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں لگیں۔ میں بھی ذرا پریشان سا ہو گیا..... اور تب دوسرے ہی لمحے میں نے سادھو کی کرب انگیز چیخوں کی آواز سنی..... اب میرا زیادہ دیر تک کمرے میں رہنا ناممکن تھا۔ میں جلدی سے کنڈی کھول کر صحن میں آ گیا۔ تائی بھی حیران پریشان میرے پیچھے چلی آئی۔ میں نے ابھی دوسرے کمرے کی طرف رخ کیا ہی تھا کہ اچانک مذکورہ کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور پھر میں نے سادھو کو بدک کر باہر نکلتے دیکھا۔ میں ٹھٹھک کر وہی رک گیا۔ وہ اپنے کالے منٹروں کا جاپ

ہوئے..... رام..... رام..... کرتا ہوا بدحواس ہو کر بیرونی دروازے کی طرف یوں دوڑا جیسے اس کے تعاقب میں بھوت پڑ گئے ہوں..... پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سادھویوں تورا کر زمین پر گرا جیسے اسے کسی غیر مرئی مخلوق نے دھوبی پنکادے کر مار گرایا ہو..... وہ صحن کے نیچے فرش پر پڑا اپنی گردن پر غیر مرئی ٹکجنے سے چھڑانے کی کوشش میں بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے حلق سے اب اذیت ناک چیخوں کی خرخراہٹ نکل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی گردن دبوچ لی ہو۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں نے اس سادھو کی آنکھیں ابھتی دیکھیں اور چند ہی لمحے بعد وہ ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔

میں سناٹے کی حالت میں یوں کھڑا اس کی لاش کو دیکھے جا رہا تھا جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا ہو۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے تایا کو گھبرائے ہوئے انداز میں باہر آتے دیکھا۔ پھر فرش پر بے سدھ پڑے سادھو کو دیکھ کر وہ بھی بری طرح چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ اتنے میں رانی مردانہ آواز کے قہقہے لگاتی ہوئی صحن میں آ گئی۔ اس کے چہرے نقوش بری طرح مسخ ہو رہے تھے۔ آنکھیں پوری طرح کھل کر پھٹنے کے قریب تھیں۔ سر کے بال بکھر کر اسے مزید ڈراؤنا بنا رہے تھے۔ وہ سادھو کی لاش کو دیکھ کر اور زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں چلی گئی پھر ذرا دیر بعد رانی کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ تائی اپنا سینہ پیٹنے اندر دوڑی تھی۔ تایا اور میں بھی کمرے کی طرف لپکے..... اندر چار پائی پر رانی بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ تائی نے اسے وارفتانہ انداز میں اپنے سینے سے لگا لیا جواب بالکل نارمل ہو گئی تھی۔ میں اور تایا صحن میں آ کر سادھو کا معائنہ کرنے لگے۔

آنا فانا پورے گرائیں میں رانی کے جن سے متعلق اور سادھو کی پراسرار موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی چلی گئی۔ سادھو کی موت کھلی حقیقت تھی کہ رانی یہ ڈرامہ مجھ سے شادی کرنے کیلئے نہیں کر رہی تھی بلکہ اس پر واقعی کسی آسیب کا اثر تھا۔ یہ خیال آتے ہی پہلی بار میرے وجود میں ایک سردی لہر دوڑ گئی۔ درحقیقت میں ان

محیر العقول باتوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔ میں نے ٹڈل تک تعلیم حاصل کی تھی اور میٹرک قریبی تحصیل سے کیا تھا۔ اس لئے جب میں آج کے ساتھی دور سے اس کا موازنہ کرتا تو مجھے جن جھپٹ کی یہ باتیں بالکل لغو محسوس ہوتی تھیں مگر میں نے آج خود اپنی آنکھوں سے سادھو کو کسی غیر مرئی مخلوق کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ ہمارے گھر گرائیں کے تھانے کا ایک حوالدار چودھری کریم داد بھی اپنے چار کاشییلوں کے ساتھ آدھکا اور سادھو کے پراسرار قتل کے جرم میں محض شک کی بنا پر مجھے اور تایا کو جھکڑیاں پہنائے تھانے لے گیا۔

☆.....☆.....☆

”اوائے اس بے چارے غریب سادھو کی تم سے کیا دشمنی تھی جو تم دونوں نے اس کی جان لے لی۔“

حوالدار چودھری کریم داد نے مونٹے سیاہ رول کو ہمارے سامنے لہراتے ہوئے کڑک دار لہجے میں پوچھا۔

”چوہدری صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہو..... بھلا ہماری اس سادھو سے کیا دشمنی اسے تو ہم اپنی بیٹی رانی کا آسیب اتارنے کیلئے گھبرائے تھے۔“ تایا جان نے حیرت آمیز پریشانی سے کہا۔

”ہوں..... آسیب اتارنے..... ابھی تم دونوں کا آسیب اچھی طرح اتارتا ہوں۔“ حوالدار کریم داد نے ہم دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ پھر یکدم کڑک لہجے میں بولا۔ ”اوائے شرافت سے زبان کھولتے ہو یا ترول کے بعد کھولو گئے۔“ اس بار میں نے لب کشائی کی ہمت کرتے ہوئے حوالدار سے کہا۔

”چوہدری صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے..... وہ سادھو اپنی موت آپ مرا ہے..... آپ پوے گرائیں سے پوچھ لیں ہماری اس بے چارے سے بھلا کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔“ میرا لب و لہجہ مہذبانہ تھا۔ ویسے بھی میں میٹرک پاس تھا اور اس زمانے میں پڑھے لکھے لوگوں کی بہت عزت ہوتی تھی مگر وہ خراٹ حوالدار بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ غرا کر مجھ سے بولا۔ ”او منڈے تفتیش تو میں بعد میں کروں گا پہلے تمہاری تو

زبان کھلوا لوں۔“ یہ کہہ کر اس نے قرب کھڑے باادب سنتری سے کہا۔ ”اوئے بالے! جا ذرا گیارہ نمبر کا لیٹر تولے آ.....“

”ٹھیک ہے حوالدار صاحب! اگر یہ بات ہے تو پہلے ہمیں شہر کی عدالت میں پیش کیا جائے..... میں یہ ذلت بالکل برداشت نہیں کروں گا۔“ میری ذومعنی دھمکی نے اثر دکھایا اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

اتنے میں سنتری ایک چمڑے کا سیاہ دار سانپ کے پھن والا چوڑا لٹراٹھا لایا۔ ”ان دونوں کو لاک کر دو.....“ حوالدار نے تحکمانہ اس سے کہا۔ سردست اتنا ہی کافی ہے۔ لہذا میں بھی خاموش رہا۔ تایا جان کی پورے گرائیں میں عزت تھی جب گاؤں والوں کو اکبر خان (تایا) کی بلا جواز گرفتاری کا پتہ چلا تو پورا گاؤں ہماری ضمانت دینے کیلئے تھانے اٹھ آیا۔ ان میں گاؤں کا نمبردار چودھری حیات محمد خان بھی تھا۔ اب تو حوالدار کے پاس ہمیں چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ متونی سادھو کی بیوی اور اس کا سر جیونہ داس نے بھی اس بات کا اقرار دیا کہ اکبر خان اور میں بے گناہ ہیں۔ انہیں ہم سے یا سادھو سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ وہ اپنی موت آپ مرا ہے۔“ لہذا حوالدار کریم داد کو اب ہمیں چھوڑتے ہی بنی۔ یوں میں اور تایا گھر لوٹ آئے مگر سادھو کی پراسرار موت کے بعد سے گھر کا چین رخصت ہو چکا تھا۔ اس بار تو میں بھی بے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ۔ ”کیا واقعی رانی کو کسی جن جھپٹ کا سایہ تو نہ تھا.....؟“ کم از کم سادھو کی آنکھوں دیکھی موت سے تو یہی پتہ چلتا تھا۔

رانی اب بھلی چنگی ہو گئی تھی مگر کچھ خبر نہ تھی کہ پھر کب اس پر دوبارہ جاتی دورہ پڑنے والا تھا۔ اب تو سادھو کی پراسرار موت کے بعد سے تو تایا جان میں بھی یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا جن اتارنے کیلئے کسی دوسرے عامل کو گھر لے کر آئے۔ تاہم انہوں نے رانی کو سختی سے یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ ہر وقت با وضو رہے اور نماز منجگانہ کی پابندی کرے۔ اس طرح رانی کے دوروں میں ذرا کی واقعہ ہونے لگی تھی۔

ایک روز عجیب واقعہ ہوا..... اور یہ عجیب واقعہ خود میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں نے ایک روز رات میں عجیب ڈراؤنا خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خواب میں میں

ایک ویران کھنڈر کے وسط میں کھڑا ہوں۔ پورا کھنڈر طلسماتی چاندنی میں نہایا ہوا ہے..... پھر اچانک مجھے اس ویران اور پراسرار چاندنی میں نہائے ہوئے کھنڈر کی بوسیدہ در و دیوار سے گونجی آواز سنائی دیتی ہے..... میں دہشت زدہ ہو کر سر پٹ دوڑتا ہوں..... پورے کھنڈر کی فضا میں عجیب سا ارتعاش طاری تھا۔ میں اندھا دھند دوڑے جا رہا تھا مگر کھنڈر کی حدود تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ جاڑوں کے ٹھنڈے ہوئے موسم میں میرا پورا وجود پسینے سے شرابور تھا اور میں اپنے کمرے کی چارپائی پر بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے ابھی سینے کا جنجر توڑ کر باہر آن گرے گا۔ بہر حال میں نے اسے ایک بھیا تک سنے پر محمول کیا۔ اس کا کوئی خاص اثر نہیں لیا مگر اگلے دن پھر دوبارہ میں نے وہی ایک جیسا خواب دیکھا تو مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ پھر تو جیسے ہر دوسرے تیسرے دن تواتر کے ساتھ مجھے یہ ڈراؤنا خواب دکھائی دیتا رہا۔ میں ہمیشہ کی طرح جاگ پڑتا اور میری وہی حالت ہو جاتی یعنی پورا بدن پسینے سے شرابور اور پھولی ہوئی سانس..... مجھے خدشہ لاحق ہونے لگا کہ اگر یہی حالت میری رہی تو کہیں خدا نخواستہ میرا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔

ایک مصیبت تو یہ تھی کہ میں اس کا ذکر تایا تاں سے بھی نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وہ پہلے ہی رانی کی وجہ سے پریشان تھے۔ ایسے میں میں اپنے خواب کے بارے میں انہیں بتا کر مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب میں نے اس کا حل خود نکالنے کا تہیہ کیا۔

اس رات مجھے دوبارہ وہی خواب ہوا۔ اس بار میں نے ذرا ہمت سے کام لینے کی ٹھان لی۔ خواب میں حسب معمول میں نے خود کو اس پراسرار چاندنی میں نہائے کھنڈر میں پایا۔ میں نے اس بار بھاگنے کی کوشش نہ کی۔ دل مضبوط کیے وہیں کھڑا رہا۔ میرے چہرے کو کھنڈر کی سوگوار ویرانی طاری تھی۔ میں حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیات میں کھڑا سر زدہ سا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعۃً وہی ہوا۔ کھنڈر کی دم بخود سی فضا میں دوبارہ ارتعاش ابھرا..... مگر میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ یہ اگر خواب ہے تو خواب ہی رہے گا..... مجھے کوئی گزند نہیں پہنچ سکی پھر کیوں نہ اس کا مجید معلوم کر کے ہی رہوں..... تب

پھر رفتہ رفتہ کھنڈر کی گونج کم ہونے لگی اور بلا آخر ہر سو گہرا سناٹا چھا گیا۔ اچانک میں نے اپنے دائیں جانب ایک ہیولا دیکھا جو ایک منہدم اور تاریک کوٹھری نما کمرے سے نمودار ہوا تھا۔ وہ ذرا قریب آیا تو میں اسے دیکھ کر بری طرح ٹھٹھرا گیا۔ وہ ایک حسین و جمیل دو شیرہ تھی۔ میں اس کے حسن کی تاباکی میں اپنے ارد گرد سے بالکل غافل سا ہونے لگا۔ اس کا چہرہ سو گوار تھا۔ وہ میری طرف چند ٹاپے اداس آنکھوں سے نکتی رہی پھر اس کے بعد وہ دوبارہ واپس اندر کوٹھری میں چلی گئی۔ میرے قدم میکا کی انداز میں خود بخود اس کے پیچھے اٹھتے چلتے گئے اور پھر میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ اندر مدھم چاندنی چھنکی ہوئی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح اس حسین و جمیل اور نازک اندام دو شیرہ کو تلاش کرنے لگا مگر مجھے وہ کہیں نظر نہ آئی۔ دفعۃً مجھے کسی ویران گوشے سے نسوانی سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے قدم بے اختیار آوازوں کی سمت اٹھتے چلے گئے اور میں سال خوردہ سی ٹوٹی ہوئی دیوار سے دوسری طرف آیا تو سامنے ایک چھوٹے سے سنگی چبوترے پر میں نے اس لڑکی کو گھٹنے سینے سر دیئے سکتے پایا۔ میں اس کے قریب بڑھا اور آہستگی سے اس کا سراو پر اٹھایا تو میں چونک پڑا اس کا حسین چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس پر یوشا اس قدر غمگین پا کر میرا دل کٹ کر رہ گیا اور بلا آخر میں نے اس سے ملائمت آمیز حلاوت سے پوچھا۔ ”اے حسین پری! تو کون ہے اور تجھے کیا غم ہے.....؟“

اس نے غمگین نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر اس کے تراشیدہ یا قوتی ہونٹوں میں لرز اہٹ سی ابھری۔

”تت..... تم..... یہاں سے چلے جاؤ..... ورنہ..... ورنہ..... تم بھی.....؟“ اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا انجانا خوف سمٹ آیا۔ میں بھی ڈر گیا۔ بولا۔ ”نہیں..... پہلے مجھے بتاؤ تم کون ہو اور اس ویرانے میں کیا کر رہی ہو؟“

میرے پر زور استفسار پر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ تب پھر اچانک میرے کانوں سے ایک تیز ”خراٹے“ کی آواز ٹکرائی۔ یہ آواز میرے عقب سے ابھری تھی۔ میں نے چونک کر اپنے عقب میں دیکھا تو جی جان سے سر تاپا لرز اٹھا..... وہ ایک غیر

انسانی مخلوق تھی جس کا پورا جسم رپچہ جیسا تھا اور چہرہ..... اُف اس قدر ڈراؤنا چہرہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا..... تھا تو وہ ایک انسانی چہرہ مگر انتہائی مکروہ..... اس کی پیشانی پہ صرف ایک آنکھ تھی اور نتھنوں کی جگہ دو غار ایسے سوراخ تھے۔ باقی تو سارے جسم پر جھبھرے نمابال تھے۔ جبکہ سر اس کا بالکل گنجا تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ باجھوں سے دو لمبے لمبے نوکیلے دانت جھانک رہے تھے۔ وہ کوئی چوپایا جانور نما ادھورا انسان تھا۔ لڑکی نے ایک خوف زدہ سی چیخ ماری..... اور وہ غیر انسانی خوفناک مخلوق اپنی اکلوتی پر نگاہ آنکھ سے مجھے گھورتی ہوئی میرے قریب آنے لگی۔ اس کی زبان سانپ کی طرح دو شاخہ دائیں بائیں لپ لپا رہی تھی۔ میں خود اتنا دہشت زدہ ہو کر رہ گیا تھا کہ مجھے اس حسین دو شیرہ کا بھی خیال نہ رہا اور اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے عقب میں دیکھنے کی بھی جرأت نہ کی تھی۔ مجھے اپنے عقب میں تیز غراہٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مگر میں رکنا نہیں بدستور کھنڈر کی بوسیدہ منڈیریں پھلاکتا ہوا سر پٹ دوڑنے لگا۔ پھر ایک مقام پر اچانک میرا پاؤں رپٹ گیا اور میرے حلق سے بے اختیار مضطربانہ چیخ بلند ہو گئی۔ میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ جلدی میرا خواب ٹوٹے اور اس ڈراؤنے منظر سے میری جان چھوٹے۔ مگر میرے گرنے کے باوجود ایسا نہ ہوا۔ مجھے کہنی میں زخم آ گیا تھا۔ جس کی جلن آمیز میس میں مجھے صاف محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنی زخمی کہنی پر ہاتھ رکھا اور ہمت کر کے اٹھا ہی تھا کہ اچانک میرے عقب میں وہی غیر انسانی مخلوق نمودار ہوئی اور اس نے ایک بھیانک چنگھاڑ مار کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ بے اختیار میرے حلق سے دہشت زدہ چیخ خارج ہو گئی اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

میں اپنے کمرے کی چار پائی پر اٹھ بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح میرا پورا بدن کانپ رہا تھا اور پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ دل جیسے وحشیانہ انداز میں سائیں..... سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ میں نے چند ٹاپے گہرے گہرے سانس لے کر اپنی لرزہ بر اندام کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی اور خدا کا شکر بجالایا کہ میرا وہ بھیانک خواب ٹوٹ چکا تھا۔ اچانک مجھے اپنے دائیں کہنی میں دھن سی محسوس ہوئی۔ میں نے بے اختیار اپنی آستین اوپر سر کائی تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ میری کہنی میں زخم بدستور موجود تھا۔



میرے پورے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ ساری رات میں سو نہیں پایا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس سے پہلے میری کہنی میں کوئی زخم نہ تھا۔ یہ زخم مجھے خواب میں نظر آنے والے اس پراسرار کھنڈر میں آیا تھا جب اس حسین دوشیزہ سے گفتگو کے دوران ایک غیر انسانی مخلوق سے ڈر کر میں بھاگا تھا اور گر پڑا تھا۔ خواب کے وہ بھیاںک مناظر اب تک میرے ذہن میں چکرارہے تھے۔ اس حسین لڑکی کا چہرہ تو بار بار میری چشم تصور میں آ رہا تھا۔ مجھے عجیب طرح کی بے چینی میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ کسی عجیب بات تھی کہاں تو میں اس خواب سے بے زار ہو چکا تھا مگر اب میرے دل میں دوبارہ اس خواب کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ یہ صرف اور صرف اس حسین دوشیزہ کا دوبارہ دیدار کرنے کی وجہ سے تھا۔ اس کی من موئی مگر اداس صورت بھلائے نہیں بھول رہی تھی اور دل میں ایک تڑپ ایک بے چینی ایک بے نام ساجذ بہ ابھرنے لگا تھا۔ اس دن کے بعد تو میری کیفیت دگرگوں ہو گئی تھی۔ اس روز میں سارا دن کھویا کھویا سا رہا تھا۔ رانی کی پراسرار بیماری کی طرف بھی میرا خیال نہیں گیا تھا۔

یہ اس دن کا ذکر تھا۔ میرا دکان میں آج جی بھی نہیں لگ رہا تھا۔ یوں تو میں ہی اکثر دکان میں رہتا تھا مگر کبھی کبھی تایا جان بھی آ جایا کرتے تھے۔ لیکن آج کل رانی کی حالت کے پیش نظر انہوں نے عرصے سے دکان پر قدم نہیں رکھا تھا۔ شام کو سات بجے دکان بند کر دیا کرتا تھا میں۔ آج میں نے گھنٹہ پہلے ہی دکان بند کر دی۔ گھر جانے کی بجائے یونہی پاس کی ندی کی طرف نکل گیا۔ جاڑوں کے دن تھے اس لئے سرشام رات کا گمان ہونے لگتا تھا۔ مگر مجھ پر کچھ ایسی قنوطیت طاری تھی کہ میرے قدم کشاں کشاں ندی کی طرف ہو لیے۔ ندی سے ذرا ہی پہلے گاؤں کا ایک قبرستان پڑتا تھا۔ میں اس کی شکستہ

چہار دیواری کے ساتھ مختصر سے کچے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹک کر ذرا رکا۔ آواز قبرستان کے اندر کہیں سے آئی تھی۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا مگر پھر جب مسلسل ابھرنے والی اس آواز پر غور کیا تو جیسے احساس ہوا یہ کسی کے گھٹ گھٹ کر رونے کی آواز تھی۔ قبرستان کی شکستہ کچی دیوار صرف چار فٹ اونچی تھی۔ میں نے آواز کی سمت گردن گھما کر دیکھا اور ذرا دیوار کے قریب آیا تو سامنے قریب ہی ایک قبر پر میں نے ایک عمر رسیدہ شخص کو روتے ہوئے پایا۔ میں سمجھ گیا بے چارے کا کوئی عزیز فوت ہو گیا ہوگا۔ اب اسے یاد کر کے رو رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے آگے نکل جانا چاہا مگر..... پھر اسے روتا دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا اور انسانی ہمدردی کی خاطر میں اس بوڑھے کی دلجمعی کی غرض سے ٹوٹی ہوئی دیوار ٹاپ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ آہٹ پا کر وہ بوڑھا میری طرف متوجہ ہوا۔ وہ گاؤں کا ہی رہنے والا لگ رہا تھا۔ میں نے اسے احتراماً دھیرے سے سلام کیا۔ پھر پوچھا۔

”بابا..... یہ شاید آپ کے کسی عزیز رشتے دار کی قبر ہے؟“

بوڑھے نے اپنے جھریوں بھرے چہرے سے آنسو صاف کیے پھر غمگین لہجے میں بولا۔ ”ہاں پتر! یہ..... میری بیٹی کی قبر ہے..... جو بے چاری نوجوانی میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔“ اس کی بات پر مجھے بھی دکھ ہوا تھا۔ یہ غم ہی ایسا تھا جو ان اولاد کی موت کا غم ماں باپ کیلئے پہاڑ جیسا بوجھ ہوتا ہے..... جو ساری عمر بے چاروں کو اپنے سینے میں بے چین اور آزادہ ہی کیے رکھتا ہے۔ میں نے اسے تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

”بابا.....! حوصلہ کرو..... اللہ تمہاری بیٹی کو جنت نصیب کرے..... کیا تمہارے اور کوئی اولاد نہیں ہے؟“

”نہیں پتر میرا تو دنیا میں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں..... ایک سوئی ہی تھی اسے بھی رب نے لے لیا۔“

وہ غم زدہ لہجے میں بولا۔ ”سوئی۔“ شاید اس کی بیٹی کا نام تھا جس کی قبر کے پاس وہ اس وقت موجود تھا۔ میں نے بوڑھے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے گھر چلنے کو کہا۔ اس بے چارے کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ اس کا ضعیف وجود شدت غم سے

ہو لے ہو لے کچکا بھی رہا تھا۔ وہ میرے گلے سے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اس کا بیٹا تھا۔ میں نے باپ کا پیار نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جیسے ایک باپ ہی کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ میرا جی اسے اکیلا یہاں چھوڑنے کو نہ چاہا اور اس کے ساتھ اسے اس کے گھر تک چھوڑنے چل پڑا۔

اس کا گھر عام سا تھا جیسا کہ ایک غریب آدمی کا ہونا چاہئے تھا۔ دو کوٹھری نما تنگ و تاریک کمرے تھے۔ صحن البتہ کشادہ تھا جس کے وسط میں ایک جھلنگا سی کھری چار پائی بچھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرہ بڑھے سلتے سے سجا ہوا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے کسی گرسٹن کا کمرہ ہو۔ اچانک میری نگاہ سامنے دیوار پر ایک چوبی فریم پر لگی بڑی سی تصویر پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے میں پھٹی پھٹی نظروں سے اس تصویر کو کتنے لگا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں سامنے دیوار پر آویزاں جس تصویر کو دیکھ رہا تھا وہ حقیقت ہے یا خواب۔ میں نے جلدی سے اپنی چٹکی بھری، مجھے تکلیف کا احساس ہوا، اس کا مطلب تھا یہ خواب نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔

”پتر..... یہی تو میری بد نصیب بیٹی..... سوئی کی تصویر ہے۔“ اچانک بوڑھے نے رنجیدہ لہجے میں کہا اور تب کہیں جا کر میرا سکتہ ٹوٹا مگر پھر میرے کپکپاتے ہونٹوں سے نکلا۔

”یہ..... یہ..... یہ تمہاری بیٹی..... کب..... اور کس طرح فوت ہوئی تھی؟“

”بیٹا یہ نہ پوچھو مجھ سے میرا زخم ہرا ہو جائے گا؟“ وہ پھر رونے لگا۔ میں نے اس سے معذرت چاہی اور ایک بار پھر آگے بڑھ کر تصویر کو غور سے دیکھا۔ بالکل وہی ناک نقشہ تھا، وہی بڑی بڑی سیاہ جھیل ایسی آنکھیں..... بیضوی سرخ و سپید چہرہ..... ریشمی اور گھنیرے بال، ستواں ناک اور صراحی دار گردن..... وہی لڑکی تھی یہ جو میں نے خواب میں اس پر اسرار کھنڈر میں دیکھی تھی۔ یا اللہ یہ کیا پراسرار چکر تھا؟ یہ کیا ماجرا تھا؟ کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں۔ میں نے بابا سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے احمد دین بتایا۔ میں پھر وہاں سے سیدھا گھر آ گیا۔ گھر پہنچا تو وہاں کھرام مچا ہوا تھا۔ ایک روح فرسا خبر میری منتظر تھی۔

تائی نے رو رو کر آسمان پر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ تایا سر پکڑے بٹھے تھے۔ پاس پڑوس کے لوگ انہیں سنبھالا دینے میں مصروف تھے۔ میں اپنی پریشانی بھول کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ تایا مجھے دیکھتے ہی بولے۔

”پتر..... رانی پتہ نہیں کدھر چلی گئی.....؟“ یہ سن کر میرا رنگ فق ہو گیا۔

”کک..... کیا..... تایا..... کہاں گئی وہ..... کب گئی؟“ میں نے لکت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”اے ڈھونڈ لے پتر..... میں..... میں ساری حیاتی تیرا احسان نہیں بھولوں گا..... میری رانی کو ڈھونڈ لے شو کے..... آج تو میرا خون ہونے کا حق ادا کر دے۔“

”تایا..... تایا..... حوصلہ پکڑ..... اللہ بہتر کرے گا..... مجھے بتا تو سہی رانی کیسے گم ہوئی ہے اور کب یہ واقعہ پیش آیا ہے؟“ میں نے اسے سہارا دے کر پریشانی سے پوچھا۔ ادھر تائی کو بدستور غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

”پتر..... مجھے کچھ نہیں معلوم..... مجھے کچھ نہیں پتہ..... وہ دوپہر کو ندی پر گئی تھی پانی بھرنے وہاں سے نہیں لوٹی اس کا ٹوٹا ہوا گھڑا زمین پر پڑا ملا تھا..... جا..... جا..... کر..... اے ڈھونڈ لے..... میں نے تو پورا گاؤں چھان مارا اپنی رانی کی تلاش میں۔“

تایا کا غم سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس کی اور تائی کی حالت زار دیکھ کر میرا جی کٹنے لگا اور پھر میں وہاں نہیں ٹھہرا۔ رات کے اندھیرے میں، میں ندی کی طرف دوڑ پڑا۔

میرے حاتمہ گاؤں کے چند لوگ بھی تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہیں رانی خدا نخواستہ بہتی ندی میں نہ جا گری ہو۔ کچھ لوگ جو تیرنا جانتے تھے انہوں نے ندی کے

اندر بھی مقدور بھر رانی کی لاش ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر بے سود..... ناچار ہم سب واپس لوٹ آئے۔ گاؤں تھا ہی کتنا بڑا..... چند سونفوس پر تو مشتمل تھا۔ رانی کو نہ ملتا تھا وہ نہ ملی مگر اگلے دن لوگوں کی زبان پر جب تک یہ دہلی دہلی افواہ گرم ہو چکی تھی کہ رانی چپکے سے اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی ہے مگر میری کوششوں کے باوجود کسی سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گاؤں کا کوئی نوجوان لڑکا تو نہیں گھر سے بھاگا تھا۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہاں تک بھی کہہ رہے تھے کہ..... جو جن رانی پر عاشق تھا وہ ہی اسے لے اڑا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ میں نے گاؤں کے تھانے میں رانی کی پراسرار کشدگی کی رپورٹ لکھوا دی تھی۔ وہاں اس خزانہ حوالدار چوہدری کریم داد نے بھی واضح لفظوں میں اپنے اس شک کا اظہار بڑے استہزائیہ انداز میں کر ڈالا تھا کہ رانی ضرور اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ لہذا اب ہمیں خاموشی سے اس کے ”کورٹ میرج“ کا انتظار کر لینا چاہئے۔ مجھے حوالدار کریم داد کی اس یادہ گوئی پر طیش تو بہت آیا مگر میں اپنے غصے کو پٹی گیا تھا۔ میں رانی کو اچھی طرح جانتا تھا وہ ایسی ہرگز نہیں تھی کہ اپنے ماں باپ کی عزت پر یوں بٹا لگا کر کسی لڑکے والے کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی کیوں کہ مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی اور میرے سوا کسی اور سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

پھر مجھے ایک اور روح فرسا خیال آیا کہ کہیں اس نے مجھ سے دل برداشتہ ہو کر واقعی عداوت میں کود کر خودکشی تو نہیں کر لی تھی.....؟ یا..... یا..... پھر کہیں سچ سچ وہ جن..... اس سے آگے کچھ سوچنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکا اور منہ لٹکائے میں بے نیل و مرام گھر لوٹ آیا۔

رانی اگر اپنے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے مرجاتی تو کسی طرح تایا تائی کو صبر آ جاتا مگر جوان اولاد اور وہ بھی لڑکی ذات کا اس طرح غم ہو جانا نہ صرف ساری عمر کا داغ تھا بلکہ ناقابل فراموش غم تھا۔ بے چارے تایا تائی تو اس غم میں زندہ لاشوں کی مثل ہوئے جاتے تھے۔ مجھ سے ان کا غم نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ دن پہ دن چڑھنے لگے مگر رانی کا کچھ پتہ نہ چلا..... آخر تک آ کر میں رانی کو شہر جا کر تلاش کرنے نکل پڑا۔ پہلے

سیالکوٹ آیا پھر لاہور اس کے بعد ملتان اور پنجاب کے جتنے شہروں میں رانی کو ڈھونڈ سکتا تھا ڈھونڈ لیا۔ اب تو میرے پاس روپے بھی بس اتنے ہی بچے تھے کہ میں واپسی کا کرایہ کر کے اپنے گاؤں پہنچ جائے۔ بیچ گرائیں کا مطلب پانچ گاؤں کا مجموعہ تھا۔ میں نے اور تایا نے آس پاس کے گاؤں بھی تلاش کر ڈالے تھے مگر رانی کو جانے آسمان نکل گیا تھا یا زمین کھا گئی تھی۔ اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔“

رانی کی یوں اچانک اور پراسرار کشدگی کا مجھے دلی رنج تھا۔ آخر کو وہ میرے ساتھ ہی کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کی طرف کبھی میں نے ان نظروں سے نہیں دیکھا تھا جن نگاہوں سے وہ مجھے دیکھتی تھی مگر پھر بھی وہ رشتے میں میری تایا زاد بہن تھی اور میرا بہت خیال رکھا کرتی تھی۔ اس کی نٹ کھٹ طبیعت اس کی شوخ و خشک باتیں اس کی شرارتیں سب مجھے یاد آ رہی تھیں۔ ایک ٹائیپے کو تو مجھے یوں بھی لگتا تھا جیسے میں بھی واقعی اس سے محبت کرتا تھا اب وہ مجھ سے پچھڑی تھی تو احساس ہو رہا تھا۔ مگر یہ احساس زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور جلد ہی ایک بار پھر اس کھنڈر والی حسین دوشیزہ کا دل آویز سراپا میرے دل و دماغ پر سوار ہو گیا۔ ساتھ ہی مجھے اس بات پر غم آمیز حیرت بھی ہو رہی تھی کہ آخر یہ کونسا پراسرار چکر تھا۔ اس بوڑھے کی بیٹی سوئی کی مشابہت حیرت انگیز طور پر خواب میں اس پراسرار کھنڈر میں نظر آنے والی حسین دوشیزہ سے کس قدر ملتی تھی۔ اگر سوئی مر چکی تھی تو پھر..... وہ کھنڈر والی لڑکی کون تھی؟“

ایک روز رات کو میں نے پھر وہی پراسرار خواب دیکھا۔  
حسب معمول میں اس کھنڈر میں موجود تھا۔

اس بار ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ میرے دل میں خوف کی ذرا بھی رمت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ میری بے چین نظریں اس حسین دوشیزہ کو تلاش کر رہی تھی۔ آج کھنڈر میں چاندنی کم اور تاریکی زیادہ چھائی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے اس غیر انسانی جانور نما مخلوق کا خیال تو میرے پورے وجود میں خوف کی لہریں سراپت کر گئی۔ ہر سو گہری ویرانی اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ وہ لڑکی مجھے جس مقام پر ملی تھی وہ یہاں سے دور نہ تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ میں خواب دیکھ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میں خواب میں ہوں

”میں یہی تو پوچھنا چاہ رہا ہوں اے ماہ پری تو اپنوں سے کیوں کر پھڑی.....؟ کس نے تیری جیسی حسین اور معصوم لڑکی پر یہ ظلم کیا..... تیرے اپنے کون تھے؟ دیکھو خدا کیلئے اس پر اسرار راز سے پردہ اٹھا دو..... نہیں تو..... نہیں تو..... میں..... میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ میں نے دکھ و کرب کے انتہائی احساس تلے اس سے فریاد کے سے انداز میں کہا۔

”اچھا..... تم اگر سننا چاہتے ہو تو سنو۔“ معاہدہ فیصلہ کن قطعیت سے بولی اور میں پورے اشتیاق کے ساتھ ہم تن گوش ہو گیا۔

”میں ایک بچہ گرائیں نامی گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ اور بابا موسیٰ کی اکلوتی بیٹی سوئی ہوں۔“ اس نے جیسے ہی اتنا بتایا میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میرا شبہ یقین میں بدل گیا تھا۔ یہ اس بد نصیب بوڑھے کی بیٹی سوئی تھی جس کی قبر پر وہ مجھے روتے ہوئے ملا تھا۔ ”یا اللہ یہ کیا ماجرا تھا؟“

اچانک میری سماعتوں سے تیز چنگھاڑ کی آواز ٹکرائی، میں بری طرح دھل گیا۔ یہ اسی غیر انسانی مخلوق کی آواز تھی جسے میں یہاں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کی چنگھاڑ کی آواز پر سوئی کی دلکش آنکھوں میں ایک انکی خوف کے سائے سمٹ آئے اور اپنی کٹھا بھلا کر مجھ سے متوحش لہجے میں بولی۔

”تت..... تم چلے جاؤ..... ورنہ..... ورنہ..... وہ جگدوش..... تمہیں مار ڈالے گا۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ مجھے بھد..... بھد..... کی آواز سنائی دی۔ خود میں بھی دھل گیا، جگدوش شاید اس خوفناک غیر انسانی مخلوق کا نام تھا مگر میرا دل سوئی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا، میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اس کے باپ سے ملا ہوں..... وہ اسے یاد کر کر کے روتا رہتا ہے۔

”سوئی! چل تو بھی میرے ساتھ.....“ میں نے بے قراری سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بھد..... بھد..... بھد کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ سوئی میری بات پر پریشان ہو گئی اور بولی۔

”تم چلے جاؤ..... میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاسکتی۔“

شاید اس لیے یہ سوچ کر میں نے اس مقام کی طرف قدم بڑھا دیئے جہاں وہ اداس سی ماہ جمال بیٹھی رو رہی تھی اور بعد میں اس جانور نما ہیبت ناک مخلوق نے مجھ پر وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ حملہ کر ڈالا تھا خواب تو خواب ہے اگر اس بھیا نک درندہ نما غیر انسانی مخلوق نے مجھ پر حملہ بھی کیا تو میرا خواب خود ہی ٹوٹ جائے گا۔

میں اس شکستہ اور اجاز کوٹھری نما کمرے کے جب نزدیک پہنچا تو مجھے اندر سے اس پری جمال کے سسکیاں لینے کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں اور میرے اندر بے اختیار اس کے شوق دیدار کی خواہش ابھری۔ پھر میں رکے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ اس بار وہ مجھے اپنے بالکل قریب سامنے ہی کھڑی مل گئی۔ وہ شکستہ انداز میں ایک ٹوٹے ہوئے ستون سے لگی کھڑی آنکھیں موندے سک رہی تھی۔ میں ایک لمحے کو مبہوت سا کھڑا اسے نکلنے لگا۔

”بالکل وہی چہرہ تھا۔“ میں نے دل میں سوچا۔

”یہ وہی چہرہ تھا جس کی تصویر میں نے اس غم زدہ بوڑھے کے گھر دیکھی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ..... کہیں یہ پر اسرار حسین دوشیزہ اس بوڑھے کی بیٹی سوئی تو نہیں تھی؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا وہ تو مر چکی تھی..... پھر یہ کون تھی؟“ میں نے بہر حال پہلے ہی سے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس پر اسرار دوشیزہ سے اس کے بارے میں پوچھ کر رہوں گا۔ چنانچہ میں اس کے قریب بڑھا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے غم زدہ سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر چونک کر بولی۔

”تت..... تم.....؟ تم پھر یہاں آ گئے.....؟“

”ہاں اے اپسرا تو نے میرے دل کا چین لوٹ لیا ہے..... آج..... تجھے بتانا ہو گا مجھے کہ تو کون ہے.....؟ تیرا نام کیا ہے..... اور..... اور..... تو اس ویران اور اجاز کھنڈر میں یوں تنہا کیوں رہتی ہے.....؟“ میں نے بے قراری سے کہا اور تنویری انداز میں اس کے ذرا اور قریب آ گیا۔ اس نے میری طرف مجبور نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے یاقوتی لبوں پہ خاموش سی جنبش ابھری پھر بولی۔ ”اے نوجوان میرے بارے میں جان کر کیا کرو گے؟ میں تو ایک بد نصیب لڑکی ہوں جو اپنوں سے چھڑ کر ادھر آ گئی۔“

”نہیں..... آج میں یہ راز جانے بغیر نہیں جاؤں گا کہ..... یہ پراسرار خواب صرف مجھے ہی کیوں نظر آتا ہے۔ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو صرف اور صرف تم ہی جانتی ہو۔“ میرے قطعت بھرے لہجے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا پھر وہ بولی۔  
”یہ ناممکن ہے..... نہ میں تمہارے ساتھ کہیں جاسکتی ہوں تا تم مجھے حاصل کر سکتے ہو۔“

”مگر سوئی..... میں تو..... میں تو تیرے بغیر مر جاؤں گا..... تمہیں حاصل کرنا تو اب میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن چکی ہے۔“  
میں جذبات سے لبریز ہو کر بولا اور میرے لہجے کی شدت اور تڑپ دیکھ کر سوئی کے مسلح چہرے پر حیرت ناک اداسی طاری ہو گئی۔ یہ حقیقت تھی کہ میں اس پر بری طرح فریفتہ ہو گیا تھا اور مر مٹنے کی حد تک اسے چاہنے لگا تھا۔ ”پتہ ہے سوئی..... وہ..... میں..... میں تیرے باپ سے بھی ملا تھا۔“ میں نے اسے اچانک بتایا۔ وہ چونک کر خوشی سے میری طرف نکلے لگی۔

”ہاں سوئی! وہ بے چارہ تیری قبر پر کھڑا رہا تھا۔ پھر مجھے جب اپنے گھر لے گیا تو تیرے کمرے میں دیوار پر لگی تیری تصویریں دکھا کر بولا تھا کہ یہ میری بیٹی کی تصویر ہے۔“

میری بات پر سوئی بری طرح چونکی۔ پھر اس کے چہرے پر شدید نفرت کے آثار ابھرے۔

”میری قبر.....؟ یہ یقیناً اس کمینے جگہ دوش کی سازش ہوگی۔“ وہ غصے سے دانت پیس کر بولی۔

”سازش.....؟ کیسی سازش سوئی..... کیا وہ بوڑھا تیرا باپ نہیں تھا.....؟ اور..... اور..... وہ قبر تیری نہیں تھی.....؟“ میں نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

”وہ میرا بد نصیب باپ ہی ہے جس سے تم ملے تھے..... وہ تصویریں میری ہی تھیں..... میں ہی اس کی بیٹی تھی..... وہ..... مگر..... مگر“ وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکی اور اس لمحے مجھے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔

”بد بخت انسان تو پھر یہاں آ دھمکا۔“ میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ میرے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر وہی جانور نما ایک آنکھ والا خوفناک درندہ کھڑا اپنی اکلوتی آنکھ سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس بار مجھے اس سے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ جواباً میں بھی اس کی ایک آنکھ کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں یہاں خود نہیں آتا ہوں۔“

”ہوں..... تو یہ شرارت یقیناً اس بڑھے کمالی شاہ کی ہوگی۔ دیکھ لوں گا میں اسے بھی اچھی طرح..... میرا نام بھی جگہ دوش ہے.....“ وہ ایک آنکھ والا جگہ دوش غصے سے دانت پیس کر بولا۔ پھر اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرا خواب توڑنے کیلئے اب مجھ پر چھلانگ لگانے والا تھا۔ اسی لئے میں فوراً ہی محتاط ہو گیا..... پھر جیسے ہی اس نے ایک دل ہلا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر جست لگائی میں یکدم جھکائی دے کر ایک طرف ہو گیا۔ وہ اپنی چھلانگ میں دوڑ جا پڑا مگر میں جیسے ہی پرے سرکا تو میرا پاؤں ایک پتھر سے رپٹ گیا۔ ایک شکستہ دیوار کے نوکیلے سرے سے میرا سر ٹکرا گیا۔ بے اختیار میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی اور پھر میرا خواب ٹوٹ گیا۔ میں اپنی چار پائی پرائیڈ بیٹھا۔ اس بار میری کیفیت مختلف تھی۔ نہ میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور نہ ہی میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ ہاں البتہ مجھے اپنے سر میں درد ضرور محسوس ہوا..... میں نے بے اختیار درد والی جگہ پر ہاتھ رکھا تو مجھے چیچپاٹ کا احساس ہوا۔ میرے ہاتھ میں خون لگا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا یہ چوٹ مجھے اس پراسرار کھنڈر میں جگہ دوش کی جست سے بچنے پر دیوار سے ٹکراتے ہوئے لگی تھی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر زخم دھویا..... ہلکا سا مرہم لگا دیا۔

میرے دماغ میں سائیں..... سائیں..... ہو رہی تھی، بہت سی ایسی باتیں تھیں جو میرے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ جنہیں سبکا کر کے میں ان پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بات کی تو مجھے تصدیق ہو چکی تھی کہ سوئی اس بد نصیب اور غم زدہ بوڑھے کی بیٹی تھی۔ مگر سوئی کی قبر سے متعلق سوئی کا انکار مجھے تعجب آمیز الجھن میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ پھر اس بد بخت جگہ دوش کا کسی بوڑھے کمال شاہ کے بارے میں غصے کا

اظہار کرنا اس بات کو ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص سے خائف بھی تھا جو اس کی ٹکر کا تھا مگر کمال شاہ کون تھا؟ میرے ذہن میں یہ نام انک کر رہا گیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ سوئی مری نہیں تھی..... مگر پھر وہ قبر کس کی تھی؟ جس کے قریب وہ بوڑھا کھڑا رہا تھا۔ اس نے کس برتے پر اتنے یقین سے مجھ سے کہا تھا کہ سوئی مر چکی ہے۔ میں اس مردود جگہ دوش کو کوسنے لگا کہ اگر ذرا دیر اور وہ نہ آتا تو یقیناً سوئی سے یہ راز بھی معلوم کر لیتا۔ سوئی کا من موہنا سا خیال آتے ہی میرے دل میں ایک بار پھر اس کی تڑپ جاگ اٹھی۔ میں سوئی کے عشق لازوال میں بالکل غرق ہو چکا تھا۔ مجھے اب ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے میری زندگی کا سب سے بڑا اور اہم مقصد سوئی ہی کو حاصل کرنا رہ گیا تھا۔ اور اب تو اسے حاصل کیے بغیر مجھے سکون بھی کہاں ملتا تھا۔

اچانک مجھے جگہ دوش..... کی ایک بات کا بھی خیال آیا کہ جب میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ میں یہاں خود نہیں آتا ہوں۔“ تو وہ غصے سے دانت پیس کر بولا تھا۔

”یہ شرارت یقیناً اسی بڑھے کمالی شاہ کی ہوگی۔“ میں دماغ پر زور دیتے ہوئے سوچنے لگا کہ واقعی کسی کمالی شاہ نامی بزرگ کی کرامات کی وجہ سے مجھے تقریباً ہر روز یہ خواب نظر آتے ہیں..... کیا کمالی شاہ نامی یہ بزرگ مجھے کسی خاص مقصد کیلئے یہ پراسرار کھنڈر والا خواب دکھاتا ہے..... مگر.....؟“

اب میرے دل و دماغ کو ایک نئی کھد بد لگ چکی تھی۔ میں نے سب سے پہلے سوئی کے باپ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اس کی بیٹی سوئی کس طرح فوت ہوئی تھی یا پھر وہ قبر کس کی تھی۔

میں نے اس رات کا بقیہ پہر آنکھوں میں کاٹ دیا اور صبح سویرے سوئی کے باپ کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ گھر پر ہی موجود اپنے کوٹھری نما گارے مٹی والے کچے کمرے میں ایک کھری چارپائی پر بیٹھا گڑ گڑوں جمارہا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بھلا اس یہاں پر رکھا ہی کیا تھا اور کیا ہوتا تھا وہاں۔ سوائے ایک غم زدہ بوڑھے باپ کے دکھوں کے..... مجھے دیکھتے ہی بوڑھا خوش ہو گیا۔

”آ..... پتر بیٹھ..... اچھا ہوا تو آ گیا۔ تجھے دیکھ کر میرے دل کی اداسی کم

ہونے لگتی ہے۔ پر تو نے ہالے تک اپڑاں نا نہیں دسا۔“

”میرا نام شوکت ہے بابا..... شوکت حسین۔“ میں کھا دوالے اکبر خان کا ہتھکڑا ہوں۔“

”اچھا..... تو اکبر خان کا پتر ہے..... او یار..... ہتھکڑا بھی بیٹے ہی کی طرح ہوتا ہے۔“ وہ بولا۔ پھر جیسے اچانک اسے یاد آیا۔ اور میری طرف دیکھ کر قدرے چونک کر بولا۔ ”کیا یہ وہی اکبر خان تو نہیں جس کی بیٹی رانی کھو گئی ہے۔“

میں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ تو وہ جلدی سے بولا۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ اس پر کسی جن جھپٹ کا بھی اثر تھا؟“

”ہاں چاچا..... پتہ نہیں بے چاری رانی کدھر کھو گئی ہے۔“ میں دکھی لہجے میں بولا۔

”کک..... کہیں..... یہ اس شیطان کی کارستانی تو نہیں.....؟“ اچانک بوڑھے نے خود کلامیہ انداز میں قدرے تشویش سے کہا تو میں نے چونک کر پوچھا۔

”چاچا..... تم کسی شیطان کی بات کر رہے ہو..... کس کی کارستانی ہے یہ.....؟“ میرے اچانک مستفسر ہونے پر وہ یکدم گڑ بڑا گیا اور آئیں بائیں شائیں کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”نن..... نہیں کا کا..... بس ایسے ہی زبان پھسل گئی تھی۔ مجھ جھلے کی۔“

”نہیں چاچا تو نے بھی ایک شیطان کا ذکر کیا تھا۔ مجھے بتا..... میری رانی کو کس نے غائب کیا ہے؟“

میں نے اصرار کیا تو اس کے جھریوں پر بھرے چہرے پر ہلکے سے خوف کے تاثرات رقصاں ہو گئے۔ میرا دل جانے کیوں بے طرح دھڑکنے لگا۔ پھر اسے طویل پرسوج خاموشی میں مستغرق پا کر میں نے دوبارہ کہا۔

”چاچا..... مجھے بتانا..... یہ کس کی کارستانی ہے..... دیکھ پھر میں بھی تجھے ایک بات بتاؤں گا۔ تیری بیٹی سوئی کے بارے میں۔“

میں نے اسے بولنے پر اکسانے کی خاطر ایسا کہا تھا۔ مگر میری بات سن کر

یاس زدہ لہجے میں بولا۔ ”اب میں اپنی سوئی کے بارے میں کچھ سن کر کیا کروں گا۔ وہ تو بے چاری اس دنیا میں رہی نہیں اب۔“

”چاچا اگر میں تجھ سے کہوں کہ میں تیری بیٹی سوئی سے روز ملتا ہوں تو۔“ میں نے جیسے دھا کہ کیا۔ بوڑھے کا مرجھایا ہوا چہرہ متغیر سا ہو گیا پھر غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ..... یہ..... یہ تو کیا کہہ رہا ہے..... تو سوئی سے بھلا کیسے ملتا ہے..... وہ تو بے چاری مر چکی ہے؟“

”نہیں چاچا میں خود سوئی سے ملا ہوں..... اس نے خود مجھ سے کہا تھا کہ میرے بابا کو بتانا یہ بات کہ..... میں مری نہیں ہوں..... زندہ ہوں..... اور ایک شیطان کی قید میں ہوں۔“ میں نے کہا تو بوڑھے کا چہرہ یکدم کھل اٹھا۔

مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ غیر یقینی لہجے میں بولا۔ ”مگر..... یہ کیسے ہو سکتا ہے..... م..... میں نے تو..... میں نے تو..... خود ان بوڑھے ہاتھوں سے اس کی لاش قبر میں اتاری تھی یہ جھوٹ ہے..... تو جھوٹ بول رہا ہے۔“

”نہیں چاچا..... نہیں..... میں سچ کہہ رہا ہوں..... میری بات کا یقین کر.....“ میں نے پر جوش اعتماد سے اس سے کہا اور پھر دھیرے دھیرے اسے اپنے بار بار ایک ہی پراسرار خواب کے بارے میں بلا کم و کاست تفصیل سے بتا ڈالا۔ وہ میری رام کہانی سن کر ایک لمحے کو دم بخود سا رہ گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے اس کے جھری دار چہرے پر دیدنی مسرت کے آثار ابھرے تھے۔ دفعۃً بے قراری سے بولا۔

”م..... م..... مجھے اب یقین آ گیا تو..... تو بالکل صحیح کہہ رہا ہے..... پتر..... تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے مگر..... پھر..... وہ کون تھی..... جسے میں نے قبر میں اتارا تھا۔“

”یہی بات تو مجھے تجھ سے پوچھنا ہے چاچا اب تو مجھے بتا کہ کیا سوئی کو تو نے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا تھا..... مگر اس سے پہلے یہ بتائے گا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کس شیطان کی بات کر رہا تھا؟“

میں نے پر زور لہجے میں اسے یاد دلایا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”پتر میں تجھے شروع سے ساری تفصیل بتاتا ہوں کہ سوئی کا کن حالات میں انتقال ہوا تھا۔ اس شیطان مردود کا ذکر بھی اس میں آئے گا۔ پھر تو خود ہی میری بات سمجھ جائے گا۔ لے اب سن۔ وہ چند ٹاپے سانس لینے رکا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ہمد تن گوش ہو گیا پھر وہ بتانے لگا۔

”شو کے پتر! وہ جاؤں کے ٹھٹھرتے ہوئے دن تھے۔ میری دھی سوئی میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ اس کی ماں کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ میں نے دوسری شادی اس غرض سے نہ کی تھی کہ کہیں وہ بے چاری سوتیلی ماں کو قبول نہ کرے یا وہ اس کی بے اعتنائی اور ظلم کا شکار نہ ہو سکے..... بہر حال..... سوئی کو میں نے باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار دینے کی بھی کوشش کی تھی۔ وہ جوان ہوئی تو مجھے اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور وہ شادی کے نام سے گھبراتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتی تھی شادی کے بعد میں اکیلا رہ جاؤں گا..... مگر اس کی شادی تو بہر حال کرنا ہی تھی۔ خیر..... ایک روز بہت دھواں دھار بارش ہو رہی تھی وہ رات کا وقت تھا سوئی کو میں نے اپنے کمرے میں ہی دوسری چار پائی پر سلا لیا تھا۔ جو بے چاری ڈرتی بھی تو بہت تھی۔

اچانک..... باہر دروازے پر دستک ہوئی..... مجھے حیرت ہوئی کہ آخر اس قدر برستی ہوئی طوفانی رات میں بھلا کون آ گیا تھا.....؟ مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں بے چارہ کوئی مسافر نہ ہو..... میں نے اس کی مدد کرنے کی خاطر دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا۔

☆.....☆.....☆

آیا۔ یہاں کچے میں فرش پر صرف ایک بوسیدہ سی دری پچھی ہوئی تھی۔ مسافر نے اپنے کاندھے پر ایک پتھی بھی اٹھا رکھی تھی وہ وہیں دری پر ہی بیٹھ گیا۔ بابا اسے دیکھ کر بولا۔  
”کچھ کھایا پیا ہے یا لا دوں کچھ..... روٹی اور ساگ پڑا ہوگا۔“

”لا دے..... پھر..... بھوک تو لگی ہے مجھے۔“ مسافر نے کہا۔ بابا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ چند ثانیے کھڑا اس بات کا منتظر رہا کہ وہ مسافر اپنے چہرے سے ذرا چادر ہٹائے تو اسے ایک نظر دیکھ لے مگر بابا کو حیرانی ہوئی کہ اندر کوٹھری میں آنے کے باوجود اس نے اپنے چہرے تک سے بھی چادر ہٹانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی۔ دوسری بات اس نے یہ بھی خاص طور پر محسوس کی تھی کہ باہر اس قدر سردی پڑ رہی تھی مگر مسافر ذرا بھی سردی میں کپکپاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جبکہ خود بابا کو اپنا خون سردی کی وجہ سے رگوں میں برفاب بنا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی تک مسافر کی عمر کے بارے میں بھی یہ اندازہ نہیں قائم کر سکا تھا۔ بہر طور وہ اسے وہاں چھوڑ کر اپنی کوٹھری میں آیا۔ سوئی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ”کون تھا بابا؟“ اس نے قدرے تفکر سے پوچھا۔

”کوئی مسافر ہے بے چارہ..... مگر ہے بڑا عجیب۔“ بابا نے کہا پھر بولا۔  
”دھئے تو ایسا کر ایک چراغ اور جلا دے..... وہ بے چارہ اندر اندھیرے میں بیٹھا ہو گا..... اور ہاں..... جا کر وہ رات والی جور کی روٹی اور ذرا بچا ہوا ساگ رکھ کر مجھے لا دے تو میں اسے دے آؤں۔“

”اب کیا روٹی بھی کھائے گا؟“ سوئی نے منہ بسور کر کہا۔  
”نا دھئے نا..... گھر آئے مہمان کو ایسا نہیں کہتے ہیں..... جا..... پتر شاباش.....“ بابا نے اسے پیار سے نصیحت کرتے ہوئے کہا اور سوئی فرماں برداری سے سر ہلاتی ہوئی کوٹھری سے نکل آئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ روٹی کا چھابہ لے کر آئی تو کیا دیکھتی ہے اس کا باپ انی چار پائی پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا..... یہ لو..... بابا تو سو گیا اب کیا کروں میں.....“ بابا کو جگاؤں یا..... پھر خود ہی اس مسافر کو روٹی دے آؤں؟“

سوئی نے کھڑے کھڑے سوچا اور پھر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ بابا کو نہ

”بابا دروازہ مت کھولو..... مجھے ڈر لگ رہا ہے پتہ نہیں باہر کون ہے؟“

سوئی نے خوف زدہ سے لہجے میں کہا تو اس کا باپ مسکرا کر بولا۔ ”نی جھلے اپنے بابا کے ہوتے ہوئے کیوں ڈرتی ہے..... مجھے دیکھ تو لینے دو..... باہر کون ہے..... بے چارہ کوئی مسافر ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس کا باپ کمرے سے نکلا اور ایک بوسیدہ سی بوری اوڑھ کر کچے صحن میں جمع شدہ برساتی پانی میں شپ شپ کرتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور بے آواز بلند پوچھا۔

”کون ہے.....؟“ اس کی آواز شاید شرائے دار بارش اور بادلوں کی گرج چمک میں دب گئی۔ کیوں کہ باہر سے کوئی جواب نہ ملا تھا۔ اس نے پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں پوچھا۔

”کون ہے.....؟“

”دروازہ کھولو..... میں ایک مسافر ہوں..... رات گزار لوں گا تو صبح تڑکے چلا جاؤں گا۔“

دوسری طرف سے آواز ابھری۔ بابا کو اپنا اندازہ درست محسوس ہوا اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے ایک شخص سیاہ کھدر کی چادر کی بکل مارے کھڑا تھا۔ بابا نے لائین اوپر کر کے اسے دیکھا..... اس نے اپنا پورا وجود حتیٰ کہ چہرہ تک چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔ البتہ چہرے والی جگہ سے دیکھنے کیلئے کونا ذرا ہٹا ہوا تھا۔ دروازہ وا ہوتے ہی وہ غراب سے اندر آ گیا۔ بابا نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور اسے دوسری کوٹھری میں لے



مگر پھر بھی سوئی کی تو نگاہیں آہنی بند کوٹھری کے دروازے کی باریک درزوں کے پار ہونے والی مدہم روشنی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ معاً سوئی نے دیکھا قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ کوٹھری کے دروازے کے قریب آ رہی ہے۔ اب تو سوئی کا ماتھا ٹھنکا اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سہم سی گئی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سوچنے لگی کہ وہ مسافر اس کی کوٹھری کے پاس کیوں آ رہا تھا۔ پھر اچانک باہر سے کسی نے دروازے کو اندر دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ اندر سے بند ہونے کی وجہ سے ہولے سے چرچرا کر رہ گیا۔ سوئی بری طرح خوف زدہ ہو گئی۔ ”چر..... چر..... چر..... چر..... چر..... چر..... چر.....“ کی آواز دوبارہ ابھری تو سوئی کے کپکپاتے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ”کک..... کون ہے.....؟“ اس آواز کے ساتھ ہی دروازہ ہلنا بند ہو گیا۔ سوئی کو جاڑے کے موسم میں بھی پسینہ آ گیا۔ پھر اس نے کسی کے واپس جاتے قدموں کی چاپ سنی اور پھر روشنی بھی غائب ہو گئی۔ سوئی کے طلق سے بے اختیار گہری سانس خارج ہو گئی۔ اب باہر گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ سوئی کے جی میں آئی کہ وہ کوٹھری سے باہر جا کر ذرا حالات کا جائزہ لے..... اب تو ویسے بھی اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہو گئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر چار پائی پر بیٹھی رہی پھر آہستگی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی اور لرزیدہ ہاتھوں سے کنڈی کھول کر اس نے دروازے کا پہلے ایک پٹ وا کیا تو سرد ہوا کے جھونکے نے اسے ٹھنڈا کر رکھ دیا۔ باہر صحن تاریک سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس میں وہ پراسرار مسافر مقیم تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے البتہ ہلکی سی روشنی چمکتی نظر آ رہی تھی۔ سوئی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ مسافر اس کی کوٹھری کا دروازہ کیوں کھولنے کی

باہر بجلی کی خوفناک کڑک اور بادلوں کی دل دھلا دینے والی گرج جاری تھی۔ بارش بھی مسلسل ہو رہی تھی۔ سوئی کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ اس پر اسرار مسافر کے بارے میں سوچے جا رہی تھی کہ آخر یہ کون تھا اور اس نے اس کے اندر کوٹھری میں داخل ہوتے ہی یکدم چادر سے اپنا چہرہ کیوں چھپا لیا تھا؟ وہ دیر تک کروٹیں بدل

آنکھ والے شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سیاہ تھا اور ناک کی جگہ صرف دو نتھنے تک باجھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جہاں سے دونوں کیلے دانت چمکتے نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ اکلوتی آنکھ والا ڈراؤنا صورت شخص سوئی سے غصیلے لہجے میں بولا۔

”خبردار..... بے وقوف لڑکی اب آواز مت نکالنا..... ورنہ میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔ سمجھی اب میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں.....“ یہ کہہ کر اس نے آہستہ آہستہ اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ سوئی کو اس کی ایک آنکھ میں عجیب سی مقناطیس کشش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کا دہشت ناک مکروہ چہرہ دیکھنے کی اپنے اندر تاب نہیں کر پا رہی تھی۔ یکدم اٹھ بیٹھی۔

”ٹھہرو..... کہاں جا رہی ہو.....“ ڈراؤنی صورت والے نے غراہٹ آمیز آواز میں اس سے کہا۔

”مم..... میں..... مجھے جانے دو۔“ سوئی لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

”ٹھہرو..... پہلے میری بات غور سے سنو.....“ ڈراؤنی صورت والے پراسرار مسافر نے کہا۔

”تم نے میرے بارے میں اگر کسی کو بتایا تو یاد رکھنا ساری عمر پچھتاؤ گی..... سمجھیں..... جاؤ اب اور دوبارہ میرا راستہ کھوٹا کرنے کی بے وقوفی نہ کرنا۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سوئی جلدی سے اٹھ کر کوٹھری سے بھاگی اور گرتی پڑتی اپنے بسترے پر آگری۔ اس کا سینہ لوہار کی دھونکی کی طرح پھول اور پچک رہا تھا۔ اس کے پورے وجود میں خوف سے لرزاہٹ طاری تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ اپنے بابا کو جگا دے اور اس پراسرار مسافر کی خوفناک اصلیت کے بارے میں بتا ڈالے۔ مگر پھر اسے اس کی دھمکی یاد آگئی۔

☆.....☆.....☆

کوشش کر رہا تھا؟ بہر طور اس نے ذرا مزید ہمت سے کام لیا اور صحن میں آگئی۔ پھر دبے دبے پاؤں چلتی ہوئی وہ اس مسافر والی کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا اور ایک پتلی درز سے آنکھ چکا دی۔ اندر کا ماحول واضح تھا۔ اس نے مسافر کو دوسری طرف منہ کیے بیٹھا ہوا دیکھا۔ اس نے اپنے اوپر سے سیاہ چادر اتار دی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ قریب ہی اس کی زنبیل نما بچھی کھلی پڑی تھی۔ اور جو سامان اس بوسیدہ سی دری پر بکھرا ہوا تھا اسے دیکھ کر سوئی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر سائیں..... سائیں..... ہونے لگی۔ دری پر ایک انسانی ڈھانچے کی کھوپڑی ایک الو کا مردہ جسم اور کچھ ہڈیوں کے علاوہ جانے اور کیا کیا الا بلا بکھری پڑی تھی۔ اچانک سوئی کو یوں لگا جیسے وہ مسافر زیر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ چراغ اس کے بالکل سامنے رکھا ہوا تھا جو سوئی کو بہر حال نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس کی روشنی سے اندر کا پورا ماحول منور تھا۔ اچانک سوئی نے دیکھا کہ دری پر رکھی ہوئی انسانی کھوپڑی فضا میں بلند ہوئی اور سیدھی دروازے سے نکل گئی۔ سوئی کے حلق سے بے اختیار خوف زدہ سی چیخ خارج ہو گئی۔ دروازہ یکدم وا ہو گیا۔ وہ مسافر غیر ارادی طور پر پلٹا تو سوئی کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ مسافر کا چہرہ اب کھلے دروازے کی طرف دیکھنے سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی صرف ایک آنکھ تھی جو پیشانی پر تھی۔ سوئی نے جو اس کی یہ ڈراؤنی صورت دیکھی تو دہشت سے دوبارہ چیخی۔ وہ کھوپڑی پھر فضا میں متحرک ہوئی اور سوئی کی پیشانی سے نکل گئی..... سوئی کے حلق سے آخری چیخ نمودار ہوئی پھر وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

☆.....☆.....☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو اس نے ایک آنکھ والے سر کو اپنے اوپر جھکے پایا۔ اس نے چیخنے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس مسافر نے یکدم اپنے ہاتھ سے اس کا منہ دبوچ لیا۔ سوئی اس خوفناک چہرے والے مسافر کی کوٹھری میں دری پر پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی اور دہشت سے اس کا پورا نازک وجود کپکپا رہا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ایک

اگلے روز اس کا بابا اٹھا تو اس نے برابر والی چارپائی پر سوئی کو عجیب حالت میں دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔

”سوئی دھئے..... کیا ہوا.....؟“ بابا پر تشویش لہجے میں اسے پکارتے ہوئے یکدم اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور دھیرے سے سوئی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس کی پیشانی بری طرح تپ رہی تھی۔ اس کا باپ کو فکر ہوئی۔ ”سوئی..... تیرے کو بہت تیز بخار ہو رہا ہے..... ٹھہر..... میں ابھی حکیم جی سے دوائی لے کر آتا ہوں۔“

”ٹھٹھ..... ٹھہر و بابا..... م..... مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جانا۔“ اچانک سوئی نے لرزیدہ آواز میں باپ کو روکا۔

”مگر پتری تجھے تو بڑا تیز تپ چڑھا ہوا ہے۔“

”نہیں بابا یہ ایسے ہی ہے..... اتر جائے گا..... ت..... تو پہلے میری ایک بات سن.....“

”ہاں..... پتری..... بول۔“

”بابا اللہ کے واسطے اس مسافر کو یہاں سے ابھی فوراً چلتا کر دے پھر میرا بخار خود ہی اتر جائے گا۔“

سوئی نے خوف سے سہمے ہوئے لہجے میں باپ سے کہا۔ بابا کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ الجھن کے تاثرات اُمڈ آئے۔

”کیوں پتری ایسا کیا کیا ہے اس نے..... وہ تو..... وہ تو..... اچھا ٹھہر میں اسے ابھی دیکھ کر آتا ہوں.....“ وہ سوئی کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکلا تو اسے

مسافر کی کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا ملا..... اور قریب گیا تو اس نے دیکھا مسافر نے بدستور سیاہ موٹی چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اپنی پتلی باندھ رہا تھا۔

”میری بچی کو بہت تیز بخار ہو گیا ہے..... وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے..... تو ذرا اس کا خیال رکھنا میں ابھی جا کر حکیم جی کو بلاتا ہوں۔“ سوئی کے باپ نے اس سے کہا تو مسافر ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اسے بولا۔

”ٹھہر..... میرے پاس دوا موجود ہے..... آؤ۔“

وہ اندر کوٹھری میں آ گئے۔ سوئی اس مسافر کو دیکھ کر دہشت سے کانپنے لگی۔

مسافر نے اس کی پیشانی کو چھونا چاہا تو سوئی خوف سے چلائی۔ ”نن..... نہیں..... م..... مجھے مت ہاتھ لگاؤ۔“

”گلتا ہے اس نے رات میں کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے۔“ مسافر نے سپاٹ لہجے میں کہا تو سوئی کا باپ بھی اس کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

اس کے بعد اس پر اسرار مسافر نے نجانے زیر لب کیا پڑھ کر پھونک ماری کہ سوئی کی آنکھیں بند ہونے لگی اور اگلے ہی لمحے وہ آنکھیں موندے لیٹ گئی۔ اسے دیکھ کر اب یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب گہری نیند سو چکی ہو۔

”یہ سو گئی ہے..... اسے آرام کرنے دو..... اٹھے گی تو بخار اتر چکا ہو گا۔“

پر اسرار مسافر نے سپاٹ لہجے میں بابا سے کہا۔ وہ بھی اب مطمئن نظر آنے لگا تھا مگر میں حیران تھا کہ آخر اس اجنبی مسافر نے اس کی بیٹی پر ایسا کیا جادو کیا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے..... اور تم کہاں جا رہے ہو؟“ سوئی کے باپ نے اس سے پوچھا۔ اسے ابھی تک حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے عورتوں کی طرح اپنا چہرہ کیوں ابھی تک کالی چادر میں چھپا رکھا تھا۔

”میرا نام جان کر کیا کرو گے..... ویسے جہاں میں جانا چاہتا تھا وہاں میں پہنچ گیا ہوں۔“ اجنبی مسافر نے پر اسرار لہجے میں کہا۔ بابا کو اچنبھا ہوا۔ وہ بولا۔ ”تمہیں اس گاؤں میں کسی سے کام تھا تو بے شک اس سے جا کر مل آؤ۔“

”ہاں میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ پراسرار مسافر یہ کہہ کر چلا گیا۔ بابا اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے چہرے کو ہر وقت ڈھانپ کر کیوں رکھتا تھا..... مگر وہ چلا گیا تھا اس لئے اس نے یہ سوال بعد میں پوچھنے کا پکا تہیہ کر لیا تھا۔

لگ بھگ گھنٹہ گزرنے کے بعد بابا نے گہری نیند میں سوئی ہوئی سوئی کی پیشانی چھو کر دیکھی تو اسے خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ گھنٹہ پہلے سوئی کی پیشانی بخار سے تپ رہی تھی مگر اب جو ہاتھ لگا کر اس نے دیکھا تو وہ سرد تھی۔ بالکل نارمل..... بابا دل ہی دل میں اس فرشتہ صفت مسافر کو دعائیں دینے لگے۔ بابا صحن میں آیا تو یونہی ایک نظر اس نے دوسری کوٹھری کی طرف دیکھا جہاں وہ مسافر مقیم تھا مگر اب وہ کسی سے ملنے کیلئے جا چکا تھا۔ اس کا سامان البتہ وہیں کوٹھری میں موجود تھا۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ مگر باہر سے کنڈی نہیں چڑھی ہوئی تھی۔ بابا کے دل میں جانے کیا آئی وہ کوٹھری کی طرف بڑھا اور دروازے کو جیسے ہی اندر دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا..... دروازہ اندر سے بند تھا جبکہ بابا کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ مسافر گاؤں ہی میں کسی سے ملنے کیلئے اس کی آنکھوں کے سامنے باہر گیا تھا۔ ”تو پھر اندر کون تھا.....؟“ اس نے حیرت سے سوچا۔

”ہو سکتا ہے بعد میں وہ آچکا ہو.....“ یہ سوچ کر اس نے کوٹھری کے دروازے پر دستک دی مگر جواب نہ دار..... اس نے دوبارہ دستک دی..... مگر اندر سے خاموشی ہی رہی۔ اسے اچھٹا ہوا اور اس نے پھر دروازے کو اندر دھکیلنے کی کوشش کی مگر اندر بدستور کنڈی لگی ہوئی تھی۔ بابا نے ایک باریک جھری سے اندر جھانکا اسے اندر عجیب سی دھند نظر آئی۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا کہ کہیں اندر آگ تو نہیں لگ گئی مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ دھند دھوکیں ہی نہیں تھی..... بس عجیب سا غبار تھا..... دھندلا دھندلا۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن آمیز سوچ کی شکلیں سی نمودار ہو گئیں۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ اگر اندر کوئی نہ تھا تو پھر دروازہ اندر سے کس نے بند کر رکھا تھا۔ وہ ذرا دیر گوگو کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اسے دوسری کوٹھری سے اپنی بیٹی سوئی کے ”بابا..... بابا.....“ پکارنے کی آواز سنائی دی۔

اپنا سر جھٹک کر سوئی کے پاس آیا۔ وہ جاگ چکی تھی اور چار پائی پر پاؤں لٹکائے اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر ہنوز سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔

”بابا..... تم کہاں چلے گئے تھے..... مجھے اس خوفناک ویرانے میں..... اکیلا چھوڑ کر.....“

سوئی نے بے تابانہ انداز میں چار پائی سے کھڑے ہو کر باپ سے شکوہ کیا تو بابا کو حیرت ہوئی وہ پر پر شفقت انداز میں مسکراتا ہوا اس کے قریب آیا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ملائمت آمیزی سے بولا۔ ”دھیے تو تو یہاں سو رہی تھی..... میں بھلا تجھے کیوں اکیلا چھوڑوں گا۔“

”نہیں بابا مجھے اچھی طرح یاد ہے تو مجھے اس طوفانی رات میں ایک ویران کھنڈر میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا..... میں نے سازی رات ڈرتے کانپتے ہوئے وہاں گزار دی تھی۔ جا..... میں تجھ سے نہیں بولوں گی۔“ سوئی ناراض ہو گئی۔ بابا اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے شفقت آمیز لہجے میں بولا۔ ”اری جھلے تو نے ضرور سپنا دیکھا ہو گا..... چل..... اب منہ ہاتھ دھو لے..... اپنے بابا کو ناشتہ نہیں بنا کر دے گی۔“ سوئی اس سے الگ ہو کر بولی۔

”بابا..... وہ..... وہ..... مسافر..... چلا گیا۔“ اسے جیسے اچانک یاد آیا۔ بابا نے دیکھا اس کے بارے میں پوچھتے وقت سوئی کی آنکھوں میں خوف سا اثر آیا تھا۔ وہ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور جیسے جیسے اسے یاد آ رہا تھا اس کی شہابی رنگت زرد پڑتی جا رہی تھی۔ بابا کو تشویش ہوئی کہ کہیں پھر تیز بخار نہ ہو جائے اسے۔ یہ سوچ کر وہ اس سے بولا۔ ”دھیے تجھے کیا ہو گیا ہے..... آخر تو نے ایسا کونسا ڈراؤنا سپنا دیکھ لیا ہے کہ تیری طبیعت ہی نہیں سنبھلتی.....“ بابا کے لہجے میں اچانک ہی پریشانی در آئی۔

”بابا..... تو ایک کام کر..... اس مسافر کو فوراً یہاں سے چلتا کر دے..... یہ..... بہت بڑا جادوگر ہے۔“

سوئی نے خوف زدہ سے لہجے میں کہا تو بابا اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”سوئی دھیے وہ تو بے چارہ ایک بھلا مانس اور عام سا انسان ہے..... پتہ

ہے رات تجھے بہت تیز تپ ہو گیا تھا..... اس بے چارے نے تو نجانے کیا پڑھ کر تجھ پر پھونکا تھا کہ تیرا بخار ٹھیک ہو گیا۔“

سوئی عجیب تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ اپنے باپ کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ مسافر کوئی غیر انسانی مخلوق تھا جس کی پیشانی پر صرف ایک آنکھ تھی اور اس نے خود گزشتہ طوفانی رات میں اسے کالا علم کرتے دیکھا تھا۔ اور ایک انسانی ڈھانچے کی کھوپڑی..... بھی اس کی کوٹھری میں گردش کرتے اس نے دیکھی تھی مگر پھر سوئی کو اچانک اس پر اسرار مسافر کی دھمکی یاد آ گئی تھی۔ اس لئے وہ خاموش ہو گئی مگر پھر جب اس کے باپ نے اسے یہ بتایا کہ وہ مسافر ابھی مزید کچھ روز یہاں ٹھہرے گا تو سوئی لرز اٹھی پھر اس نے اپنے باپ کو گزشتہ رات والے خوفناک واقعہ کے بارے میں صاف صاف بتا دیا مگر بابا تو مان ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سوئی کی اس بات کو بھی بدستور ایک ڈراؤنے خواب پر محمول کر رہا تھا۔ اس لئے ہنستے ہوئے بولا۔

”نی جھلئے تو آرام کر لے اور تھوڑا..... میں خود ہی چائے کا پانی رکھ آتا ہوں.....“ وہ یہ کہتے ہوئے اپنا سر دھتا ہوا کوٹھری سے نکل گیا۔ اور سوئی اپنی جگہ حیران و پریشان کھڑی رہ گئی۔ مگر پھر چند لمحوں بعد وہ بھی کوٹھری سے باہر صحن میں آ گئی۔ صحن میں جاڑے کی چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا لگتا ہی نہ تھا کہ گزشتہ شب وہ بھادوں رویا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ابھری۔ سوئی کا دل یکبارگی دھڑکا وہ سمجھی کہ وہ خوفناک جادوگر آ گیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب اس کا راز افشا کر کے رہے گی۔ اچانک ہی اس کے اندر دلیری نے سرا بھارا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی اور چٹختی کھول کر دونوں پٹ وا کر دیئے۔ سامنے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ ایک باریش بزرگ اسے نظر آیا تھا۔ اس نے لمبا جبہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں ڈیروں مالاکیں تھیں۔ ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں موٹے موٹے دانوں والی تسبیح پکڑ رکھی تھی۔ اس کا چہرہ نورانی تھا اور سر اور ہنووؤں کے بال دودھیا تھے۔

”بابا..... اس وقت تو ہمارے پاس کچھ نہیں ہے..... پر ٹھہر میں تیرے لیے چائے پر دھالے کر آتی ہوں۔“

سوئی نے اسے فقیر جان کر نرم لہجے میں کہا تو وہ جلائی لہجے میں اس سے بولا۔

”رزق دینے والی ذات واحد لا شریک اللہ کی ہے تو کون ہوتی ہے ہمیں روٹی دینے والی ہٹ پرے۔“ سوئی ڈر کے ایک طرف ہو گئی۔ وہ باریش بزرگ لاشی ٹیکتا ہوا اندر آ گیا اور با آواز بلند سوئی کے باپ کو پکارا..... ”اوائے مرادے کدھر ہے تو سامنے آ میرے.....“ سوئی اس کی زبان سے اپنے باپ کا نام سن کر چونکے بتانہ رہ سکی کیوں کہ اس کے باپ کا نام مراد خان تھا۔ وہ باریش بزرگ کی آواز سن کر جلدی سے صحن میں آ گیا پھر اسے دیکھ کر اس کا چہرہ فرط عقیدت سے کھل اٹھا۔ وہ بڑی عقیدت سے بولا۔

”بابا کمال شاہ..... آ..... آ..... پ..... یہاں میرے غریب خانے پر.....؟“

”اوائے مرادے کیا یہاں تو نے کسی خبیث شیطان کو پناہ دے رکھی ہے۔“ بابا کمال شاہ نے پر جلائی لہجے میں اسے گھور کر بولا۔

”نن..... نہیں تو..... مم..... میں بھلا ایسی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟“ مراد حیرت سے بولا۔ البتہ سوئی بابا کمال شاہ کی بات سن کر ضرور چونکی تھی اور اس کا سیدھا خیال اس پر اسرار مسافر کی طرف چلا گیا تھا۔

”اوائے مرادے! میں ایسے ہی رکھاں والی سے میلوں کا فاصلہ کر کے یہاں لڑو کھانے نہیں آیا ہوں..... ہم نے عالم وجد میں ایک خبیث شیطان کو ادھر تیرے گھر میں دیکھا ہے۔ ہم خود اس کے تعاقب میں ہیں..... اچھی طرح سوچ کر بتا۔“

”میں قسم کھانے کو تیار ہوں بابا کمال شاہ..... یہاں کوئی شیطان نہیں آیا ہے میرا گھر تیرے سامنے ہے..... تجھے نظر آتا ہے تو ڈھونڈ لے۔“

مراد بولا۔ ”ہوں تو صحیح کہہ رہا ہے.....“ بابا کمال شاہ نے ایک پرطمانیت ہنکاری بھرتے ہوئے یقین طلب لہجے میں پوچھا۔

تو سوئی کے باپ مرادے نے سر ہلا دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر..... ویسے ہوشیار رہنا..... وہ ادھر کسی نہ کسی دن آئے گا ضرور..... وہ جب بھی آئے مجھے خبر کر دینا..... میں ابھی اس گاؤں کے پیش امام کے

حجرے میں ٹھہرا ہوا ہوں..... وہ خبیث شیطان ایک زیر دست ساحر ہے.....“ بابا کمال شاہ بتانے لگا۔ دونوں باپ بیٹی حیران و پریشان اس کی گفتگو سننے میں محو تھے۔

”اس خبیث ساحر کا نام جگدوش ہے اسے اپنے کالے علم کیلئے ایک ایسی حسین اور جوان لڑکی کی روح درکار ہے جو اس کے کالے علم کے مطابق پورن ماشی کے وقت پیدا ہوئی ہو اور تیری بیٹی سوئی نے پورن ماشی کی رات کو ہی جنم لیا ہے۔ اس لئے تو ہوشیار رہ۔“ سوئی یہ سن کر لرز اٹھی۔ اس کا باپ مراد پریشان ہو گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”مم..... مم..... مگر بابا کمال شاہ چودھویں کی رات (پورن ماشی) میں صرف ایک میری بیٹی تو پیدا نہیں ہوئی ہوگی..... پھر وہ خبیث میری معصوم سوئی کے پیچھے کیوں پڑے گا۔

”اونا دان..... اس خبیث شیطان جگدوش کے کالے علم کے مطابق ایک خاص پورن ماش کو پیدا ہونے والی ہی لڑکی..... پورن ماکھلائے گی جس کے بانیں کاندھے کے ذرا نیچے ایک چاند کے برابر کا گول سیاہ داغ ہوگا..... وہ تیری بیٹی کے کاندھے پر اس وقت ابھر آیا ہے۔“ بابا کمال شاہ کے الفاظ بجلی بن کر دونوں باپ بیٹی کے سر پہ ٹوٹ کر گرے تھے۔ مراد پریشان ہو گیا۔ سوئی سہم کر رہ گئی۔ اس نے تو کبھی پیچھے مڑ کر اپنا کاندھا دیکھا ہی نہ تھا آج تک۔

”تت..... تت..... تو کیا..... میری بچی..... سوئی..... پورن ما..... ہے.....؟“ مراد ایک نظر اپنی حیران پریشان کھڑی بیٹی سوئی پر ڈالتے ہوئے بابا کمال شاہ سے لکت زدہ لہجے میں بولا۔

”ہاں..... تیری بیٹی..... اس خبیث جگدوش کے کالے منتر کے حساب سے پورن ما ہے۔“

یہ کہتے ہوئے بابا کمال شاہ نے قریب کھڑی ڈری سہی سوئی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”جادھے تو آئینہ سنبھال کر اپنی کاندھا دیکھ پھر آ کر بتا..... جلدی کر.....“ سوئی بے چاری تو کاٹو بدن میں لہو نہیں کے مصداق فوراً اپنی کٹھری میں آئی۔ پھر جلدی

سے دوازہ بند کر کے اس نے آئینہ سنبھالا اور اپنے گلے کی قمیض کے بٹن کھولے اور اپنا بایاں کاندھا ہرہنہ کر کے آئینے میں دیکھا تو بے اختیار اس کے حلق سے دبی دبی چیخ خارج ہو گئی۔ کاندھے سے ذرا نیچے گول سکے کے برابر کالا داغ تھا۔ اسے نظر آ گیا۔ اس کا پورا نازک وجود مارے خوف کے لرز نے لگا پھر وہ جلدی سے اپنی قمیض درست کرنے کے بعد کٹھری کا دروازہ کھولے صحن میں آئی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ کچے شکستہ صحن میں صرف اس کا باپ کھڑا تھا جبکہ بابا کمال شاہ غائب تھا۔ ”بابا..... وہ..... وہ..... کمالی شاہ کدھر چلا گیا؟“ اس نے حیرت اور پریشانی کے طے جلے تاثرات بھرے لہجے میں باپ سے پوچھا۔ ”وہ تو چلا گیا تھا..... مجھے معلوم ہے کہ..... تیری بیٹی ”پورن ما“ ہے تو بتا دھئے کیا واقعی تیرے کاندھے پر خدا نخواستہ.....“

”ہاں بابا..... ہا.....“ سوئی اس کی بات کاٹ کر روہانے لہجے میں بولی۔

”میرے بانیں کاندھے پر کالا داغ موجود ہے۔“

”کک..... کیا.....“ مرادے کا منہ کھل گیا۔

”ہاں بابا..... میں نے خود اندر جا کر آئینے میں اچھی طرح دیکھا ہے..... تو نے بابا کمال شاہ کو بتایا کیوں نہیں اس مسافر کے بارے میں..... وہی تو مجھے خبیث جگدوش لگتا ہے..... مجھے پورا یقین ہے کہ وہ وہی ہے..... اور..... اور..... اب مجھے وہ اپنے ساتھ لے جائے گا..... آہ..... میں کیا کروں اب.....“ سوئی یہ کہہ کر زار و قطار رو پڑی۔ اس کا نرم و نازک وجود خوف سے لرزہ بر اندام تھا۔ مراد اسے روتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ اسے سہارا دینے کو لپکا۔ سوئی..... وہیں بے دم سی ہو کر صحن میں ہچکچی کھری چار پائی پر گر سی گئی۔

”دھئے..... حوصلہ کر..... تجھے غلط فہمی ہوئی ہے..... وہ مسافر بے چارہ تو ایک عام سا آدمی ہے۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مراد سوئی کو چھوڑ کر دروازہ کھولنے کیلئے لپکا۔

دروازہ کھولا تو سامنے وہی پراسرار مسافر کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہوا

اور فوراً اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنوسیاہ چادر ڈھکی ہوئی تھی۔

سوئی اسے دیکھ کر ہندیانی چیخ مار کر اپنے باپ سے بولی۔

”بابا..... یہی وہ خبیث شیطان جگدوش ہے..... جس کے بارے میں ابھی

بابا کمال شاہ نے بتایا ہے۔ اسے کہو فوراً یہاں سے دفع ہو جائے۔“

”بابا کمال شاہ.....“ پراسرار مسافر کھردرے لہجے میں بڑبڑایا۔ ”کیا آیا تھا وہ

یہاں.....؟“

اس نے پوچھا۔ مرادے نے اس سے پوچھا۔ ”تو کون ہے.....؟ اور یہ تو نے

اپنا چہرہ کیوں ڈھانپ رکھا ہے..... بول..... تیری اصلیت کیا ہے.....؟“ مرادے کو بھی

غصہ آ گیا تھا۔ مگر پراسرار مسافر سپاٹ لہجے میں بولا۔

”دیکھو میں ایک عام سا غریب انسان ہوں..... اور یہاں کسی سے اپنی

امانت لینے آیا تھا..... یہ دیکھو.....“ اس نے یہ کہہ کر چادر کی بکل سے ہاتھ نکالا تو اس

میں ایک پوٹلی بندھی ہوئی تھی۔ وہ مرادے کے سامنے اسے کرتے ہوئے بولا۔ ”اس

میں میری بیوی کا زیور ہے..... مجھے اپنا چہرہ دکھانے میں کوئی تامل نہیں ہے لیکن تم سننا

چاہتے ہو تو سنو۔“ وہ لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔

”مجھے کوڑھ ہے..... اور سب سے پہلے کوڑھ نے میرے چہرے پر حملہ کیا ہے

جو انتہائی بھیانک ہو گیا ہے..... میں یہاں کے ایک حکیم سے اپنا علاج کروا رہا

ہوں..... میرے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے..... مگر میں باقاعدگی سے دوائی لیتا رہا اور

ضمانت کے طور پر میں نے اپنی بیوی کا زیور اس لالچی حکیم کے پاس رکھوا دیا تھا تاکہ

میرے پاس جب کبھی بھی روپوں کا بندوبست ہوا تو وہ ادا کر کے میں اپنی امانت لے

آؤں..... یوں سمجھو میں اپنے علاج کیلئے مزید یہاں کچھ روز رہنا چاہتا تھا۔ مجھے کافی

افاقہ ہوا ہے اگر تم لوگ میرا یہاں رہنا برداشت نہیں کرتے تو میں کسی مسجد میں رہ لیتا

ہوں..... میں اپنا چہرہ اس لئے چھپا رہا تھا کہ کہیں تمہیں مجھ سے کراہت نہ محسوس ہو.....

اب بھی اگر تمہاری خواہش ہے تو مجھ بذنیب کا چہرہ دیکھ سکتے ہو۔“ وہ خاموش ہوا۔ اس

کے لہجے میں غم ناک سی رقت اتر آئی تھی۔ مرادے کو وہ واقعی ایک بیمار مریض اور دکھی انسان محسوس ہوا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اس اجنبی مسافر نے اپنا چہرہ اسے دکھانے کیلئے چادر ہٹانے کی کوشش کی مرادے نے اسے منع کر دیا۔ اسے بے اختیار اس دکھی انسان پر ترس آنے لگا تھا۔

”نہیں..... نہیں..... ہمیں معاف کرنا..... ہم تمہیں غلط سمجھتے تھے..... آؤ.....

آؤ..... اندر.....“ مرادے نے ترس کھاتے ہوئے اس سے ملاحت آمیزی سے کہا اور

وہ کوڑھی مسافر جھٹ سے اپنی کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مرادے کو حیرت کا

ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ حیرت سے سوچنے لگا کہ اس سے پہلے اس کی کوٹھری کا دروازہ تو اس

نے بھی کھولنے کی کوشش کی تھی جسے اندر سے اس نے بند پایا تھا پھر یہ بڑے آرام سے

کیسے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اب وہ زیادہ نہ سوچ سکا کیوں کہ اس لمحے اس کی بیٹی

سوئی نے چلا کر اس سے کہا۔

”بابا تو اس مکار کی باتوں میں مت آ..... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی

ہوں..... اسے ابھی چٹا کر دے..... ورنہ..... ورنہ..... میں ابھی جا کر بابا کمال شاہ کو

بلا کر لاتی ہوں..... وہ اس گاؤں کی مسجد میں ٹھہرا ہوا ہے..... وہ خود آ کر اس مسافر کا

پول کھول دے گا۔“ یہ کہہ کر سوئی چارپائی سے اٹھی۔ اندر کوٹھری میں موجود اس مسافر

کے کانوں تک بھی سوئی کی باتیں پہنچ چکی تھیں۔ وہ جھٹ سے باہر نکلا اور دروازے کی

طرف بڑھتی ہوئی سوئی کی طرف کچھ پڑھ کر پھونک مار دی۔ مرادے اس کی یہ حرکت نہ

دیکھ پایا تھا۔ ادھر سوئی کو جانے کیا ہوا وہ تیور کر گر پڑی۔ وہ مسافر خاموشی سے واپس

کوٹھری کی چوکھٹ سے اندر لوٹ گیا۔ مرادے..... ”سوئی دھئے۔“ کہہ کر بیٹی کو

سنجالنے کیلئے لپکا۔ سوئی اکٹھی اکٹھی سانسیں لے رہی تھی۔ مرادے اسے اٹھا کر اندر اپنی

کوٹھری میں لے آیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ پھر اس نے پانی کے

چھینٹے سوئی کے نیم غشی چہرے پر مارے..... اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”بب..... بابا..... وہ..... مجھے کیا ہوا تھا.....؟“ وہ لرزیدہ لہجے میں باپ سے

بولی۔ وہ پیار سے چپکارتے ہوئے بولا۔

”کچھ نہیں ہوا تھا تجھے..... سو جا..... تو..... آرام کر.....“ پھر سوئی کو نیند آنے لگی اور وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔ مراد اُسبھا تھا شاید اسے چکر آ گیا تھا اس لئے وہ ذرا دیر بعد کوٹھری سے نکلا اور صحن میں آ گیا۔ اچانک اسے برابر والی کوٹھری میں موجود اس ”کوزھی“ مسافر کا خیال آیا۔ وہ اس سے سوئی کے سلوک کی معافی مانگنے کی غرض سے کوٹھری کے اندر آیا تو حیران رہ گیا۔ کوٹھری خالی تھی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ مرادے کو حیرت ہوئی وہ باہر آیا پھر گھر سے نکل کر اس نے گلی میں دائیں بائیں دیکھا تو اسے وہ ”کوزھی“ مسافر کہیں نظر نہ آیا۔

”شاید سوئی کی بات پر وہ بے چارہ برا مان کر چلا گیا۔“ مراد یہ سوچ کر واپس

اندر آ گیا۔

اگلے دن ایک روح فرسا منظر اس کا منتظر تھا۔ سوئی کو اس نے اپنی چار پائی پر مردہ پایا۔ وہ بے چارہ اپنا سینہ پیٹ کر رہ گیا۔ وہ نادانی میں یہی سمجھ رہا تھا کہ سوئی کو تیز بنار نے نہیں چھوڑا اور وہ مر گئی۔ پھر اس نے گاؤں والوں کے ساتھ دل پر پتھر رکھ کر اپنی بیٹی کی لاش کو دفن کر روتا دھوتا گھر واپس آ گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ بوڑھا اپنی دردناک داستان غم سنا کر خاموش ہو گیا۔ میں اس کی رام کھان سن کر گنگ ہو گیا۔ میرے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ کئی خیالات کئی باتیں..... بہت سے سوال جو حل طلب تھے وہ سب کے سب ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ پراسرار کوزھی مسافر..... جو ایک خبیث شیطان ساحر جگدوش تھا۔ بزرگ فقیر بابا کمال شاہ اس کی ”پورن ما“ والی پراسرار بھری کہانی اور بعد میں سوئی کا اچانک انتقال کر جانا..... یہ وہ باتیں تھیں جن سے سارے واقعات کی کڑیاں الجھتی سلبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ بعد میں بد نصیب سوئی کے باپ مرادے نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی بیٹی سوئی کے انتقال کے کچھ روز بعد سوئی اسے خواب میں نظر آئی تھی۔ وہ روتے ہوئے باپ سے فریاد کر رہی تھی کہ بابا اسے قبر سے نکالو میں مری نہیں ہوں..... ورنہ..... ورنہ وہ جگدوش اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔“ بوڑھے مرادے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ سوئی نے اسے اس کوزھی مسافر کی حقیقت اور اس کے پراسرار شعبدے کے بارے میں خواب میں بھی بتا دیا تھا کہ وہ جگدوش شیطان ہی تھا۔ بس پھر کیا تھا مرادے اگلے دن دوڑا دوڑا بابا کمال شاہ سے ان سارے خوفناک واقعات کا ذکر کرنے کیلئے اس سے ملنے گاؤں کی مسجد کے پیش امام کے حجرے میں آیا کیوں کہ اس نے کہا تھا کہ اب ادھر ہی کچھ روز مقیم ہے۔ مگر پیش امام جس کا نام مولوی تمیز الدین تھانے اسے بتایا کہ بابا کمال شاہ تو کب کے یہاں سے جا چکے تھے۔ مرادے نے اس سے ان کا پتہ بھی پوچھنا چاہا مگر مولوی تمیز الدین نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ناچار مراد واپس آ گیا اور پھر اس روز کے بعد سے پھر دوبارہ اس کے خواب میں سوئی نہیں آئی۔

”بابا تم نے بعد میں کمالی شاہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی؟“ اس کے خاموش ہونے کے بعد جانے کس خیال کے تحت اس سے پوچھا کہ وہ بے چارہ حراماں نصیب



اپنی آنسوؤں سے تر آنکھوں کو پونچھتے ہوئے غم ناک لہجے میں بولا۔

”پترے مجھ بوڑھے میں جتنی طاقت اور حوصلہ تھا میں نے بابا کمال شاہ کو بہت تلاش کی مگر وہ نہ ملا پھر یہ سوچ کر اب کیا ہو سکتا تھا..... میری سوئی تو مر گئی.....“

وہ.....“

”نہیں چاچا نہیں..... میرا دل کہتا ہے وہ مری نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر پر زور لہجے میں اس سے کہا۔

”مجھے پورا یقین ہے کہ سوئی زندہ ہے اور اس مردود شیطان جگہ و ش کے قبضے میں ہے۔ کیوں کہ..... کیوں کہ..... سوئی نے خواب میں مجھے ساری حقیقت بیان کی ہے..... تو فکر نہ کر چاچے مرادے! میں بابا کمال شاہ کو تلاش کر کے اسے ساری حقیقت بتاؤں گا..... وہ ضرور مجھے کوئی نہ کوئی راستہ دکھائیں گے۔“ میں نے آخر میں رخصت ہوتے ہوئے پر جوش لہجے میں کہا اور پھر اسے تسلی دے کر وہاں سے چلا آیا۔

میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں جو تواتر کے ساتھ ایک ہی خواب دیکھتا چلا آ رہا تھا وہ محض خواب ہی نہیں تھا بلکہ اس کا حقیقت سے تعلق ضرور تھا۔ خواب میں نظر آنے والے اس پراسرار کھنڈر کا علاقہ یہیں کسی سرزمین کے علاقہ میں موجود تھا جس سے میں واقف نہ تھا۔

مگر مجھے کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی تھی کہ اس پراسرار خوفناک مجید سے کس طرح پردہ اٹھایا جائے؟ بلاخر مجھے اس کی اولین راہ یہی نظر آتی محسوس ہونے لگی کہ اگر کسی طرح بابا کمال شاہ کا پتہ چل جاتا تو..... اس راز سے پردہ اٹھ سکتا تھا۔ کیوں کہ چاچا مرادے کے کہنے کے مطابق بابا کمال شاہ..... ان سارے مجیدوں بھری حقیقتوں سے بہ خوبی واقف تھا۔ لہذا میں نے پہلا کام یہی کیا کہ بابا کمال شاہ کو تلاش کرنے کے منصوبے پر غور کرتا شروع کر دیا اور سب سے پہلے گاؤں کے پیش امام مولوی تمیز الدین کا خیال آیا جہاں کچھ روز بابا کمال شاہ نے قیام کیا تھا۔ وہ ضرور مجھے بابا کمال شاہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتا تھا۔ چنانچہ یہ تہیہ کر کے میں سیدھا گاؤں کی اکھوتی مسجد پہنچا۔ تب تک ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا اور مسجد کے دودھیا گنبد سے اذان کی روحانی

صداب بلند ہو رہی تھی۔ میں نے وضو کر کے باجماعت نماز ادا کی اور سب سے پہلے اللہ جل جلالہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہونے کی بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگی۔

”اے میرے معبود..... مجھے اپنے نیک مقصد میں کامیابی عطا فرما..... تیری اس پاک دھرتی میں مردود شیطان کا ایک پیروکار اپنے منحوس قدم جما چکا ہے..... جو یقیناً اپنے مذموم اور ناپاک مقاصد کے حصول کی خاطر اپنے سفلی علم کے ذریعے یہاں اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتا ہے۔“

”اے دو جہانوں کے مالک! مجھ میں اتنی ہمت اور طاقت دے کہ میں ان باطل اور طاغوتی قوتوں کو نیست و نابود کر ڈالوں..... مجھے صرف تیرا آسرا تیری مدد چاہئے..... آمین.....“

میں نماز سے فارغ ہوا تو خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا اور مجھے اپنے اندر عجیب سی روحانی طاقت کا احساس ہونے لگا۔ نماز ختم ہونے کے بعد تک میں تھوڑی دیر مسجد میں ہی بیٹھا رہا پھر جب پوری مسجد ماسوائے مولوی صاحب کے نمازیوں سے خالی ہو گئی تو میں نے آگے بڑھ کر مولوی صاحب کو سلام کیا۔ پھر ان سے بلا تشریف و تامل اپنا مدعا بیان کر ڈالا۔

وہ اپنی ریش پردیاں ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”بیٹے! بابا کمال شاہ کو یہاں آئے کافی روز بیت چکے ہیں..... میں نہیں جانتا کہ وہ پھر کہاں لوٹ گئے ہیں۔“

”مولوی صاحب! میرا بابا کمال شاہ سے ملنا بہت ضروری ہے..... آپ تھوڑی بہت تو میری ان کے بارے میں رہنمائی کر دیتے تو بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔“ میں نے اصرار کیا۔

”میرے بچے! مجھے پتہ ہوتا تو بھلا مجھے بتانے میں کیا عار ہوتا.....“ انہوں نے پر شفقت رسائیت سے کہا۔ پھر ذرا سوچنے کے بعد بولے۔ ”اچھا..... تو پھر ایک کام کر.....“

”حکم کریں مولوی صاحب.....“ میں نے پرامید ہو کر کہا۔

”تو ایسا کر کمالے کہہ مارے جا کر مل لے..... وہ تجھے شاہ صاحب کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا دے گا کیوں کہ وہ ان سے تعویذ وغیرہ کے سلسلے میں جایا کرتا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ آپ کا مولوی صاحب! میں ابھی جا کر ان سے ملتا ہوں۔“ میں نے خوش ہو کر کہا اور پھر وہاں سے چلا آیا۔ میں گاؤں کے کچے دھول اڑاتے راستے میں تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے سامنے سے استاد گامو پہلوان آتا نظر آیا۔ میں نے جھٹ سے انہیں خاص پہلوانی آداب میں سلام جھاڑ دیا۔

”اوائے پٹھے تو کدھر رہتا ہے..... اکھاڑے میں تیری غیر حاضری بہت ہونے لگی ہے..... کیا دنگل شنگل مارنا چھوڑ دیا ہے تو نے؟“ وہ خالص پہلوانی لہجے میں مجھ سے بولا تو میں سر کھجاتے ہوئے قدرے خفت سے بولا۔ ”او نہیں ماما..... بس ایسے ہی آج کل بے چارے تایا بیمار رہنے لگے ہیں ناں اس لئے اب سارے وقت دکان مجھے ہی سنبھالنی پڑتی ہے۔“

”ہاں..... تیرے تائے سے یاد آیا.....“ وہ اچانک اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

”تو جھمتی نال ٹر جا..... اپڑیں تائے اور تائی کو جا کر سنبھال کہیں وہ خوشی سے پاگل ہی نہ ہو جائیں۔“ میں ٹھکا۔

”کک..... کیا ہوا میرے تایا تائی کو ماما جی خیریت تو ہے ناں۔“ میں نے پریشانی سے پوچھا۔

”اوہاں ہاں..... خیریت سے ہیں وہ ان کی دھی تھی ناہ لاڈو میں (رانی) وہ گھر لوٹ آئی ہے۔“

اس کا یہ کہنا تھا کہ میں بت بنا رہ گیا۔ پہلے تو مجھے اس کی بات کا یقین ہی نہ آیا۔

”کیا..... میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں نے کمالے کہہ مارے ملنے کا ارادہ فوری ترک کیا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

گھر پہنچا تو مجھے تب یقین آیا رانی واقعی گھر آ چکی تھی۔ تائی اسے خود سے لپٹائے ہوئے روئے چلی جا رہی تھی۔ تایا بھی خاموشی سے قریب ہی کھڑے تھے۔ میں بھی ذرا قریب جا کر گرم صم سا کھڑا ہو گیا۔

محلے کی عورتیں مرد کیا بالیاں کیا بچے سبھی جمع تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ہجوم چھٹنے لگا۔ تو میں نے رانی کے چہرے کی طرف دیکھا وہ بالکل بھلی چٹکی تھی۔ نا اس کے چہرے پر گھر سے اتنے روز کی دوری کی کوئی غم انگیزی کا تاثر تھا اور نہ ہی اپنے گھر لوٹ آنے کی خوشی کی کوئی رمت۔ بالکل سپاٹ چہرہ تھا۔ ہر قسم کے تاثرات سے عاری..... مگر جب میں نے آگے بڑھ کر اسے مخاطب کیا۔

”رانی! تو کہاں چلی گئی تھی اتنے دن..... پتہ ہے تیری وجہ سے ہم سب کس قدر پریشان رہے ہیں۔“

تو وہ عجیب میکانیکی انداز میں گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کے لبوں پہ ارتعاش سا ابھرا۔ اور وہ گوگو سے عالم میں بولی۔ ”پپ..... پتہ نہیں..... میں..... میں کدھر چلی گئی تھی..... مم..... مجھے کک..... کون لے گیا تھا..... کہاں لے گیا تھا.....؟“

”ارے دانش..... تو تو چپ ہو جا..... یہ اس کم بخت جن کی کارستانی ہو گی..... اسے آرام تو کرنے دے۔“

تائی نے کہا پھر رانی کے ”صدقہ واری“ جاتے ہوئے اسے لے کر اندر کمرے میں لے گئی۔

”تایا جان رانی نے کچھ بتایا نہیں..... یہ اچانک اتنے دن کہاں گم ہو گئی تھی؟“ میں نے بلا آخر حیران پریشان کھڑے تایا اکبر خان سے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”پتہ نہیں بیٹا کچھ بتاتی ہی نہیں ہے..... اسے کچھ یاد ہی نہیں پڑ رہا..... میرا خیال ہے یہ اس آسیب کی ہی کارستانی ہے۔“ میں ان کی بات پر خاموش ہو رہا اور پھر سر جھٹکتے ہوئے..... ایک بار پھر کمالے کہہ مار کے گھر کی طرف چل دیا۔ پتہ نہیں یہ رانی والا کیا معاملہ تھا۔ میں نے اس میں اپنا سر کھپانا ضروری نہ سمجھا۔ کیوں کہ میرے

سر پر تو صرف سوئی کا خیال جاگزیں تھا اور میں جلد از جلد کمالے کمہار کے ہاں پہنچ کر اس سے بابا کمال شاہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ کمالا ضرور مجھے اس نیک بزرگ کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتہ بتائے گا۔

بہر طور..... ذرا دیر بعد میں پکی کچی دیواروں والے ایک چھوٹے سے گھر کے دروازے پر پہنچا اور ناٹ کا پردہ ذرا سرکا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے.....؟“ اندر سے ایک عورت کی آواز ابھری۔

”چاچی میں ہوں اکبر خان کا بھتیجا..... چاچا کمالا ہے گھر میں۔“ میں نے با آواز بلند پوچھا۔

”وہ اس وقت کہاں ہوتا ہے..... آپڑیں بھٹی پر ہوگا۔“ اس عورت کی آواز ابھری۔

”اچھا چاچی میں ادھر ہی جا کر ملتا ہوں۔ سلام علیکم۔“ میں لوٹ گیا اور سیدھا کمالے کمہار کی بھٹی پر پہنچا۔ وہ ایک ساٹھا پاٹھا شخص تھا۔ اس نے لنگی اور اوپر کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا۔

اس کے ہاتھ بھٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت آدے سے برتن نکال رہا تھا۔ میں اس کے فارغ ہونے پر ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ جب وہ ذرا فارغ ہوا تو میں نے قریب آ کر اسے سلام کیا۔

”آپ تر..... کیسے آنا ہوا..... بیٹھ.....“ وہ شفقت سے بولا اور پھر ایک زمین پر بھیجی میلی چیکٹ گودڑی پر بیٹھ گیا تو میں بھی اس کے ساتھ پاتھی مارے بیٹھ گیا۔

”چاچا..... تیرے سے کچھ پوچھنا تھا۔“ میں نے احترام سے کہا تو وہ کھلے دل کے ساتھ بولا۔

”ہاں..... ہاں..... پتر بول..... کیا بات پوچھنی ہے تو نے مجھ سے۔“

”چاچا! تو بابا کمال شاہ کو جانتا ہے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں پتر اس کو تو سارا جگ جانتا ہے۔“ وہ بولا۔

”چاچا پھر تیری بڑی مہربانی ہوگی اگر تو مجھے اس نیک بزرگ کا پتہ بتا دے۔“

میری بات پر وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”پتر! پتہ تو میں تجھے بتا دوں پر اس کا ایک ٹھکانہ ہو تب ناں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہہ وہ ایک جگہ نہیں بیٹھتا..... بس کسی وقت اچانک گھومتا گھماتا

ادھر آنکلتا ہے تو یاد اللہ ہو جاتی ہے۔“

”ویسے کیا تو نے اس سے کوئی تعویذ گنڈا کروانا ہے..... اگر یہ بات ہے تو وہ

تجھے مارے گا..... کیوں کہ وہ صرف دعا دیتا ہے..... تعویذ وغیرہ نہیں۔“

”او..... نہیں..... نہیں چاچا میں نے اس سے کوئی تعویذ شادیز نہیں لیتا۔“

میں نے کہا۔

”میں نے تو بس اس اللہ والے بندے سے مل کر دعائیں لیتی ہیں..... پر

چاچا..... میرا اس سے ملنا بھی ضروری ہے۔ تو کچھ تو مجھے بتا۔ اچھی طرح سوچ کر کہ وہ

آج کل کہاں ہو سکتا ہے۔“ میں نے آخر میں بڑی منت سماجت والے انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”ویسے کافی روز پہلے وہ آیا تو تھا یہاں..... بڑی

بڑی عجیب عجیب باتیں کر رہا تھا اس بار تو..... کہہ رہا تھا مجھے اس علاقے کی ضرورت

ہے..... یہاں کوئی خبیث شیطان گھس آیا ہے..... مجھے اسے تلاش کرنا ہے..... تو ایسا

کر..... پیر بابا کے لمبے پر چلا جا ہو سکتا ہے وہ وہیں تجھے مل جائے۔“

”مگر چاچا مجھے تو پیر بابا کے لمبے کا نہیں پتہ کہاں ہے وہ.....؟“ میں نے اٹھ

کر پوچھا۔

”میں تجھے بتاتا ہوں..... یہاں سے بہت دور..... وہاں تک پہنچتے پہنچتے تو

تجھے رات آ لے گی۔“

”تو بتا تو سی چاچا..... میں صبح تڑکے نکل جاؤں گا۔“ میں نے بے چینی سے

پوچھا۔ وہ بتانے لگا۔

”گاؤں کے مشرق میں جدھر نہر ہے..... اس کی ٹاحلی والی پلی پار کرے گا تو

تھے کچے میں ایک بل کھاتی پگڈنڈی نظر آئے گی تو اس پر چلتے چلے جانا..... آگے ایک چھوٹی سی جویوں کی بستی آئے گی..... اس کے بعد چٹیل میدان اور بنجر ویرانہ شروع ہو جائے گا..... بعد میں پھلاہی اور جھنڈ کے گھنے درختوں کا ایک چھوٹا سا جنگل آئے گا۔ اسے پار کرتے ہی تھے بالکل سامنے ایک اونچا ٹیلا نظر آئے گا تو سمجھ جانا یہی پیر بابا کا مہ ہے۔“

”تیری بڑی مہربانی چاچا۔“ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ رب رکھاں..... میں اس کا شکریہ ادا کر کے واپس لوٹا۔ میں نے صبح تڑکے جانے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔ گھر آ کر میں نے تایا سے کہہ دیا کہ مجھے کل صبح قریب کے ایک گاؤں میں دوست کی شادی پر جانا ہے..... اس لئے صبح کو دکان پر وہ چلا جائے۔“ تایا کی طبیعت اب کافی بہتر تھی۔

کمالے کھار نے مجھے بتایا تھا کہ پیر بابا کا مہ کئی کوس کے فاصلے پر تھا۔ اگرچہ پیدل تو میں جاسکتا تھا مگر آنے جانے میں شام ہو سکتی تھی اور تھکاوٹ الگ۔“ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہاں کوئی سواری ہی نہیں جاتی تھی۔ کوئی لاری دیگن کچھ بھی نہیں۔ اچانک مجھے تایا کی اس پرانی سائیکل کا خیال آیا جس کے اگلے پچھلے دونوں پہنچے ہو چکے تھے۔ اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں پڑا کرتی تھی۔ اس لئے اسے ایک کونے میں پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا اگر اسے پنچر وغیرہ لگوا دیئے جائیں تو یہ کارآمد ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ اس میں کوئی بڑی خرابی نہ تھی۔ بس پھر کیا تھا میں نے اسے کل کے اہم کام کیلئے ابھی سے ہی کارآمد بنانے کا فیصلہ کیا اور سائیکل کو خوب دھو کر صاف کیا پھر اسے سائیکل والے کے پاس لے گیا۔ اس نے پانچ روپے فی پنچر کے لیے اور پانچ روپے الگ سے مزدوری کے۔ میں نے اسے جھٹ پندرہ روپے نکال کر پکڑا دیئے۔ اس نے دونوں پنچر لگا دیئے اور جو تھوڑی بہت اس میں مرمت کا کام تھا وہ بھی درست کر ڈالا۔ میں سائیکل پر سوار ہو کر گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے سائیکل محن کے ایک کونے میں اسٹینڈ پر کھڑی کی پھر روٹی وغیرہ کھا کر اپنے کمرے میں آ کر چار پائی پر لیٹ گیا۔ ذرا دیر گزری تھی کہ مجھے اپنے کمرے کے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ میرے کمرے کا

دروازہ بند ضرور تھا مگر اسے کھڑی نہیں لگاتا تھا میں..... میں نے سوچا کہ کوئی پانی وغیرہ پینے یا پیشاب کرنے کیلئے اٹھا ہو گا مگر اس وقت میں چونکے بغیر نہ رہ سکا جب کسی نے میرے کمرے کا دروازہ پورا کھول دیا۔ وہ رانی تھی اپنے ہاتھ میں دودھ کا گلاس لئے کھڑی۔

”تو نے دودھ نہیں پیا آج۔ ایسے ہی سو گیا اے شوکے۔“ رانی نے اندر آ کر مجھ سے دل بھانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”بے چاری کو میرا کتنا خیال تھا۔ میں نے سوچا۔ میں واقعی آج دودھ پینا بھول گیا تھا تاہم مجھے اس کا یوں رات کے پہرے کمرے آنا نامناسب لگا تھا۔ اگر تایا تائی اسے میرے کمرے میں دیکھ لیتے تو جانے کیا سوچتے؟ مگر میں نے اس کا دل بھی توڑنا خلاف تہذیب سمجھا۔ چنانچہ میں نے جبراً مسکراتے ہوئے اس سے دودھ کا گلاس لے لیا اور اس سے بولا۔

”میں پی لوں گا..... تو جواب.....“ وہ اڑ گئی ٹھنک کر بولی۔

”نہیں ابھی پی میرے سامنے..... نہیں تو تو دودھ پئے بغیر ہی سو جائے گا۔“

”عجیب بٹلی لڑکی تھی یہ۔“ میں نے زچ ہو کر سوچا..... اور پھر دودھ کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ میرے سامنے کھڑی بنور مجھے دودھ پیتا نکلے جا رہی تھی۔ دودھ کا گلاس ختم کر کے میں نے جب اسے خالی گلاس تھمایا تو میں نے دیکھا رانی نے بے اختیار ایک آسودہ سی سانس لی تھی پھر وہ مجھے مخموری نگاہوں سے نکتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں سر جھٹک کر چار پائی پر لیٹ گیا۔ دودھ پینے کے ساتھ ہی ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ تھوڑی دیر پہلے مجھ پر نیند کا جو غلبہ تھا وہ دودھ پینے کے بعد جاتا رہا بلکہ اب اس کی جگہ ایک عجیب سی بے نام بے چینی نے لے لی تھی۔ میں نے بار بار کروٹیں بدل کر سونے کی کوشش کی مگر بے سود نیند تو جیسے میری آنکھوں سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ مجھے اچنبھا ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں..... پھر..... پھر..... اچانک یہ بے خوابی کیسی ہو گئی تھی.....؟“

تھوڑا مزید وقت بیتا تو مجھے اپنے اندر عجیب سی سرور آ گئیں کیفیت کا احساس

ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار رانی کا چہرہ گردش کرنے لگا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا تھا۔ میں تو رانی کی طرف اس نظر سے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا پھر میرا دل آخر کیوں اس کی طرف ملتفت ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ کہیں اس نے مجھے دودھ میں کوئی تعویذ گھول کر تو نہیں پلا دیا تھا؟“ میں نے پریشانی سے سوچا اور پھر رانی کے دل و دماغ میں بار بار پیدا ہونے والے سرور آگئیں تصور سے نجات حاصل کرنے کیلئے ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ ہر سو گہرا اسرار بھرا سناٹا طاری تھا۔ میں چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں لائٹیں کی مدھم روشنی لرزے لگی..... میری چار پائی کا سایہ دیوار پر مرتعش تھا..... پھر میں نے ایک تعجب خیز منظر دیکھا۔ میں نے اپنی چار پائی پر سے اپنے ہی سائے کو اٹھتے دیکھا جبکہ میں خود چپت لیٹا ہوا تھا۔ میں نے بھی بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی تو میں اپنے وجود کے حصے کو ایک انچ بھی نہیں ہلا سکا۔ مارے دہشت کے میرا دل بری طرح دھڑ دھڑانے لگا۔ میں پشت کے بل چار پائی پر لیٹا ترچھی نظروں سے دیوار پر لرزاں اپنے سائے کو دیکھنے لگا۔ لائٹیں کی مدھم لو اب تیزی کے ساتھ لرزے لگی تھی۔ میری خوف زدہ نظریں دیوار پر لرزتے اپنے ہی سائے پر جم کر رہ گئیں۔ تب..... تب پھر میں نے اس سائے کی ہیئت بدلتے ہوئے دیکھی۔ میرا سارا وجود پسینے سے تر ہو گیا کیوں کہ وہ سایہ اپنی ہیئت بدلتے بدلتے ایک چوپائے میں تبدیل ہونے لگا..... میرا خوف کے مارے برا حال تھا۔ میں چار پائی پر اٹھ کر بیٹھا تھا۔ پھر اچانک سائے نے جست بھری اگلے ہی لمحے ایک بد ہیئت غیر انسانی مخلوق کو دیکھ کر میں لرزا اٹھا۔ یہ وہی ایک آنکھ والے انسانی سر کا چوپایا جگدوش تھا..... جواب اپنی ایک آنکھ سے مجھے گھورے جا رہا تھا..... اس کا ریچھ جیسا بالوں بھرا وجود اس چھوٹے سے کمرے میں پہاڑ جیسا لگ رہا تھا۔ یہ وہی بد بخت خبیث شیطان تھا جس نے سوئی جیسی شہزادی لڑکی کو اپنی جادوگری میں قید کر رکھا تھا۔ سوئی کا خیال آتے ہی حیرت انگیز طور پر میں نے جرأت سے کام لیا اور دل ہی دل میں اللہ کریمہ کا ورد شروع کر دیا۔ تب بھیا نک اور کمروہ صورت جگدوش غرا کر بولا۔

”اوئے بالکلے..... سوئی کا خیال اپنے دماغ سے نکال دے..... ورنہ تجھے بھی لے جا کر اس کھنڈر میں بت بنا دوں گا۔“

قرآنی آیات کا ورد کرنے کے بعد اب میں اپنے اندر عجیب سی روحانی قوت محسوس کرنے لگا تھا۔ چنانچہ میں اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے اس اکلوتی انگارہ آنکھ کو گھور کر بولا۔

”اے خبیث شیطان..... بہت جلد میں تیرا خاتمہ کرنے والا ہوں..... دفع ہو جا یہاں سے.....“

میرے غصیلے لہجے پر اس کا کمروہ چہرہ طیش سے مزید سرخ ہو گیا..... تب اس نے ایک ہولناک چنگھاڑ ماری اور غرا کر مجھ پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی میں بے اختیار مضطربات میں چیخ مار کر چار پائی پر سرک گیا۔ وہ اگلی دونوں ٹانگیں چار پائی کی پانچٹی پر ٹکا کر ایک آنکھ سے مجھے گھور کر بولا۔

”ارے بالکلے تو کیوں اپنی جان کا دشمن بن رہا ہے..... تو نہیں جانتا میں کون ہوں..... اور تو کمالی شاہ سے ملاقات کرنے کس لیے جا رہا ہے..... یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”میں کہتا ہوں دفعہ ہو جا مردود یہاں سے۔“ یہ کہہ کر میں یکدم چار پائی پر کھڑا ہو گیا۔ دیوار پر آئینہ الکرسی کا ایک طغریہ آویزاں تھا میں نے جلدی سے اسے اتار کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر چوما اور سامنے کر دیا۔ جگدوش نے ایک بھیا نک چیخ ماری اور پھر جلدی سے وہ سایہ بن کر دیوار میں غائب ہو گیا۔ اب ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ ٹھنڈ کے باوجود میرا پورا وجود پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا مردود جگدوش کے چنگھاڑنے پر تایا تائی جاگ کر دوڑے آئیں گے..... مگر کافی دیر گزر گئی کوئی نہ آیا۔ مجھے حیرت ہوئی کیا یہ لوگ اتنی ہی گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔ صحن ویران تھا۔ تایا تائی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اچانک برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا وہاں رانی کھڑی بھیدوں بھرے انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”میرے قریب آئی تو میرے ہاتھوں میں آئیہ الکری کا طفرہ دیکھ کر بے چین سی نظر آنے لگی۔“ بولی۔

”ک.....ک.....کیا.....کیا ہوا.....کیا جن دیکھ لیا تو نے شو کے.....“

”ہاں.....“ میں دھیرے سے بولا۔

”کک.....کیا تو نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی جانور کی چنگھاڑ نہیں سنی.....“

میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں تو.....“ وہ بولی پھر مسکرائی۔

”تو نے ضرور وہی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے..... یہ کیا.....؟ تو تو پورا پسینے

سے بیگما ہوا ہے چل اندر اور اسے دیوار پر آویزاں کر دے۔“ وہ بولی پھر میرے کمرے کی طرف بڑھی۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ وہ پھر بے چینی سے بولی۔ ”اے دیوار پر تو لگا دے۔“ مجھے حیرت ہوئی وہ آئیہ الکری کے کے طفرہ کو میرے ہاتھ میں دیکھ کر کچھ گھبرا سی رہی تھی۔ بہر طور جب میں نے اس کی طرف آئیہ الکری کا طفرہ بڑھاتے ہوئے یہ کہا کہ ”تم دیوار پر اسے لگا دو تو وہ یوں بدک کر پیچھے ہٹی جیسے اسے بچھونے ڈنک لیا ہو۔“

”آں.....نن.....نن.....نہیں..... میں اسے ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ تو اسے جلدی

میں دیوار پر آویزاں کر دے شو کے.....“

وہ منت کرنے والے انداز میں مجھ سے بولی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے خوف کی پرچھائیاں سی نظر آئیں تاہم میں نے پھر خود ہی چارپائی پر چڑھ کر آئیہ الکری کے طفرے کو چوما اور اسے احترام کے ساتھ دیوار پر آویزاں کر دیا۔ میں نے دیکھا رانی نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ میرے اندر اس کی یہ پراسرار کیفیت دیکھ کر کھٹک سی پیدا ہوئی تھی۔ تب پھر اچانک رانی دل آویز انداز میں مسکرا کر مجھ سے بولی۔

”آ شکو..... ادھر بیٹھ..... میرے ساتھ..... باتیں کرتے ہیں.....“ یہ کہتے

ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اس کے گداز ہاتھوں کا لمس محسوس کیا تو میرا

دل بے طرح دھڑکنے لگا حالانکہ اس سے پہلے وہ مجھے چھوتی بھی تھی تو میں بدک کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا کرتا تھا مگر اب جانے کیوں مجھے اپنا دل اس کی طرف ملتفت ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پائے رکھا تھا۔ یہ شاید اس دودھ کا اثر تھا جو رانی نے ضد کر کے زبردستی اپنے ہاتھوں سے پلایا تھا۔ کیا اس نے کوئی تعویذ گھول کر پلایا تھا مجھے۔“ میں نے سوچا جانے اور اس نے کتنے مزید مجھے تعویذ پلانے تھے اس لئے اب میں محتاط ہونا چاہتا تھا۔

لہذا میں نے اپنے ڈولتے دل پر جبر کرتے ہوئے رانی کو واپس اس کے کمرے میں بھیج دیا اور دروازہ بند کر کے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند اب مجھے کیا آنی تھی جلدوش کی دھمکی میرے دماغ میں گردش کر رہی تھی۔ مجھے اس سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس بد بخت خبیث کو جانے کس طرح پتہ چلا تھا کہ میں سوئی کے حصول کی خاطر اور جلدوش کو نابود کرنے کیلئے بابا کمال شاہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ ضرور اب میری راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرے گا۔ بہر طور میں نے بھی دل میں پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ سوئی کو بھی حاصل کر کے رہوں گا اور ظاہر ہے جلدوش کو بھی میں نے اب زندہ نہیں چھوڑنا تھا..... چنانچہ میں نے رات کا وہ آخری پہر آنکھوں ہی میں کاٹ دیا اور اعلیٰ الصباح اٹھ کر میں نے ناشتہ کیا اور جب اپنی سائیکل سٹینڈ سے اتار کر باہر نکلنے لگا تو یکایک رانی آن دھمکی۔

”دے شو کے یہ صبح تڑکے تو کدھر جا رہا ہے؟“ اس نے عجیب سی نظروں سے

مجھے دیکھ کر پوچھا۔

”قریب کے ایک گاؤں جا رہا ہوں..... دوست کی شادی ہے۔“ میں نے

جھوٹ بولا۔

”دوست کی شادی پہ جا رہا ہے..... یا کسی سے ملنے؟“ وہ تیکھی نظروں سے

مجھے دیکھ کر بولی۔ میں حیران ہوا پوچھا۔ ”بھلا بتا تو پھر کس سے ملنے جا رہا ہوں؟“

”نہیں تو بتا.....“

”چل پھر ہٹ جا پرے..... جانے دے مجھے۔“ میں سائیکل سنبھالے

”رانی ایک بات کان کھول کر سن لے..... جگدوش جادوگر نہیں ہے..... ایک خبیث شیطان ہے اور اللہ سے بہر حال بڑا نہیں ہے..... میں سوئی کو بھی حاصل کر کے رہوں گا اور اس شیطان کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہہ کر میں رانی کو حیران پریشان چھوڑ کر باہر گلی میں آ گیا پھر سائیکل پر سوار ہو کر تیزی سے پیڈل مارتا ہوا ”بے والے“ پیر بابا کے آستانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

دروازے کی طرف بڑھا تو اس نے میرا راستہ روک لیا..... اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات عود کر آئے تھے۔

”تو جس سے ملنے کیلئے جا رہا ہے..... میں اسے جانتی ہوں.....“ وہ اصرار بھرے لہجے میں بولی اور میں اسے چونک کر دیکھنے لگا۔

”ہاں شو کے تو نہ جا..... ورنہ..... ورنہ..... وہ ناراض ہو جائے گا۔“ اس کے کپکپاتے لبوں سے جیسے بے اختیار نکلا میں حیرت سے اسے دیکھ کر بولا۔

”کون..... کون..... ناراض ہو جائے گا..... اور..... تو یہ کیسے جانتی ہے کہ میں کسی سے ملنے جا رہا ہوں؟“

”بس تو یہ باتیں چھوڑ..... دیکھ نہ جا شو کے..... نا جا.....“ وہ منت سماجت والے انداز میں بولی۔

”نہیں پہلے مجھے بتا میں کس سے ملنے جا رہا ہوں.....؟“ میں نے اڑتے ہوئے اصرار کیا تو وہ میری طرف بغور دیکھ کر بولی۔ ”تو بابا کمال شاہ کے پاس جا رہا ہے ناں..... تاکہ..... تاکہ سوئی کو حاصل کر سکے؟“

میں اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ ”ت..... تو..... یہ سب کیسے جانتی ہے؟“ میں نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں تو یہ بھی جانتی ہوں شو کے کہ..... تو اس دڈے جادوگر جگدوش سے بھی مقابلہ کرنا چاہتا ہے..... مگر میں تجھ سے یہی کہوں گی کہ تو اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا..... وہ بہت بڑا جادوگر ہے۔“

اب تو مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی کہ بھلا رانی کو یہ سب کس طرح پتہ چلا تھا میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”رانی اب تجھے پہلے یہ بتانا ہو گا کہ تو یہ سب کیسے جانتی ہے۔ سوئی کو..... اس خبیث شیطان کو.....“

رانی چپ رہی تو میں بھی فیصلہ کن لہجے میں بے نیازی سے بولا۔

کمالے کمار کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق میں نے سب سے پہلے ٹاٹلی کے درختوں کے قریب بہتی نہر پار کی پھر نشیب میں بنی ٹل کھاتی پگڈنڈی میں سائیکل اتار دی۔ میں نے دانستہ سائیکل کی رفتار درمیانی رکھی تھی تاکہ جلد تھک نہ جاؤں۔ سردی زوروں پر تھی مگر میں نے بھی موسم کی مناسبت سے گرم کپڑے اونٹنی سوئز گلے کے گرد موٹا سا منظر لپیٹ رکھا تھا۔ ویسے بھی سائیکل چلانے کی وجہ سے مجھے سردی کا کم ہی احساس ہو رہا تھا۔ اس ٹل کھاتی پگڈنڈی پر دائیں بائیں خود رو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میرا ذہن اب رانی کی باتوں پہ اٹکا ہوا تھا۔ آخر اسے کس طرح اس سارے پراسرار معاملے کی خبر تھی؟ حتیٰ کہ وہ نہ صرف سوئی اور اس ضیٹ شیطان جلدوش کو بھی جانتی تھی بلکہ وہ میرے نیک عزائم سے واقف تھی۔ آخر اسے ان سب باتوں کا کیوں کر علم ہوا تھا۔ گھر سے نکلنے وقت چوں کہ میں خاصی عجلت میں تھا ورنہ میں نے رانی سے ضرور پوچھنا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں کس طرح جانتی تھی؟ تاہم میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ بابا کمال شاہ سے ملاقات کے بعد میں واپس گھر جا کر رانی سے ضرور یہ بات پوچھوں گا چاہے مجھے اس سے سختی کے ساتھ ہی کیوں نا پوچھنا پڑتا۔

میں سائیکل پر پیڈل پہ پیڈل مارتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ مجھے سامنے ایک عمر رسیدہ بڑھیا دکھائی دی..... اس کی کمر میں کب سا ابھرا ہوا تھا۔ اور وہ لالھی بھر پوری مٹی والی زمین پر ٹپکتی ہوئی آگے بڑھی جا رہی تھی۔ میں نے ازراہ ہمدردی اس کے قریب سائیکل روک دی..... میری سائیکل کے پیچھے بیٹھنے کیلئے سینڈ نصب تھا۔ بڑھیا بھی مجھے دیکھ کر رک گئی۔ میں نے نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

”اماں..... تو کدھر جا رہی ہے..... آ جا..... میری سائیکل پر بیٹھ جا..... میں

تجھے آگے اتار دیتا ہوں۔“

بڑھیا نے میری طرف دیکھا۔ اس کی رنگت خاکستری تھی۔ سفید کچھڑی سے بال گرد سے میلے چیکٹ ہو رہے تھے۔ اس کے لمبوترے سوکھے چہرے پر جھریوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ میری بات پر اس نے خاموشی سے اپنا سر ہلایا پھر یکدم وہ اچھل کر سائیکل کے پچھلے کیریز پر بیٹھ گئی جیسے جوان لڑکی ہو۔ مجھے اس کی کمال پھرتی پر حیرت تو ہوئی پھر میں ہولے سے مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے سائیکل چلانا دوبھر ہو گیا۔ اس بڑھیا کے بیٹھنے کی وجہ سے سائیکل بہت بھاری ہو گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آخر اس کچھی سی بڑھیا کا نحیف و نزار مخنی وجود اتنا وزنی کیوں کر تھا۔ ابھی میں نے آٹھ دس پیڈل ہی مارے تھے کہ میرا سانس بری طرح پھولنے لگا۔ دم پھولنے کی وجہ ظاہر تھی کہ میری سائیکل پر اضافی وزن تھا۔ اب تو مجھ سے مزید سائیکل چلانا بھی دوبھر ہونے لگا تھا بالآخر تھک ہار کر میں نے سائیکل روک دی اور بڑھیا سے ہانپتے ہوئے بولا۔ ”اماں..... تیرا وزن تو بہت زیادہ ہے..... مجھے تو بہت آگے جانا ہے..... تو مہربانی کر کے اتر جا۔“

مگر بڑھیا اڑ گئی اور خراٹ لہجے میں ہاتھ نچا کر بولی۔ ”اب میں نہیں اتروں گی اچھی بھلی تو جا رہی تھی کیوں مجھے روکا..... میرا وقت بھی ضائع کیا۔ اب لے چل مجھے اپنے ساتھ۔“ اس کی بات سن کر پہلے مجھے حیرت اور بعد میں غصہ آنے لگا کہ یہ اچھی مصیبت ہے الٹی آنتیں گلے کو پڑ رہی تھیں تاہم میں نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ ”اماں تیرا وزن بہت زیادہ ہے..... میں تو سمجھا تھا تو ہلکی پھلکی کمزور سی بڑھیا ہے تجھے آسانی سے لے جاؤں گا۔“

”تو میں کیا تجھے موٹی بھینس نظر آ رہی ہوں..... تیری اپنی سائیکل میں خرابی ہوگی اسے ٹھیک کر.....“ وہ ٹھنک کر بولی۔

میں سائیکل سے اترا..... بڑھیا بھی اتر گئی۔ میں نے سائیکل کا بغور اچھی طرح معائنہ کیا مگر اس میں مجھے کوئی خاص خرابی نہیں نظر آئی۔ میرے ذہن میں اس بڑھیا سے چھٹکارا پانے کی اچانک ایک تدبیر آئی۔ لہذا میں نے اس پر فوری عمل کرنے کا سوچا اور اس بڑھیا کو بٹھائے بغیر سائیکل پر سوار ہوا اور ہوا ہو گیا۔ اچانک بڑھیا کا مجھے



قہقہہ سنائی دیا۔ میں لرز اٹھا اگلے ہی لمحے ایک استخوانی ہاتھ میری گدی پر بڑا میں سائیکل سمیت زمین پر آ رہا..... مگر اس استخوانی ہاتھ کے شکنجے نے میری گردن نہ چھوڑی۔ میں نے تڑپ کر ذرا عقب میں دیکھا اور بری طرح دھل گیا۔

بڑھیا خاصی دور کھڑی تھی مگر اس کا خاکستری رنگت کا استخوانی ہاتھ اس قدر دراز ہو چکا تھا کہ خوف سے میری گھکی بندھ ہو گئی۔ پھر اس بڑھیا نے مجھے دور ہی سے کھینچا شروع کر دیا۔ میں مٹی میں گھسینا ہوا اس کے ذرا قریب پہنچا تو اس نے میری گردن چھوڑ دی..... میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑھیا جھکی جھکی مجھے بڑی مکارانہ مسکراہٹ سے گھور رہی تھی۔ پھر اچانک میں نے اس کی کمر پر ابھرے ہوئے کب کو ہلتے دیکھا اگلے ہی لمحے میں نے دیکھا اس کے کب کا حجم بڑھتا جا رہا تھا جیسے پھنسنے کے قریب ہو اور پھر ایسا ہی ہوا کب قمیض کو پھاڑ کر ابھر آیا اور پھر یکدم شق ہوا تو اس کے اندر سے ایک خوفناک چہرے والا سرا بھرا میں اسے دیکھ کر بری طرح دھل گیا یہ مردود جگہ دوش کا ایک آنکھ والا سر تھا۔ بڑھیا کا چہرہ جھکا ہوا زمین سے لگ گیا تھا وہ بالکل رکوع کے بل پر عجیب مضحکہ خیز لگ رہی تھی مگر کسی تکلیف کا اظہار کیے بغیر بدستور ہنسے جا رہی تھی۔

”اوئے بالکے تیرا بیڑا غرق ہو..... میں کہتا ہوں یہاں سے واپس لوٹ جا..... واپس لوٹ جا۔“ جگہ دوش کے منہ سے دو شاخہ سرخ زبان لپ لپانے لگی۔ وہ غرا رہا تھا اور سے مجھے دھمکا رہا تھا۔ میں نے اپنے خوف پر قابو پایا اور سائیکل کی طرف دوڑ لگا دی۔ سائیکل کو کھڑا کیا پھر اس پر سوار ہو کر میں نے تیز تیز پیڈل مارنے شروع کر دیئے۔ عقب میں مجھے بڑھیا کے شیطانی قہقہہ سنائی دیتے رہے مگر میں دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے سائیکل دوڑائے جا رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی چوپائے کے دوڑنے کی آواز آئی۔ میں نے ذرا گردن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھا تو بھیا نیک منظر پایا۔ وہ بڑھیا چوپائے کی طرح ہاتھوں پیروں سے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ اور اس کے کب سے جگہ دوش کا ایک آنکھ والا سر بھی بدستور موجود تھا مگر میں رکنا نہیں۔

اس بڑھیا نے خاصی دور تک میرا پیچھا کیا مگر پھر جیسے ہی سامنے مجھے آبادی کے آثار نظر آئے تو اس منحوس بڑھیا نے بھی میرا تعاقب چھوڑ دیا۔ پگڈنڈی کے دائیں

بائیں لاتعداد سرکنڈوں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ کمالے کہہاڑے کے مطابق یہی جوگیوں کی بستی تھی۔ تیز رفتاری سے سائیکل چلانے کی وجہ سے میرا دم پھولنے لگا تھا۔ میں نے ذرا سستانے کیلئے سائیکل جھونپڑیوں کی طرف موڑ دی۔ یہاں میں نے ایک ہاتھ والے نکلے (ہینڈ پمپ) سے پانی پیا پھر ذرا سانس لے کر ایک بار پھر آگے بڑھ گیا۔

مجھے گھر سے نکلے اب تک پون گھنٹہ بیت چکا تھا۔ جگہ دوش کم بخت میری راہ کھوٹی کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ مکار بڑھیا بھی درحقیقت اس خبیث جدگوش کا ہی کوئی پراسرار چکر تھا۔ میں اب درمیانی رفتار سے سائیکل پگڈنڈی پر دوڑائے جا رہا تھا۔ اب میرے ارد گرد چٹیل اور لقی وق میدانی علاقہ تھا۔ بل کھاتی پگڈنڈی بھی اب ایک کشادہ چوڑے راستے میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اور اس کی زمین بھی خاصی سخت ہونے کی وجہ سے سائیکل چلانے کی مشقت بھی مجھ سے کم ہی ہو رہی تھی۔ جاڑے کی چمکدار دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ دور مشرقی افق سورج کی دھیرے دھیرے ابھرنے والے ٹکیہ سے گلگلوں ہو رہا تھا۔ پرندوں کی چال مست ڈازیں منظم انداز میں آب و دانہ تلاشنے کیلئے محو پرواز تھیں۔ میرے اطراف میں سناٹا اور دور دور حد نگاہ تک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میرے دل کو اب بھی جگہ دوش کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ میرا اس سے اب تک کئی بار سامنا ہوا تھا۔ اور اس بار بار کی مذہبیڑ سے مجھے ایک امید افزا حوصلہ یہ ملا تھا کہ جگہ دوش جتنا بڑا ساحر سہی لیکن وہ مجھے نقصان پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی کیا خاص وجہ تھی وہ میں نہیں جانتا تھا۔ کچھ یہی وجہ تھی کہ میں اب پہلے سے بھی زیادہ حوصلے ہمت اور بے خوفی کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کیلئے بدستور جتا ہوا تھا۔

مجھے اس طرح مسلسل سائیکل چلاتے ہوئے مزید ایک گھنٹہ بیت گیا تو مجھے ذرا تسلی ہونے لگی کہ اب شاید وہ خبیث شیطان جگہ دوش میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ساتھ ہی میں دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں مانگے جا رہا تھا کہ میری یہ محنت رایگاں نہ جائے اور میری ملاقات کمالی شاہ بابا سے ہو کر رہے۔ مجھے بخوبی علم تھا

کہ کمالی شاہ بابا نہ صرف جگدوش کو جانتا تھا بلکہ مجھے وہ اس منحوس کھنڈر کے بارے میں بھی ضرور بتائے گا جہاں میرے دل کی بستی سوہنی آباد تھی۔ بلکہ قید تھی اور ظاہر ہے اس خبیث ساحر جگدوش سے مقابلہ کیے بغیر میں سوہنی کو اس کے شیطانی چنگل سے آزاد نہیں کروا سکتا تھا تاہم مجھے ایک یہ بھی پریشانی ہو رہی تھی کہ آخر میں ایک عام سا انسان ایک کالے منٹروں کے حامل ساحر سے کیوں کر مقابلہ کر سکتا تھا؟ البتہ پھر بھی مجھے تھوڑی بہت تسلی تھی کہ اس کا حل بھی کمالی شاہ بابا مجھے ضرور بتائے گا۔ کیوں کہ آخر کار وہ اللہ والا بندہ تھا اور جگدوش بھی اس سے یقیناً خائف تھا۔ یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد میرے دل میں اس اللہ والے بندے سے ملنے کی خواہش مزید جڑ پکڑنے لگی۔ معاً مجھے سامنے پھلا ہی اور جٹ کے درختوں کا ایک گھنا جنگل دکھائی دیا۔ کمالے کہہ رہے تھے کہ بتائے ہوئے راستے کے مطابق اس مذکورہ جنگل کو پار کرنے کے بعد..... بٹے والے پیر بابا کا آستانہ نظر آتا چاہئے تھا۔ جدھر کمالی شاہ بابا کی موجودگی کی امید تھی مگر جیسے جیسے پھلا ہی اور گھنا جنگل قریب آتا جا رہا تھا میرے دل کو ایک انجانے خوف نے بھی جکڑنا شروع کر دیا تھا۔ بالآخر میں اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہاں راستہ تک پڑنے لگا تھا مگر اب بھی بہر حال وہ..... پگڈنڈی سے ذرا کشادہ ہی تھا۔ اب میرے آس پاس پھلا ہی اور جھنڈ کے پیڑوں کے علاوہ قد آدم جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہاں سورج کی روشنی بھی کم پڑ رہی تھی۔ اس لئے دن میں بھی جنگل کے اندر اندھیرے کا سا گماں ہو رہا تھا۔ میں نے ایک تنگ سا موڑ کاٹا تو سامنے ایک کچے راستے کے بالکل بیچ میں مجھے کوئی شے چکر داری شے پڑی نظر آئی۔ میں آہستہ آہستہ سائیکل چلاتا ہوا جیسے ہی اس کے ذرا قریب پہنچا تو میں نے یکدم اپنی سائیکل کو بریک لگا دی۔ وہ کوئی بہت موٹا اور کالے رنگ کا ناگ تھا مگر اس نے اپنا بھن اپنے چکر دار وجود کے اندر چھپا رکھا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے سائیکل روک کر اپنے دونوں پاؤں گدی پر بیٹھے بیٹھے زمین پر ٹکا دیئے تھے مگر سائیکل سے اترا نہیں تھا اور چند لمحے خوف زدہ سی نظروں سے اس خوفناک ناگ کو کنڈلی مارے بیٹھے دیکھتا رہا۔ اب میرے پاس اس کے

قریب سے گزر کر آگے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر مجھے اس کے قریب سے ہو کر گزرتے ہوئے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں یہ سویا ہوا ناگ یکدم جاگ نہ پڑے اور مجھے ڈس لے۔ اس سنان اور ویران جنگل میں کوئی میری مدد کو نہ آئے گا۔ میں تو اس کے مہلک زہر سے پانی مانگے بنا ہی ڈھیر ہو جاؤں گا۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ ادھر ہی سے واپس گاؤں لوٹ جاؤں مگر اس طرح میرا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا اور پھر سوہنی..... سوہنی کو ہر حالت میں حاصل کرنے کی دھن بھی تو میرے سر پر سوار تھی۔ سوہنی کی من معنی صورت چشم تصور میں ابھرتے ہی میں نے اپنے اندر ایک عجیب سا حوصلہ محسوس کیا جو یقیناً جذب محبت کا ہی رہین منت تھا۔ چنانچہ میں نے پھر یہی فیصلہ کیا کہ سائیکل سے اتر کر ذرا ایک طرف ہوتے ہوئے ناگ کے قریب سے گزر جاؤں۔

یہ ارادہ باندھ کر میں بہ آہستگی سے سائیکل سے اتر کر اللہ کا نام لیا اور آہستہ آہستہ میں نے سائیکل کا ہینڈل پکڑ کر پیدل ہی آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ میری ٹھنکی ہوئی نظریں لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتے ناگ پر جمی ہوئی تھیں اور متوحش سادل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا..... مجھے اپنی سانسیں بھی زور زور سے چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور پورے وجود میں لرزش سی طاری ہو گئی تھی۔

میں اب لمحہ بہ لمحہ ناگ کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کے اور میرے درمیان فاصلہ دم بہ دم گھٹتا چلا جا رہا تھا۔ آٹھ فٹ، چھ فٹ، چار فٹ، دو فٹ..... میرا دل اب جیسے حلق میں آن آٹکا۔ سانس بھی میں نے روک لی۔ ناگ کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ میرے قدم اب غیر ارادی طور پر تیز تیز اٹھنے لگے تھے اور پھر جیسے ہی میں ناگ کے بالکل پاس سے گزرنے لگا تو اچانک فضا میں ایک تیز پھنکار کی خوفناک آواز گونجی۔ ناگ نے اپنا لمبا چوڑا بھن کاڑھ لیا۔ اسے جاگتا دیکھ کر میرے حلق سے بے اختیار اضطرابی چیخ نکل گئی۔ سائیکل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ ناگ کا بل دار وجود حرکت میں آ گیا تھا۔ اس کی دو شاخہ سرخ زبان لپٹا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب مقناطیسی کشش تھی کہ میرے پاؤں بھی وہیں جیسے زمین پر گر کر رہ گئے تھے۔ اس

نے جیسے مجھ پر تنویمی عمل کر ڈالا تھا۔ باوجود کوشش کے میں ایک قدم بھی آگے بڑھانہیں پارہا تھا۔ ایسے میں وہ ناگ خوفناک پھنکارے مارتا ہوا اپنا غیر معمولی چوڑا پھن لہراتا ہوا میرے چہرے کے قریب لے آیا۔ میں مارے دہشت کے تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے اپنی یقینی موت سامنے نظر آرہی تھی مگر ابھی تک اس خوفناک ناگ نے مجھے ڈسانہیں تھا۔ تب پھر اچانک میری نظر ناگ کے زمین پر پڑے بل دار وجود پر پڑی تو وہاں مجھے کسی کا دھیرے دھیرے سرا بھرتا دکھائی دیا۔ یہ انسانی سر سے مشابہ ایک انتہائی مکروہ اور خاکستری سا چہرہ تھا جس کی پیشانی پر صرف ایک آنکھ تھی۔ میں اسے پہچان کر بری طرح لرز گیا یہ اس مردود جگدوش کا سر تھا جس کی صرف کالی موٹی سی گردن نظر آرہی تھی باقی نیچے ناگ کا بل دار وجود گولائی میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ کا لہورنگ ڈیلا مجھے قہر آلودہ نظر سے گھور رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پہ شیطانی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ ناگ کا لمبا چوڑا خوفناک پھنس ہنوز میرے چہرے کے سامنے سنسناتا پھنکارے مارتا لہرا رہا تھا۔

”اوئے بالکے..... بد بخت..... اب بھی وقت ہے لوٹ جا یہاں سے ورنہ مفت میں جان سے جائے گا..... ورنہ یہ ناگ تجھے ڈس لے گا تو تیرا انسانی وجود پانی بن کر بہہ جائے گا۔“ میں اس کی غراہٹ سے مشابہ آواز سن کر دھل گیا۔ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ یہ ناگ واقعی بہت زہریلا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ میں یہاں سے واپس بھاگ اٹھوں..... میرے اندر کوئی عجیب سی نامعلوم طاقت جو مجھے آگے قدم بڑھانے پر اکسارہی تھی۔ میں نے دل مضبوط کیا اور پھر زیر لب قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے سائیکل اٹھائی تو یکدم وہ ناگ میرے وجود کے گرد لپٹتا چلا گیا۔ میرے حلق سے لرزیدہ چیخ ابھری..... جگدوش کا ایک آنکھ والا خوفناک سرا ب غائب ہو چکا تھا۔ ادھر وہ ناگ موٹے رے کی طرح میرے وجود کے گرد لپٹتا جا رہا تھا۔ مجھے اب موت سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ ناگ لمحہ بہ لمحہ اپنی گرفت تنگ کرتا جا رہا تھا اور مجھے اپنی ہڈیاں تک چنچنی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرا دم گھٹنے کے قریب ہوتا جا رہا تھا..... میری

سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے انگ کر رہ گئی تھی اور اس لمحے میری کھٹکتی ہوئی سماعتوں میں ایک آواز ابھری۔

”کیوں بالکے! میں تو تجھے اپنی ایک مجبوری کے تحت چھوڑتا رہا تھا مگر یہ اصلی اور سچ مچ کا ناگ ہے..... تجھے ڈسے بغیر نہیں چھوڑے گا۔“ میں اس آواز کو پہچان گیا تھا یہ اس مردود جگدوش کی سرگوشیاں آواز تھی۔

میں اس بار دہل گیا تھا میں نے بہت زور لگایا مگر ناگ کے کس دار بل نے مجھے نہ چھوڑا اور پھر اس نے مجھے گردن میں ڈس لیا..... میرے پورے وجود میں جیسے چنگاریاں بھرن گئیں اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا مگر ہوش کھوتے کھوتے میں نے کچھ عجیب سے شور کی آوازیں سنی تھیں۔

☆.....☆.....☆

دوبارہ آنکھ کھلی تو میری نظریں دھندلا رہی تھیں..... میں دہل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں مر چکا ہوں اور میری روح عالم ارواح پہنچ چکی ہے کیوں کہ مجھے اپنا وجود نہایت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا..... میں نے دو تین بار اپنے سر کو جھٹکا دیا تو کچھ دھندلاہٹ آنکھوں کے سامنے سے چھٹی تو میں نے خود کو ایک جھلنگ سی چارپائی پر پڑے پایا۔ میری چارپائی کے گرد خاکستری رنگ اور لمبو ترے چروں والے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ انہوں نے میلی چیکٹ واسکٹیں اور نیچے پیلے رنگ کی لنگی باندھی ہوئی تھی اور سر پر بھی اسی رنگ کی پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں۔ گلے میں ان سب کے مونے مونے منکوں اور کوڑیوں والی مالائیں جھمی ہوئی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے مجھ سے پوچھا۔ ”بھو! کیسا ہے تو..... کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی پڑی آتی جاتی سانسوں میں۔“

میں نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ”شکر کر بھو! ہم پہنچ گئے تھے وقت پر..... اور اس سرے ناگ بادشاہ کو چھاپ لیا۔ تو اب بھٹک نہ کر..... ہم نے تیرا سارا جھم (زہر) چوس لیا ہے۔“ وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

پھر اس کے ساتھ کھڑے ایک نسبتاً جوان شخص نے بھی بڑبڑاتے ہوئے لقمہ دیا۔

”ناگ بادشاہ بڑا ضرور تھا پر اتنا کھترناک تھا کہ ہمیں بھی اس سرے کو چھاپتے ہوئے دانتوں پسینہ آ گیا۔“

”مم..... میں..... کہاں ہوں.....؟“ میں نے ہکلاتے ہوئے نیم غنودہ لہجے میں پوچھا۔

”تو جہاں بھی ہے کھیریت سے ہے..... لے یہ گرما گرم دودھ پی لے۔“ اس

ادھیڑ عمر والے شخص نے مجھے دودھ کا گرما گرم گلاس دیا۔ میں نے پانی مانگا تو اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بھو! پانی ابھی دو تین گھنٹوں تک نہ پینا..... لے یہ دودھ پی لے۔“

اس نے ذرا سہارا دے کر مجھے اٹھایا۔ میرا حلق سوکھ کر کاٹنا ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کسی جوجیوں کی بستی میں ہوں اور میری یہ خوش قسمتی تھی کہ عین وقت پر انہوں نے ناگ کے جنگل سے نہ صرف چھڑا لیا تھا بلکہ میرا سارا زہر بھی چوس لیا تھا۔ تب مجھے یاد آیا جب میں اس خوفناک ناگ کے ڈسنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تو میں نے بیہوش ہوتے وقت جن لوگوں کے شور کی آوازیں سنی تھیں وہ انہیں لوگوں کی تھیں۔ قصہ کوتاہ یہ لوگ جوجی ہی تھے..... اور اتفاق سے اس وقت یہ لوگ وہاں سے گزر رہے تھے۔

یہ جوجیوں کی وہی بستی تھی جو پھلا ہی میں جھنڈ کے جنگل سے ذرا دور تھی۔ جسے میں اپنی سائیکل میں پار کر آیا تھا۔

میری سائیکل بھی انہی لوگوں کے پاس محفوظ تھی۔ ذرا دیر بعد میں نے ان سے جانے کی اجازت مانگی اور پھر ان کا شکر یہ ادا کر کے..... اپنی بائیسکل سنبھالی اور ایک بار پھر پیر پیرے والے بابا کی طرف چل پڑا۔

اس گورکھ دھندے میں مجھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ مگر اللہ کا شکر تھا میری جان بچ گئی تھی۔ دودھ پینے کے بعد میں اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کر رہا تھا۔ دھوپ اب کافی پھیل چکی تھی اور..... سورج بھی خاصا اونچا ہو گیا تھا۔ میرے سر پہ آج ہی کمالی شاہ بابا سے ملنے کی دھن سوار تھی۔ اس لئے اب میں تیز تیز بیڈل مارتا سائیکل دوڑائے چلا جا رہا تھا بلاآخر میں نے ہمت دھو صلی، مستقل مزاجی کے ساتھ جنگل بھی پار کر لیا تو سامنے مجھے ایک میدان نظر آیا۔ اور پھر دور ہی سے مجھے وہ اونچا سا شاد کھائی دے گیا۔

تیز سائیکل چلانے سے میرا دم بھی بہت پھول چکا تھا مگر منزل کو قریب دیکھ کر میں سائیکل بھگاتا ہوا بے کے قریب پہنچ گیا۔ سائیکل سٹینڈ پر کھڑی کر کے میں بے پر چڑھنے لگا۔ سامنے گارے مٹی کی کچی چہار دیواری سی تھی اس کے وسط میں مجھے ایک قبر

دکھائی دی۔ جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی مڑھی (کٹیا) بنی ہوئی تھی۔ میں نے چند لمحے وہیں کھڑے ہو کر اپنی پھولی ہوئی سانسیں ذرا بحال کیں پھر اس کے بعد میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا مڑھی کی طرف بڑھا۔ مڑھی پر بوسیدہ ساٹا پڑا ہوا تھا۔ میں قریب جا کر ذرا متذبذب سا ہو کر کھڑا ہوا تو اچانک اندر پر جلال آوازا بھری۔

”اندرا آ جانے، ہم تیرا ہی انتظار کر رہے تھے۔“ اس آواز پر میں چونکا اور ہمت کر کے آگے بڑھا پھر ٹاٹ آہستگی سے اٹھا کر اندر آ گیا۔ سامنے کچے فرش پر بچے مرگ چھارا پر ایک ننگ دھڑنگ باریش درویش سا بزرگ آنکھیں موندے آدھے کنول کے آن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اوپری بدن نیم برہنہ تھا نیچے لنگی تھی۔ دائیں ہاتھ میں تسبیح اور چہرے کے گرد نورانی ہالا سا بتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا پھر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں وہیں پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ میں بلاآخر کمالی شاہ بابا کے پاس پہنچ چکا تھا..... مگر میں اس کی بات پر کہ وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا چونکا ضرور تھا۔

”آ..... آپ..... بابا کمال شاہ ہی ہیں نا.....“ میں نے ہولے سے ازراہ احترام پوچھا۔

”ہاں..... ہم بابا کمال شاہ ہیں..... اور تو ہم سے کیوں ملنا چاہتا ہے یہ بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔“

بابا کمال شاہ نے پر جلالی لہجے میں کہا۔ میں نے پھر انہیں ساری تفصیلات بتا ڈالیں۔ اپنے خواب سے لے کر سونہی کے بارے میں پھر جگدوش اور رانی کے بارے میں..... وہ یہ ساری باتیں غور سے سنتا رہا۔ اس کا نورانی چہرہ اب جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ معمول پر آ گیا۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اس کے قریب سرک آیا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے میرا کاغذ ہاتھ تھپتھپایا۔ ”شاباش بیٹا..... ہم تیرے اس عظیم نیک مقصد میں سچے ارادے سے بہت خوش ہوئے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے قریب پڑی اپنی بوسیدہ سی گڈری میں سے ایک تعویذ نکالا اور میرے دائیں بازو کی آستین اٹھا کر باندھ دیا۔

”بابا آپ میری رہنمائی فرمائیں اور جب تک مجھے اس سارے پراسرار کھیل کی اصلیت کا علم نہ ہوگا میں اس مردود شیطان جگدوش کا خاتمہ نہیں کر پاؤں گا۔“ میں نے بلاخر اپنا مطمح نظر اسے بتایا۔ وہ زیر لب آنکھیں موندے کچھ بد بدلاتے رہے پھر انہوں نے مجھ پر ایک پھونک ماری اور آنکھیں کھول دیں۔ ”ہاں..... ہم تجھے ساری بات بتاتے ہیں سنو۔“ وہ بولے۔ اور میں ہمدن گوش بر آواز ہو گیا۔ میں بغور بابا کمال شاہ کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے باریش چہرے پر پہلی بار مجھے عجیب سے اچھے ہوئے تاثرات کا جال سا بنتا نظر آنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ بتاتے ہوئے کسی بے نام سی الجھن یا پریشانی کا شکار ہوں۔ پھر چند ثانیوں کے بعد ان کے ہونٹوں پر جنبش ابھری وہ بولے۔

”بچے کاش! میں اس مردود جگدوش کے بارے میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا۔“

”مرے نیک بچے حقیقت یہی ہے کہ میں خود بھی پوری طرح جگدوش کے بارے میں نہیں جانتا..... بس مجھے اپنے مرشد کے ذریعے صرف ایک ایسے شیطان کا خواب میں اشارہ ملتا تھا۔ ”منخوس گہرائیوں“ سے ایک شیطان مردود کا ایک شتو گڑا جگدوش اپنے کالے کرتوتوں کو پروان چڑھانے کیلئے ہماری پاک دھرتی پہ قدم رکھنے والا ہے..... اور اس کی سب سے بڑی پہچان اس کا ایک آنکھ والا خوفناک سر ہے۔

بابا کمال شاہ اتنا کہہ کر ذرا تھما..... میں مبہوت سا اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر بعد کہنا شروع ہوا۔

”مردود شیطان کا شتو گڑا..... جگدوش منخوس گہرائیوں سے اپنے کون سے کالے کرتوتوں کو پورا کرنے کے مقصد سے اس پاک دھرتی میں آیا ہے..... افسوس یہ پراسرار راز میں باوجود کوشش اور طویل کڑی ریاضت کے باوجود اب تک نہیں جان سکا ہوں..... اسے ہمارے مرشد پیر بے والے بابا نے بھی اشاروں سے ہی ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے تاہم انہوں نے اس شتو گڑے جگدوش کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے امام ضامن کے روئے پر چند قرآنی آیات پڑھ کر دم کرنے کا طریقہ بتایا اور..... جو بھی اس شتو گڑے جگدوش کے شر کی پلیٹ میں آچکا ہو یہ اس کا اثر زائل کر ڈالے گا.....“ یہ

یوں تو بابا کمال شاہ سے میری ملاقات اتنی ناکام بھی نہیں گئی تھی۔ لیکن جگدوش کے بارے میں تفصیل وہ بھی نہیں بتا پائے تھے۔ اگرچہ اس کے شر اور کالے منٹروں والے جادو سے محفوظ رہنے کیلئے انہوں نے دوا لگ الگ تعویذ مجھے دے ڈالے تھے لیکن پھر بھی میرے اندر کی تشنگی باقی تھی۔ میں مایوسانہ انداز میں ست روی سے سائیکل چلا رہا تھا اور میرے دماغ میں بابا کمال شاہ کی جگدوش سے متعلق گفتگو گردش کر رہی تھی جو بالکل مبہم تھی۔

بابا کمال شاہ نے ”منخوس گہرائیوں“ کا ذکر کیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا آخر یہ کدھر واقع تھیں۔ جہاں سے مردود شیطان کا شتو گمڑا جگدوش وارد ہوا تھا۔ اس بات سے تو میں نے اتنا اندازہ لگا لیا تھا کہ جگدوش کا اصل ٹھکانہ بھی وہی منخوس گہرائیاں ہی ہوں گی۔ کیا خبر..... وہ پراسرار کھنڈر بھی جہاں اس نے معصوم سونی کو مقید کر رکھا ہے اس علاقے میں ہو..... اگر فرض کیا میں ان منخوس گہرائیوں میں پہنچ کر اتر جاتا ہوں تو..... پھر جگدوش سے کیسے مقابلہ کر سکوں گا.....؟ غرض میرا دماغ دکھنے لگا..... مجھے جگدوش تک پہنچنے یا اسے نابود کر کے سونی کو وہاں سے باحفاظت نکال لانے کی کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکہ ہوا..... وہ ایک خیال تھا جو بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں لپکا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرے اندر مایوسیوں کی دھند چھٹنے لگی..... مجھے پوایقین تھا اب میرا کام ہو جائے گا..... بس ذرا میرے گھر پہنچنے کی دیر تھی۔ اب تو میرے پورے وجود میں امید کی کرن پھوٹ گئی تھی۔ اسی لئے میں نے سائیکل تیز رفتاری کے ساتھ چلائی شروع کر دی۔ میرا چہرہ کامیابی اور امید کے جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

کہہ کر بابا کمال شاہ نے مجھے ایک اور تعویذ دیا جو روپیہ کے سکے کے برابر گول تھا۔ اس پر چمڑا چڑھا ہوا تھا۔ میں نے از حد احترام سے وہ تعویذ بھی رکھ لیا۔  
”تم نے اس جگدوش کو نابود کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے..... اس نیک مقصد سے ہمیں خوشی ہوئی ہے۔“

”بابا..... وہ تو سب ٹھیک ہے..... مگر..... مجھے آخر تو کچھ تو پتہ چلے کہ میں جگدوش تک کیسے پہنچ پاؤں اور اس کا خاتمہ بھی کیسے کروں گا۔“ میں نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

”اللہ تیری رہنمائی خود فرمائے گا..... جس طرح خواب میں تو نے اس کھنڈر کو دیکھا۔ بس بچے اب تو چلا جا..... اس سے آگے ہم تیری کچھ مدد نہیں کر سکتے۔“  
یہ کہہ کر بابا کمال شاہ نے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ وہ جلدی جلدی تسبیح کے دانے رولنے لگے۔ ان کے ہونٹ متحرک تھے۔ میں خاموشی سے واپس پلٹ آیا۔ سوچوں میں گم ہونے سے نیچے اتر اور سائیکل پر سوار ہو کر واپسی کیلئے رخت سفر باندھا۔

☆.....☆.....☆

وہ یہ کہہ کر رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے بھی سردست دانستہ چپ سادہ لی۔ کھرے پہ جا کر منہ ہاتھ دھویا پھر ہاتھ پونچھتا ہوا اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اتنے میں رانی روٹی کا چھابہ اٹھائے داخل ہوئی۔ میں نے اب اس بیٹی کا منہ کھلوانے کیلئے فوراً کینجلی بدلی اور نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالا تو وہ..... میرے سامنے ہی چارپائی پر بیٹھ کر مجھے اٹھو نیارن کی طرح محبت سے روٹی کھاتا سکنے لگی۔ میں نے جبراً ہونٹوں پہ مسکراہٹ سموتے ہوئے اس سے پیار بھری حلاوت سے کہا۔

”رانی.....“

”ہوں۔“

”ایک بات تو بتا۔“

”پوچھو۔“

”تو میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔“

”کسی اپنے کا ہی خیال تو رکھا جاتا ہے..... اور تو غیر تھوڑی ہے۔“ وہ ایک ادائے دل ربائی سے بولی۔

”ہاں..... یہ تو ہے..... آخر کو میں تیرا چاچا زاد ہوں۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

”صرف چاچا زاد.....؟“ وہ مخمور سی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔

”تو پھر.....؟“ میں نے اسے شیشے میں اتارنے کی غرض سے آگے بڑھنے کی راہ دی۔

”تو پھر کیا..... تو میرا بچن بھی تو ہے..... لیکن تو تو پتہ نہیں کیوں مجھ سے بیری

رہتا ہے..... بتا کیا کمی ہے مجھ میں..... حسین ہوں..... جوان ہوں.....“ وہ اپنے سارے نسوانی غمزے عشوے کے ساتھ بولی۔

میں نے ہنستے ہوئے چالاکی سے کہا۔ ”نہیں میں بھلا تجھ سے بیری کیوں ہونے لگا..... تو واقعی بہت ہی..... بہت خوبصورت..... مگر۔“ میں دانستہ تھا تو وہ جیسے

میں اب جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

مجھے گھر پہنچتے پہنچتے سہ پہر ہو چلی تھی۔ شکر تھا کہ شام گہری نہیں ہوئی تھی۔ میں بہت تھک چکا تھا۔ میں بائیکل سمیت گھر میں داخل ہوا۔ ایک کونے میں سائیکل کھڑی کی..... تایا ابھی تک دکان سے نہیں آئے تھے۔ تائی پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ تایا مغرب کے بعد ہی دکان سے آتے تھے۔ رانی گھر پر ہی تھی۔ وہ جیسے میری ہی منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر میری طرف بڑھی اور بولی۔

”شو کے..... مل آیا بابا کمال شاہ سے.....؟“ مجھے اس کے پوچھنے کے انداز سے حیرت تو ہوئی مگر میں اب ذرا چالاکی سے کام لینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ میرے ذہن میں جگدوش کے ٹھکانے سے متعلق آگاہی اب صرف اور صرف رانی ہی دے سکتی تھی۔ اس لئے میں نے اس سے جواباً کہا۔ ”ہاں مل تو آیا ہوں.....“

”تو پھر اس نے جگدوش کے ٹھکانے کے بارے میں تجھے کچھ بتایا؟“

”ہاں.....“ میں نے مختصراً جواب دیتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا۔ وہ پریشان سی نظر آنے لگی میں نے اس سے پوچھا۔

”رانی! ایک بات تو بتا؟“

”ہاں..... پوچھو.....“ وہ گم صم سے لہجے میں بولی۔

”تو یہ سب کیسے جانتی ہے.....؟“

”کیا.....؟“

”یہی کہ میں بابا کمال شاہ سے ملنے گیا تھا..... تو جگدوش کے بارے میں کیسے جانتی ہے؟“

”شو کے..... مجھ سے یہ سب نہ پوچھ میں تجھے نہیں بتا سکتی۔“ آ تو نے روٹی بھی نہیں کھائی ہوگی۔ اماں ابا کو تو دوست کی شادی کا بہانا بنا کر گیا تھا اس لئے اماں نے تیری روٹی بھی نہیں بنائی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ تو کسی کی دعوت کھانے نہیں گیا ہے..... چل اندر کمرے میں جا کر منہ دھو کر بیٹھ میں روٹی لاتی ہوں تیرے لئے۔“

اپنی آنکھوں میں ان گنت حسین خواب بھائے یکدم بے چینی سے بولی۔  
”مگر کیا شو کے..... یار۔“

”مگر یہ کہ تجھ پر کسی آسیب کا سایہ جو ہے..... مجھے تو لگتا ہے کوئی جن جھپٹ  
تجھ پر پہلے سے عاشق ہو گیا ہے۔“  
میں یہ کہتے ہوئے اس کے گلزار پڑتے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میری  
بات پر وہ یکدم پریشان سی ہو گئی۔

”نہیں..... نہیں شو کے..... ایسی بات نہیں ہے.....“  
”نا بابا مجھے تو تجھ سے ڈر لگتا ہے..... ایسا نہ ہو میں تجھ سے شادی کر بیٹھوں اور  
وہ بھوت میرے گلے پڑ جائے۔“  
میں نے اسے بے وقوف بننے دیکھ کر چال چلی تو وہ یکدم خوشی سے چلا کر  
بولی۔

”سچ..... تو مجھ سے شش..... شادی کرنا چاہتا ہے۔“  
”ہاں..... کیوں نہیں.....“

”پھر تو مجھے ڈانٹا دھتکارا کیوں رہتا تھا ہر وقت۔“ اس نے بڑے ناز و ادا  
سے شکوہ کیا۔ ایسے میں اس کے پر شاب سینے سے دوپٹہ ڈھلکا تو میں نے اپنی نظریں  
وہاں جمادیں۔ اس نے میری نظروں کی بے باکی کی سمت اپنی ٹھوڑی سینے سے لگا کر  
وہاں جھانکا تو اسے اپنے ہی بھرے سینے کی گولایوں کی گداز اور بیجان انگیز لکیر نظر  
آ گئی تو وہ میری ”چوری“ کو سمجھ گئی۔ مگر اس نے اسے ڈھانپنے کی کوشش کیے بغیر بیجان  
انگیز لکیر کو مزید نمایاں کرنے کیلئے میری طرف جھکی اور میرا دماغ سنسنے لگا۔ میں نے  
یکدم اپنی نظریں موڑ لیں۔ اس میں میری ہوس کی بجائے چالاک کی کا دخل تھا۔ وہ اس  
طرح قیامت خیز انداز میں جھکے جھکے مجھ سے نیلے لہجے میں بولی۔ ”بتاناں..... میں تجھے  
اتنی اچھی لگتی ہوں تو پھر مجھ سے بیزار کیوں رہتا تھا.....؟“

”دراصل وہ میں تیرے ساتھ ہی بچپن میں کھیل کر جوان ہوا تھا ناں اس لئے  
تجھے میں ایک چھوٹی سی بچی ہی سمجھا کرتا تھا۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے ایک بار جبراً اس کے کھلے گریبان میں دوبارہ بے باکی  
سے جھانک کر جذبات انگیز لہجے میں کہا۔ حالانکہ میں ایسے عامیانه پن کو اچھا نہیں سمجھتا  
تھا مگر یہ سب ضروری تھا اسے شیشے میں اتارنے کیلئے۔  
”تو پھر اب بھی کیا میں تجھے بچی لگتی ہوں۔“ وہ بدستور دعوت نظارہ دیتے  
ہوئے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھ کر معنی خیز لہجے میں بولی تو میں یکدم اپنی باجھی پھیلائے  
ہوئے بولا۔

”نہیں تو آج مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تو تو پوری جوان گھوڑی بن چکی ہے۔“  
”سچ..... تو پھر تو گھوڑا بن جاناں.....“ وہ جلدی سے عجیب ترنگ میں بولی۔  
میں گھبرا سا گیا۔ تھنپتی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”تو بھی جھلی ہے..... بھلا میں گھوڑا کیسے  
بن سکتا ہوں۔“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ صحن کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ یکدم  
سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور جلدی سے اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔ تائی آ چکی تھی۔ میں بھی  
روٹی کھا چکا تھا۔ رانی اپنا سرخ پڑتا چہرہ لیے کھانے کے برتن اٹھانے لگی تو میں جلدی  
سے اس کے بھرے بھرے کو لیے پر چٹکی بھر کر بولا۔ ”پھر کب آئے گی؟“  
”وہ جیسے خوشی سے نہال ہو گئی۔ اور پھوہڑ پن سے بولی۔“ اب اتنا بے صبرانہ  
بن.....“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میں نے سکھ کا سانس لیا اور چار پائی پر دراز ہو گیا۔ رانی کو اگرچہ اپنے گلے  
پڑوانا خطرناک تھا مگر یہ سب ضروری تھا۔ وہ بٹلی اس طرح ہی شیشے میں اتر سکتی تھی۔ وہ  
اپنے تئیں مجھے الو بیمار ہی تھی اور میں الو بن کر اسے الو بلکہ گدھی بنانے کے چکروں میں  
تھا۔ میں اس سے محبت اور پیار کا کھیل کھیل کر اس کے منہ سے اگلوانا چاہتا تھا کہ آخر وہ  
اس مردود شیطان کے شتو مگرے..... جگدوش کو کیسے جانتی تھی۔ نیز اسے سوئی اور میرے  
جگدوش کے خلاف عزائم کا سن طرح علم ہوا تھا؟

رات ہوئی تو رانی دوبارہ نازل ہو گئی۔ حسب معمول اس کے ہاتھ میں دودھ  
کا گلاس تھا۔ میں اندر سے گھبرایا کیوں کہ اس دودھ میں نجانے وہ کیا گھول کر لاتی تھی  
کہ جسے پیتے ہی میرا دل بے اختیار رانی کی طرف کھینچنے سا لگتا تھا مگر میں نے بھی اس



باریکا تہیہ کر لیا تھا کہ یہ دودھ نہیں پیوں گا۔

”لے..... یہ دودھ پی لے..... میرے گھوڑے۔“ وہ پھر پھیلنے لگی۔ میں اپنی نظروں میں اس کیلئے محبت کے سمندر موجزن کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”دودھ بھی پی لوں گا..... لا ادھر.....“ یہ کہہ کر میں نے اس سے دودھ کا گلاس لیا اور قریب دھری چھوٹی سی تپائی پر رکھ دیا۔ وہ ذرا بے چین ہو گئی بولی۔ ”نہیں پہلے یہ دودھ پی لے۔“ میں نے اس کا نرم و گداز ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پھر مجبوراً تھوڑی سی ”جسارت“ بھی کر ڈالی اور بولا۔ ”دودھ بھی پی لوں گا..... ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا..... زبردستی پلائے گی تو الٹی آ جائے گی مجھے..... کل بھی ایسا ہی ہوا تھا تو زبردستی دودھ پلا گئی تو بعد میں مجھے الٹی آ گئی تھی۔“

”پھر وعدہ کر میرے جانے کے بعد پی لے گا۔“

”ہاں وعدہ.....“ میں نے جھوٹا وعدہ کیا اور وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ پھر میری طرف دیکھ کر گہرے لہجے میں بولی۔

”شو کے..... تو پھر تو کب بات کر رہا ہے..... اماں ابا سے.....؟“

”میں اس کی بات کا مطلب سمجھنے کے باوجود تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے انجان بن کر بولا۔

”کیسی بات؟“

”اوہ..... تو بھی جھلا ہے پورا۔ اپڑی اور میرے ویاہ دی گل اور کی.....“

”آ..... اچھا اب میں..... مگر..... وہ..... جن.....؟“ میں نے خوف زدہ نظر آنے کی ایکٹنگ کی تو وہ جھنجھلا کر بولی۔

”ایہہ توں کی جن..... جن..... دی رٹ لا رکھی ہے۔“

”تو اور کیا پر..... بھلا تجھے کیسے معلوم ہوا کہ..... میں کسی جگہ دش نامی جادوگر سے لڑنے کیلئے بابا کمال شاہ کے پاس آج ملنے گیا تھا؟“ میں نے جھٹ مطلب کی بات نوک زبان پر لاتے ہوئے کہا۔ میری تاویل پر اس کے چہرے کے تاثرات لمحہ بھر کو بدلے پھر وہ میری بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے بولی۔

”تو تو بڑا ڈرپوک ہے..... گھوڑا تو بہت بہادر ہوتا ہے۔“

”ہاں..... خطرہ بھانپ کر وہ دوڑتا بھی بہت تیز ہے۔“ میں نے بھی ہنس کر ہنسی میں اڑاتے ہوئے ازراہ تفسن کہا۔

وہ ہنسنے لگی۔ وہ کافی فریبہ ہونے لگی تھی مگر اس کے فریبہ مائل جسم میں ایک سنسنی آمیز دلکشی تھی۔ مگر میرے لئے اس میں کوئی کشش نہ تھی کیوں کہ میرے صنم خانہ دل میں ایک ہی صورت سجی ہوئی تھی اور وہ تھی سوئی کی..... من موئی سوئی کی..... تاہم میں فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے مطلب کی بات پر آ کر بولا۔

”رانی..... میں صحیح کہہ رہا ہوں..... مجھے واقعی جنوں بھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو تیرا عاشق جن میرا بیرہی ہو جائے۔“

”نہیں..... وہ میرا دوست ہے..... میں تجھے یقین دلاتی ہوں کہ وہ تجھے کچھ نہیں کہے گا۔“ رانی نے مستحکم لہجے میں کہا۔ میں بدستور اپنی اداکاری پر اڑا رہا۔ ”مجھے تو تجھ سے بھی ڈر لگنے لگا ہے..... جنوں بھوتوں سے تیری دوستی ہونے لگی ہے۔“

”تو سمجھتا کیوں نہیں آخر شو کے.....؟“ وہ زچ ہو کر بولی۔ اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ اسے اس قدر زچ کر ڈالوں کہ وہ بے اختیار مجھے وہ سب کچھ بتانے پر مائل بہ رضامند ہو جائے جو میں اس سے چلتی بازی سے اگلوانا چاہتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک کائیاں تھی میری طرف پر تشکیک نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔

”وے شو کیا..... زیادہ بننے کی کوشش نہ کر..... اگر تو جنوں بھوتوں سے اتنا ہی ڈرتا ہے تو پھر جگہ دش جیسے اتنے وڈے جادوگر سے کیوں لڑنا چاہتا ہے..... اور پھر وہ سوئی..... جسے تو اس کے چنگل سے چھڑانے کا ارادہ رکھتا ہے؟“

اب میرے زچ ہونے کی باری تھی۔ اس لئے میں نے بھی جھجکے بغیر بلا توقف و تامل کہا۔

”دیکھ رانی..... سوئی..... محض ایک خواب ہے..... جو مجھے ایک پراسرار کھنڈر میں دکھائی دیتی آرہی ہے..... وہیں میں نے ایک آنکھ والے جانور (جگہ دش) کو بھی دیکھا تھا۔ یہ خواب پچھلے کئی دنوں سے مجھے لگا تار آرہے ہیں۔ بھلا خواب کا حقیقت

تفصیل سنانے پر اکسایا۔

”ہاں..... ہاں..... بتاتی ہوں شروع سے.....“ وہ بولی۔

”شو کے..... میں واقعی تجھ سے بہت محبت کرتی ہوں..... وہ جناتی دورے محض ایک ڈرامہ تھا جو میں جان بوجھ کر اپنے اماں ابا کو تنگ کرنے کیلئے کیا کرتی تھی تاکہ وہ میرا اشارہ سمجھ کر میرا ویاہ (بیاہ) تجھ سے کر ڈالیں کیوں کہ جوان لڑکی کو جب جن چڑھنے لگ جائیں تو اس کا سیدھا سادہ مطلب شادی ہی ہوتا ہے..... مگر میرے اماں ابا تو بے چارے بالکل کورے نکلے۔ ادھر تو بھی بالکل کھور بن گیا تھا اور مجھے گھاس بھی نہیں ڈالتا تھا۔

پھر ایک روز میں رات کو اپنے کمرے میں بری طرح بے چین ہو کر آہیں بھر رہی تھی تو اچانک ایک سایہ میں نے دیکھا..... میں ڈر گئی..... مگر دوسرے ہی لمحے میرے کانوں میں ایک سرگوشی ابھری۔

”کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو جائے تو..... تیرا شوکا..... یعنی تیری محبت تجھے مل جائے گی۔“ میں پہلے ہی تیرے لئے تڑپ رہی تھی اس لئے میں نے خوف زدہ ہونے کے باوجود حامی بھری اور اس سائے سے کہا کہ..... میں اپنی محبت حاصل کرنے کی خاطر آگ میں کود سکتی ہوں تو مجھے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے۔“ میرے حامی بھرتے ہی اس سائے نے سرگوشی میں مجھ سے کہا کہ میں آنکھیں بند کر کے تین بار یہ کہوں۔ ”اے منکوس گہرائیوں کے بے تاج بادشاہ مجھے ”کالی باؤلی“ تک پہنچا دے۔“ پھر میں نے اس طرح لیٹے لیٹے تین بار ایسا ہی کہا۔ ”اے منکوس گہرائیوں کے بے تاج بادشاہ مجھے ”کالی باؤلی“ تک پہنچا دے۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی مجھے گہری نیند نے آیا اور جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک چھوٹے سے گاؤں کی پگڈنڈی پر کھڑے پایا۔ میں چونکہ خود اس وقت تجھے حاصل کرنے کیلئے ”باؤلی“ ہو رہی تھی اس لئے میرے ڈر اور خوف پر تیری محبت کی فرزاگی طاری تھی۔ چنانچہ میرے قدم خود بخود آگے اٹھنے لگے..... میں جیسے کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر تنویٰ انداز میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ راستہ میں مجھے ایک سفید

سے کیا تعلق؟ مگر میں ضرور بے چین تھا اور یہ بے چینی کسی اور جذبے کے تحت نہیں بلکہ یہ ایک میرے لئے پریشان کن بے چینی ہے..... جس کا میں کھوج لگانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں بابا کمال شاہ سے آج ملنے گیا تھا کیوں کہ گاؤں ہی میں کسی سے میں نے سنا تھا کہ بابا کمال شاہ خوابوں کی تعبیر بتاتے ہیں مگر جب میں نے ان سے مل کر اپنا خواب بیان کیا تو انہوں نے ہنسی میں میری بات اڑاتے ہوئے بتایا کہ میرے اس خواب کی کوئی حیثیت نہیں ہے..... پیٹ کی خرابی یا بد ہضمی سے بھی ایسے ڈراؤنے خواب آتے ہیں جن کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔“

میں نے اپنی طرف سے ایک جھوٹ گھڑتے ہوئے بڑی صراحت کے ساتھ رانی کو بتایا تو اس کے چہرے پر ایک سکون بخش طمانیت سی بکھر گئی اور پھر وہ بولی۔ ”میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا کہ..... یہ سب جھوٹ ہے.....“

”نہیں رانی..... بس میرے دل میں ایک پھانس انک گئی ہے..... میں چاہتا ہوں تو سچ سچ مجھے بتا دے اور تو جانتی ہے..... کیوں کہ تجھے بھی جناتی دورے پڑتے رہے ہیں..... دیکھ رانی محض تسلی کی خاطر بتا دے..... تاکہ میرا دل بھی مطمئن ہو جائے۔ اگر یہ سب سچ ہے تو میں چپ کا ہو کر بیٹھ رہوں گا اور تجھ سے شادی بھی کر لوں گا۔“ میں نے اسے لائن پر لانے کی غرض سے اس کی منت کی۔

میں نے دیکھا میری سیر حاصل گفتگو سن کر اس کے چہرے پر ایک لمحے کو پرسوج سی خاموشی چھا گئی۔ میں نے لوہا گرم جان کر آخری چوٹ لگائی اور بڑی محبت سے رانی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے قریب بٹھا کر بڑے رसान سے دوبارہ بولا۔

”رانی..... کیا تو میری خاطر اتنا بھی نہیں بتا سکتی..... دیکھ میں تو اب تجھ سے کتنا پیار کرنے لگا ہوں.....“ یہ کہہ کر میں نے اسے رجھانے کیلئے ہلکی چھیڑ چھاڑ کی تو وہ بالکل پھسل کر رہ گئی پھر لمبا گہرا سانس کھینچ کر بولی۔

”اچھا تو پھر سن.....“

”مگر ٹھہر..... مجھے شروع سے بتا..... پہلے کہ کیا تجھے واقعی جن چڑھتا تھا اور تو اتنے دن بغیر بتائے اچانک کہاں غائب ہو گئی.....؟“ میں نے اسے کھل کر ابتداء سے

گھوڑی پر سوار شخص ملا..... وہ اپنے حلقے سے اس گاؤں کا کوئی چودھری یا نمبردار لگتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو میرا سہارہ روک لیا اور گھوڑی سے اتر کر کڑک دار لہجے میں مجھ سے بولا۔

”او کڑیے..... کدھر جا رہی ہے..... کون ہے تو.....؟“

میں ابھی اسے کوئی جواب دینا چاہتی ہی تھی کہ اچانک میرے ہونٹ خود بخود ہلے اور ایک نہایت غصیلی آواز میرے حلق سے ابھری۔ ”اوائے چوہدری عالم خان..... میرے راستے سے ہٹ جائیں تو فنا ہو جائے گا۔“

اس چوہدری کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے میرے منہ پر تھپڑ رسید کرنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے میرے دونوں ہاتھ خود بخود حرکت میں آئے۔ میں نے دیکھا میرے دونوں بازو لہجے ہوتے چلے گئے..... انہوں نے چوہدری کا گلا دبوچ لیا۔ وہ گھوڑی سے نیچے آن گرا..... میرے ہاتھوں کے مضبوط شکنجے نے اس کا گلا دبوچ لیا اور اس وقت تک اسے نہیں چھوڑا جب تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ٹھار نہ ہو گیا۔

اس کے مرتے ہی میرے دونوں بازو اصلی حالت میں آ گئے اور ایک بار پھر میرے قدم آپی آپ اٹھنے لگے۔ میں چلتی ہوئی ایک کپکپکنیوں کے قریب آ گئی۔ یہ ایک کپی اور سیاہ پتھروں والی منڈیوں کا کنواں تھا۔ اچانک میرے کانوں میں وہی سرگوشی ابھری۔ ”رانی منڈیر پر چڑھ جا..... اندر بیڑھیاں تجھے نظر آئیں گی تو اس کے ذریعے نیچے اتر جانا.....“

میں نے ایسا ہی کیا۔ منڈیر پر چڑھ گئی کنواں بہت گہرا اور تاریک تھا پہلے تو میں نیچے اترنے سے ڈری مگر پھر دل مضبوط کر کے نیچے اترنے لگی۔ کنواں اندر سے کتنا گہرا تھا یہ میں نہیں جانتی تھی۔ میں بس بیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترتی جا رہی تھی۔ بالآخر کافی گہرائی تک اترنے کے بعد بیڑھیاں اچانک ختم ہو گئیں۔ اب میرے چاروں طرف گھٹا ٹوپ تاریکی تھی اور اوپر کنویں کا کھلا منہ بھی چھوٹا نظر آ رہا تھا۔ میں پریشان ہو گئی کہ اب کیا کروں بلا خروہی پر اسرار سرگوشی ایک بار پھر میری ساعتوں میں گونجی۔

”پاگل لڑکی..... بیڑھیوں سے اب نیچے کود جا..... کنویں کی زمین تمہارے

قدموں سے نزدیک ہے۔“

میں نے چھلانگ لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ کنویں کی تہ (زمین) چند فٹ کی گہرائی میں ہوگی مگر دوسرے ہی لمحے میرے حلق سے بھیاںک چیخ نکل گئی۔ میں کنویں کی تنگ و تاریک اور محدود فضا میں نیچے ہی نیچے گرتی چلی جا رہی تھی۔ میرے دہشت کے مارے ہوش اڑ گئے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

رانی اتنا بتا کر لمحے بھر کو رکی۔ میں بڑے اشتیاق اور جوش کے ساتھ اس کی یہ ساری اسرار بھری روئیداد سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے بے چینی سے کہا۔ ”پھر..... پھر کیا ہوا..... آگے بتاناں رانی.....؟“

وہ تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد پھر بولنا شروع ہوئی۔

”مجھے جب ہوش آیا تو خود کو ایک ویران کھنڈر میں پایا۔ میں ایک پتھر پیلے چوہرے پر چپٹ لیٹی ہوئی تھی۔ میرے آس پاس چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ درود دیوار سے کہن سالی ٹپک رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور حیران و پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ایک غراہٹ سنائی دی۔ میں نے ٹھٹھک کر آواز کی سمت دیکھا تو خوف سے میری ہچکھی بندھ ہو گئی۔ وہ ایک ریچھ جیسا جسامت کا کوئی انسان نما جانور تھا مگر بہت ہی بھیاںک صورت کی غیر انسانی مخلوق تھی۔ جس کا سر انسان کا مگر اس کی پیشانی پر ایک آنکھ تھی۔

”ڈرو نہیں..... مجھ سے.....“ وہ جانور نما انسان بولا۔ میں اس آواز کو پہچان گئی تھی یہ وہی سرگوشی تھی۔

میں نے ذرا ہمت باندمی..... وہ آہستہ آہستہ اپنی چاروں ٹانگوں سے چلتا ہوا میرے قریب آیا پھر بولا۔

”تو شوکت حسین..... سے شادی کرنا چاہتی ہے ناں۔“

”ہاں..... ہاں..... وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔“ میں نے دل کی گہرائیوں سے اسے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے..... میں تیرا یہ کام کر دیتا ہوں..... مگر اس سے پہلے تجھے میرا

”رانی..... تو تو بہت دنوں تک گھر سے باہر رہی تھی..... اس کی کیا وجہ ہے؟“  
 ”پتہ نہیں..... میں خود حیران تھی کہ اتنی تھوڑی دیر کیلئے اتنے دن گزر گئے۔“

وہ بولی۔

”میں سمجھ گیا یہ اس کی ”جادوگری“ کا ہی شاخسانہ ہوگا۔ میں سوچنے لگا کہ جگدوش کی اس ”بدگری“ کا تعلق کہیں..... ان منحوس گہرائیوں سے تو نہیں تھا جس کے بارے میں کمالی شاہ بابا نے نشاندہی کی تھی۔ اس کا مطلب تھا مردود جگدوش پاتال میں رہتا تھا..... اور اس طرف جانے کا راستہ وہ ”کالی باؤلی“ تھی جس کے ذریعے رانی منحوس گہرائیوں میں اتر کر اس کی بدگری تک پہنچی تھی۔“ یہ سوچ کر میری آنکھیں کامیابی کے احساس سے چمکنے لگی۔ مجھے کافی دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر وہ بولی۔  
 ”کیا سوچنے لگا شوکے؟“

”آں..... ہاں..... کک..... کچھ نہیں.....“ میں چونک کر بولا۔ تو وہ بڑے رसान سے میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

”شوکے دیکھ اب تو جگدوش کا پیچھا چھوڑ دے گا ناں..... پتہ ہے وہ ہمیں بہت ڈھیروں ساری دولت بھی دے گا۔“ میں نے اپنے غصے کو قابو کیا اور بظاہر خوش ہو کر اس سے بولا۔ ”اچھا..... یہ بات ہے..... پر تو نے پہلے کیوں یہ نہیں بتایا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے مجھے اتنے بڑے جادوگر (جگدوش) سے ٹکر لوں۔“ ”پر وہ ڈھیر ساری دولت دے گا کب؟“

میں نے جان بوجھ کر لپچائے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ بھی خوش ہو کر بولی۔ ”تو سچ کہہ رہا ہے شوکے..... تت..... تو پھر مجھ سے شش..... شادی کرے گا نا اب.....؟“  
 ”ہاں..... ہاں کیوں نہیں پہلے تو بہت سی دولت تو لے کر آ..... تاکہ ہم شہر جا کر اپنا بڑا سا گھر بنا کر رہیں۔“

میں نے کہا۔ رانی خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ میں نے اسے واپس اس کے کمرے میں بھیج دیا اور خود چار پائی پر لیٹ گیا۔

اگلے دن میں اعلیٰ الصبح اٹھا تو کوئی باہر سے دروازے کو بری طرح بجارہا تھا۔

ایک کام کرنا ہوگا۔“

”وہ کیا.....؟“

”تیرا شوکا..... میری جان کا دشمن بن گیا ہے..... اور میں نے اپنے کالے علم سے پتہ چلایا ہے کہ مجھے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی..... سوائے تیرے شوکے..... کیوں کہ اسے ایک بہت بڑے اللہ والے بزرگ کی دعا حاصل ہے۔“ میں اس کی بات پر ڈر سی گئی۔ کیوں کہ میں سمجھی وہ شاید خدا خواستہ..... مجھے تیرے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ جیسے میرا خیال بھانپ کر بولا۔ ”تو فکر نہ کر میں تیرے شوکے کو کچھ نہیں کہوں گا..... تو بھی اسے کہہ دے کہ مجھ سے ٹکر لینے کی کوشش نہ کرے..... میں اس کے صلے میں تمہیں اتنی ساری دولت دوں گا کہ تم دونوں آپس میں بڑی دھوم دھام سے شادی کر سکتے ہو اور ساری زندگی خوش و خرم گزارو گئے۔“ میں اس کی بات سن کر خوش ہو گئی مگر پھر مایوسی سے بولی۔

”مگر..... شوکا تو مجھے بالکل گھاس نہیں ڈالتا..... مجھ سے شادی نہیں کرے

گا..... میری بات کب مانے گا بھلا۔“

وہ بولا۔ ”میں تجھے ایک سنوف دوں گا..... تو اسے بارہ راتوں تک دودھ میں تھوڑا تھوڑا گھول کر پلاتی رہنا وہ پھر ہر وقت تیرے نام کی مالا جھپے گا۔“ میں خوش ہو گئی مگر وہ دوسرے لمحے بولا۔

”مگر وہ ایک سوئی نامی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوگا..... کیوں کہ..... اس اللہ والے بزرگ نے خواب میں اسے میری ”یہ نگری“ کا نظارہ دکھایا ہے..... اس لئے تجھے بڑی ہوشیاری سے یہ کام کرنا ہوگا۔“

میں نے اس سے سنوف لیا اور حامی بھری۔ اس نے مجھے آنکھ بند کرنے کو کہا پھر جب دوبارہ آنکھ کھلی تو..... میں اپنے گاؤں کی گھنڈی پر کھڑی تھی۔

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ میں اس کی داستان سن کر دم بخود رہ گیا۔ مجھے اب خیال آیا کہ میں نے گزشتہ رات جو دودھ پیا تھا اسے پی کر میرا دل کیوں رانی کی طرف راغب ہوا تھا تاہم میں حیرت سے بولا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ تایا بھی جاگ چکے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو باہر پولیس کھڑی تھی۔ میں بھی جب تک صحن میں پہنچ چکا تھا اور گاؤں کے متعلقہ تھانے کا حوالدار چوہدری کریم داد کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کے چار پانچ اہلکار بھی موجود تھے۔ آس پاس کے کچھ لوگ بھی وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔

”اوائے باباجی ذرا اپنی ہلا کو خان دہی رانی کو باہر نکال۔“ حوالدار کریم داد نے جتے ہوئے لہجے میں تایا سے کہا۔ پھر ان کے عقب سے مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے مجھے بھی جھٹکے دار لہجے میں بلایا۔ ”اوائے ماٹھے تو بھی ذرا باہر آناں.....“

میں حیران پریشان باہر نکلا تو پولیس والوں نے مجھے فوراً جھکڑیاں پہنا دیں۔ مارے ذلت اور پریشانی کے تایا جان بالکل گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ ان سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اتنے میں رانی بھی چادر سنبھالے باہر نکل آئی اور دھواں دھار لہجے میں حوالدار کریم داد سے بولی۔ ”کیوں دے میرے شوکے کو گرفتار کیا ہے تم لوگوں نے۔“

”اوائے..... ماٹھی! ذرا ہولے..... یہ تیر تفنگ میں تیرے تھانے لے جا کر ہی نکالوں گا نا۔“ حوالدار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر اپنے قریب کھڑے پولیس والوں کو رانی سے بھی جھکڑیاں لگانے کو کہا۔ پولیس والے فوراً حرکت میں آئے۔ رانی کو جھکڑی لگی تو اندر سے تائی بھی سینہ کو بی کرتی ہوئی باہر آگئی مگر پولیس ہمیں جیب میں بیٹھا کر سیدھا تھانے لے آئی۔ وہاں ایک اور بھی بڑی سی جیب (لینڈ کروزر) کھڑی تھی اور دو اونچے شیلے والے لمبے ترنگے کیم شیم آدی کھڑے تھے۔ انہوں نے کاشن کی کلف دار شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اور ان کی بغل میں ہولسٹر بھی جھول رہے تھے۔ چار پانچ مزید آدی بھی وہاں بندوقیں تھامے ان کے آس پاس موجود تھے۔ ان دونوں آدمیوں کے چہرے غصے کے مارے لال بھسوکا ہو رہے تھے۔ جیب رکی اور ہمیں جب نیچے اتارا گیا تو وہ دونوں اونچلے شیلے والے خزانٹ آدی ہماری طرف بڑے۔ پھر مجھے اور رانی کی طرف خوں خوار نظروں سے گھورتے ہوئے حوالدار چوہدری کریم داد سے بولے۔

”حوالدار صاحب ان دونوں کو ہمارے حوالے کر دو..... ہم جانیں ہمارا کام جانے۔“

”اونٹیں چھوٹے چوہدریو..... ان دونوں سے تو میں ہی نمٹوں گا اچھی طرح۔“

”ذرا ان سے یہ بھی پوچھو تو ان کو چوہدری حشمت نے کتنا روپیہ دیا تھا جس کے لالچ میں ان دونوں حرامیوں نے..... ہمارے سوہنے بابا کا اس بیدردی سے قتل کرنے کی جرأت کی۔“ دوسرا اونچے شیلے والا شخص ابلتی آنکھوں کے ساتھ ہی گھور کر حوالدار سے بولا۔ میں اور رانی ہکا بکا کھڑے ان کا منہ نکلے جا رہے تھے۔

”دیکھ تو ذرا کیسے بی بے بنے دیکھ رہے ہیں جیسے انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں۔“

”چلو آؤ سب اندر..... ابھی تفتیش ہو جاتی ہے۔“ حوالدار نے کہا پھر ہم سب لوگ اندر ایک بڑے کمرے میں آ گئے۔ یہاں سامنے ایک بڑی سی میز اور اس کے گرد دو کرسیاں دھری تھیں..... حوالدار کریم داد نے بڑے احترام سے ان دونوں چوہدری ٹائپ آدمیوں کو بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں نے دیکھا اب رانی بھی خاصی گھبرائی ہوئی اور پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ اس کی ساری ”نسوانی“ اکڑفوں ہوا ہو گئی تھی۔ میں اور رانی آہنی زیور پہنے مجرموں کی طرح حیران پریشان کھڑے کبھی حوالدار چوہدری کریم داد کا چہرہ دیکھتے تو کبھی دونوں کرسیوں پر براجمان ان دونوں اونچے شیلے والے چوہدریوں کو نکلنے لگتے۔ جواب اپنی کرسیوں کا رخ ہماری جانب پھیرے خونخوار نظروں سے ہماری طرف کھا جانے والے انداز سے گھورے جا رہے تھے۔ ان دونوں کے چار راتقل بردار حواری بھی ان کے پاس ہی مستعد اور مودبانہ کھڑے تھے۔ میں نے ذرا ہمت کر کے حوالدار سے پوچھا۔

”حوالدار صاحب آخر ہم دونوں کو آپ نے کس جرم میں.....“

”اوائے جرم کے بچے..... منہ بند رکھ اپنا.....“ اچانک ایک چوہدری غصے سے دھاڑ کر بولا۔ پھر اپنے قریب کھڑے ان چاروں میں سے ایک کو کڑک دار لہجے میں مخاطب کر کے بولا۔

”اوائے..... جمالے جا ذرا..... بابا فقیر دینے کو بلا کے لا..... وہ..... باہر کیا اپنی بے بے کے یار کے ساتھ کھڑا ہے۔“

”نڑ پھتتی نال.....“ جمالا نامی وہ حواری ”جی چھوٹے آیا نوں۔“ کہتا ہوا

جتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ حوالدار خاموش بیٹھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے تھانے میں اس کی بجائے ان دونوں چوہدریوں کا حکم چلتا ہو۔ ذرا ہی دیر گزری تھی وہی جمال نامی شخص جس کا نام یقیناً جمال ہی تھا ایک منحنی سے عمر رسیدہ شخص کو دبوچے لے آیا جیسے..... اس نے بھی کوئی جرم کیا ہو۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دوسرے چوہدری نے اسے دشمنانہ نظروں سے گھور کر کڑکتی آواز میں کہا۔

”اوائے فقیر دینے اوکڑی یہی تھی جس نامرادی نے ہمارے باباجی کا خون کیا تھا۔“

میں اور رانی اس کی بات پر دھل گئے۔ فقیر دین نے رانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوش سے لرزیدہ آواز میں بولا۔

”آہو جی! یہی وہ کڑی تھی..... جس نے وڈے چوہدری جی کا خون میری آنکھوں کے سامنے.....“ یہ کہہ کر وہ رو پڑا۔ اوائے حوالدار جی کو آگے بتا..... آگے.....“ پہلا والا چوہدری اسے ڈپتے ہوئے بولا تو فقیر دین نے اپنے مگرچھ قسم کے بہتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے سرکیاں بھر کر کہا۔

”میں اس وقت وہاں سے گزر رہا تھا..... میں نے دیکھا..... یہ حرام زادی..... (رانی) وڈے چوہدری جی کا گلا دبوچ رہی تھی..... میں وڈے چوہدری کو بچانے کیلئے دوڑا تو اچانک مجھے ٹھڈا لگا اور میں گر پڑا۔ میرا سر ایک نوکیلے پتھر پر جا لگا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے دوبارہ ہوش آیا تو..... تو..... وڈے چوہدری جی..... دنیا سے گزر چکے تھے۔“

”سن لیا حوالدار صاحب..... اب آپ کارروائی آگے بڑھائیں.....“ پہلے والے چھوٹے چوہدری نے حوالدار کریم داد کی طرف دیکھ کر کہا تو حوالدار کریم داد اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیاہ رول کو اپنے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور رانی کو خشکیں نظروں سے گھورتا اس کے قریب آ کر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”رانی! سن لیا تو نے..... اب بتا تو نے وڈے چوہدری عالم خان کا خون

کیوں کیا..... تیری ان سے کیا دشمنی تھی.....؟“ حوالدار کریم داد کے منہ سے یہ انکشاف سننے ہی میری حالت جو ہوئی سو ہوئی مگر رانی تو بے چاری زار و زار رو پڑی..... مجھے اب موجودہ حالات کی کشمکش کا اندازہ ہونے لگا تھا کہ..... رانی کے ہاتھوں جگدوش نے جس گھوڑی سوار شخص کا گلا دبوچ کر اسے ہلاک کر ڈالا تھا وہ دراصل چوہدری عالم خان تھا اور یہ دونوں اونچے شملے والے چھوٹے چوہدری مقتول کے بیٹے ہوں گے۔“

”اب گھٹھی کیوں لگ گئی تیری زبان کو..... بتاتی کیوں نہیں تو نے چوہدری صاحب جیسے بے گناہ آدمی کا خون کیوں کیا؟“

”حوالدار صاحب..... یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟ میں تو چوہدری عالم خان کو جانتی بھی نہیں ہوں۔“

رانی نے بلاخر پھنسی پھنسی آواز میں داد فریاد کی تو اچانک دونوں چھوٹے چوہدری اپنی کرسیوں سے یکدم اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر حوالدار کی موجودگی کی پرواہ کے بغیر اپنے حواریوں سے کڑک دار لہجے میں نخوت سے بولے۔

”اوائے..... چلو..... اس لڑکی کو ذرا لے چلو ڈیرے پر..... یہ حوالدار صاحب کے بس کی بات نہیں ہے۔“

وہ چاروں چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے تو حوالدار کریم داد کو اپنی سکی کا احساس ہوا اور تب پہلی بار اس نے پیشہ ورانہ بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے..... اپنے ہاتھ میں پکڑے رول کو سیدھا کر کے..... ان چاروں حواریوں کا راستہ روک لیا پھر خشک لہجے میں ان دونوں چوہدریوں کو مخاطب کر کے بولا۔

”آپ دونوں قانون کی راہ میں آنے کی کوشش نہ کریں..... یہ پولیس کا کام ہے..... اس لیے بہتر ہو گا کہ اسے میں ہی پایہ تکمیل تک پہنچاؤں.....“ اس کی بات پر دونوں چوہدریوں نے ایک لمحے کیلئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ان میں سے ایک حوالدار کریم داد کو خشم آلود نظروں سے گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

”حوالدار صاحب معاملہ صاف ہے..... یہ کڑی ہمارے سب سے بڑے دشمن چوہدری حشمت علی خان کے اشارے پر ہے..... یہ ہمارا ذاتی جھگڑا ہے..... اسے

آپ ہمارے حوالے کر دو یہی زیادہ بہتر رہے گا۔“

اس کے چڑھے ہوئے تیور دیکھ کر حوالدار کریم داد کو متحمل لہجہ اختیار کرنا پڑا اور اسے سمجھاتے ہوئے اس کے نام سے مخاطب کر کے بولا۔ ”چوہدری نیاز صاحب پہلے ہمیں تو ضابطے کی کارروائی کر لینے دو..... ہم خود اس سے سب کچھ اگلوالیں گے اور بعد میں آپ کے دشمنوں پر بھی ہاتھ ڈال دیں گے۔“

چوہدری کے دونوں بیٹوں نے پہلے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا پھر ان میں سے ایک نے حوالدار کو گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے..... پھر..... تم پہلے اپنی کارروائی نمٹاؤ ہم آتے رہیں گے۔“

پھر وہ ہم دونوں کو معاندانہ نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے حواریوں سمیت چلے گئے..... ذرا ہی دیر بعد..... ان میں سے ایک چوہدری دوبارہ لوٹ آیا۔ اسے شاید کوئی بات یاد آگئی تھی۔ حوالدار سے وہ ذرا تاکید لہجے میں بولا۔ ”ایک بات کا خیال رہے حوالدار جی ان کا کوئی ضمانتی آئے تو چپکے سے ہمیں اطلاع کر دینا..... کہو تو..... اپنا کوئی بندہ ادھر چھوڑ جائیں۔“

”آپ بے فکر ہو جاؤ..... ان کی ضمانت کسی صورت نہیں ہوگی۔“ حوالدار کریم داد نے معتدل لہجے میں اسے تسلی دی۔ تو وہ چلا گیا۔ صورتحال بہت خطرناک حد تک گمبیر ہو گئی تھی۔ چوہدری عالم خان کا قتل کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اوپر سے اس کے دونوں کزیل بیٹے بھی ان کی جان کو آگئے تھے۔ اس پر مستزاد ایک چشم دید گواہ بھی فقیر دین کے نام سے پیدا ہو گیا تھا۔ جو یقیناً جھوٹا تھا۔ اگرچہ اس میں ذرا شک نہ تھا کہ رانی کے ہاتھوں واقعی چوہدری عالم خان کا خون ہوا تھا مگر یہ سو فیصد اس رذیل شیطان کے چیلے..... جلدوش کی حرکت تھی۔ جس نے نجانے کس طرح رانی کے وجود میں سما کر چوہدری عالم خان کا قتل کیا تھا۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اگر ساری بات حوالدار کریم داد کو ہم سنا بھی ڈالتے تو کیا وہ ہماری بات پر یقین کرتا؟

”اوئے دیکھ لیا تم نے.....“ معا حوالدار کریم داد نے تہدید لہجے میں گھور کر

کہا۔

”قانون سے اگر بچ بھی جاؤ تو چوہدری عالم خان مرحوم کے یہ دونوں کزیل

بیٹے نیاز خان اور پرویز خان تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اب تمہاری بہتری اس میں ہے کہ مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم نے چوہدری عالم خان کا قتل کیوں اور کس کے کہنے پر کیا..... اس طرح..... تمہاری کچھ نہ کچھ جان چھڑانے کی میں پوری کوشش کروں گا۔“

حوالدار نے پیشہ ورانہ مکاری سے کہا تو میں احتجاجاً اس سے بولا۔

”حوالدار صاحب! قتل تو رانی نے کیا ہے پھر مجھے آپ نے کیوں گرفتار کیا

ہے؟“

”اوئے تجھے اعانت جرم میں گرفتار کیا ہے..... تو اب چپ ہو کے کھڑا

رہ..... مجھے پہلے رانی سے پوچھنے دے۔“

وہ مجھے ڈپٹ کر رانی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ہاں کڑیے بتا پھر.....“ اس نے اپنا

سوال دہرایا تو بالآخر میں نے ہی دوبارہ مداخلت کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”حوالدار جی یہ بے چاری کیا بتائے گی..... اگر تم حقیقت سننا چاہتے ہو

تو..... میں آپ کو بتاتا ہوں۔“

حوالدار کریم داد نے میری مداخلت پر پہلے تو مجھے خشناک نظروں سے گھورا

پھر بہ جبر و اکراہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”چل پھر تو بتا۔“

میں نے پھر مختصراً اسے بتایا کہ ایک جلدوش نامی آسیب رانی پر عاشق

ہے..... جب چوہدری عالم خان نے رانی کا راستہ روکا تھا تو اس نے رانی کے روپ

میں غصے میں آکر اس کا قتل کر ڈالا۔ میری بات پر حوالدار کریم داد کو طیش آ گیا۔ اس

نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور غصے سے بھنا کر بولا۔

”اوئے تو نے کیا ہمیں اتنا ہی بے وقوف سمجھ رکھا ہے..... جو ہم تیری اس فلمی

کہانی پر یقین کر لیں گے۔“

میں اپنے گال کو سہلاتے ہوئے بے چارگی سے بولا۔ ”مگر حوالدار صاحب

آپ خود سوچو ذرا بھلا یہ کمزور لڑکی اتنے بڑے چوہدری کا گلا کس طرح دبوچ سکتی

ہے..... اور..... یہ بات تو سارا گرائیں (گاؤں) جانتا ہے کہ رانی پر واقعی کسی آسیب کا

لپکا۔ ”کالی باؤلی“ ”چوہدری عالم خاں.....“ اس کا مطلب تھا کہ وہ کالی باؤلی جس کے ذریعے جگدوش کی ”بدگمری“ پہنچا جاسکتا تھا وہ مقتول چوہدری عالم خاں کے گاؤں میں ہی تھی۔ ایک لمحے کو تو میرادل خوشی سے جھوم اٹھا مگر پھر خود کو جیل میں دیکھ کر مایوس ہو گیا۔ تب میں نے حسرت سے سوچا کاش میں آزاد ہوتا تو اس ”کالی باؤلی“ میں ضرور اتر کر جگدوش تک پہنچ سکتا تھا۔

”کیا سوچ رہا ہے شوکے.....“ رانی نے میری طویل اور پرسوج خاموشی پر بے چینی سے پوچھا۔ وہ غریب یہ سمجھ رہی تھی کہ..... میں شاید حوالات سے نکلنے کی کسی تدبیر پر غور کر رہا ہوں۔

”تو چکی رہ مجھے کچھ سوچنے دے۔“ میں نے اسے ٹوکا۔ اتنے میں میرے تایا بھی گاؤں کے کچھ معزز لوگوں کو لے کر آ گئے۔ مگر حوالدار کریم داد پر بھی شاید مقتول چوہدری خاں کے دونوں بیٹوں نیاز خاں اور پرویز کا زیادہ دباؤ تھا اس لئے اس نے ان سے جان چھڑانے کی غرض سے عدالت سے رجوع کرنے یا شہر میں کوئی اچھا وکیل کرنے کا مشورہ دیا۔

تایا جان ہم سے بھی حوالات میں ملے تھے۔ انہوں نے ہم دونوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ شہر جا کر کسی اچھے وکیل سے ملیں گے..... اس کے علاوہ ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا معاملہ اس حد تک بڑھ جائے گا..... شہر کی جیل منتقل ہونے اور وکیل کی فیس کی مد میں اخراجات یہ سارا کچھ اکیلے تایا کس طرح کریں گے..... بے چارے..... کاش میں ہی باہر ہوتا تو رانی کیلئے کچھ نہ کچھ دوڑ دھوپ کرتا..... مگر..... میں خود بھی اس کے ساتھ پابند سلاسل تھا۔

جیسے جیسے وقت بیتا جا رہا تھا میری پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے آج تک حوالات میں رات نہیں گزاری تھی اور ابھی پتہ نہیں کتنی راتیں گزارنی پڑیں۔ رانی کی تو حالت ہی دگر تھی۔ میں اس کے ساتھ تھا جو اسے حوصلہ ملا ہوا تھا ورنہ تو وہ ادھ موٹی ہو چکی ہوتی۔ تایا جان کا یہی ارادہ تھا کہ حوالدار ہمیں شہر کی جیل منتقل کر دے تو..... زیادہ بہتر تھا۔

سایہ ہے۔“ میری مدلل گفتگو پر اگرچہ حوالدار کریم داد کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن وہ اپنی روایتی ہٹ دھرمی سے بھی مجبور تھا لہذا اس نے مجھے ڈپٹ کر چپ رہنے کو کہا اور رانی کو درشت لہجے میں مخاطب کر کے بولا۔

”تو نے سنا نہیں..... کڑیئے مجھے بتا..... اصل حقیقت کیا ہے..... ورنہ میں تم دونوں کو چوہدری عالم خاں کے دونوں بیٹوں کے حوالے کر دوں گا..... پھر وہ خود ہی اپنے ”طریقے“ سے تم سے اگلو الیس گے۔“

اس بار رانی نے بھی اپنی دم بخود مہر سکوت کو توڑا اور داد فریاد کرنے کے انداز میں اس سے بولی۔

”حوالدار جی! شوکا (شوکت حسین) بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے..... مجھ پر ایک جن کا سایہ ہے۔“

”ہوں.....“ حوالدار کریم داد نے ایک سرسراتی ہوئی ہنکاری بھری۔

”تو تم دونوں اس طرح منہ نہیں کھولو گے..... ذرا دو چار دن حوالات کی ہوا کھاؤ..... خود ہی ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔“

یہ کہہ کر اس نے ہمیں لاک اپ کرنے کا حکم دیا۔ میں اور رانی چیخنے چلاتے رہے مگر اس سنگ دل انسان کے سر پر جوں تک نہ رنگی اور ہمیں دو پولیس والوں نے پکڑ کر فوراً ایک سیلن زدہ سے قید خانے میں ڈال دیا۔

”اب کیا ہوگا شوکے.....؟ یہ تو بڑی مصیبت گلے کو پڑ گئی۔“ رانی نے روتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں پہلے ہی اس پر ادھار کھائے بیٹھا تھا چڑ کر بولا۔ ”تیرا ہی قصور ہے..... نا تو اس جگدوش کی بات مانتی نا یہ مصیبت گلے پڑتی..... تیرے ساتھ میں بھی مفت میں مارا گیا۔“ وہ میرا بازو تھام کر روہانے لہجے میں بولی۔

”دیکھ شوکے اس میں میرا کیا قصور ہے..... تو کچھ کرتا کیوں نہیں۔“

”میں کیا کروں..... میں خود تیرے ساتھ قید ہوں..... چوہدری عالم خاں کا قتل کوئی معمول بات تو نہیں..... اب لگتا ہے پھانسی ہمارا مقدر ہی ہوگی۔“ میں نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح



جب تایا مجھ سے ملاقات کرنے آئے تھے تو ان کے ساتھ پیش امام صاحب کا جوان بیٹا طفیل احمد بھی تھا۔ وہ ایک سلجھا ہوا پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ تقریباً میرا ہم عمر ہی تھا۔ اور شہر میں تعلیم حاصل کرتا تھا اور وہیں اپنی رشتے کی خالہ کے گھر میں رہتا تھا۔ ہفتے ہفتے گاؤں میں آتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ حوالدار کریم داد کو اس نے ہی درخواست دیتے ہوئے کہا تھا کہ..... وہ ہمارا کیس شہر کی جیل یا عدالت منتقل کرے..... جہاں صحیح معنوں میں تفتیش ہو سکتی تھی۔ اس کی بات مجھے بھی دل کو لگی تھی۔ بلا آخر حوالا ت کی وہ پہلی منحوس رات بھی سر پہ آ گئی۔ میں پریشان حال سا حوالا ت کے اکڑے ہوئے سیلن زدہ فرش پر بوسیدہ دیوار کے ساتھ پیرنکا کر بیٹھ گیا۔ رانی بھی نڈھال سی میرے قریب ہی دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ ہر سوں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مختصر سا برآمد ویران تھا ہلکی سی یرقان زدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

دوستری جو تھوڑی دیر پہلے سلاخ دار دروازے کے باہر پہرہ دے رہے تھے وہ بھی اٹکھٹے ہوئے کہیں کھسک گئے تھے۔ تایا بھی سردی سے بچنے کیلئے مونے گرم کھس دے گئے تھے۔ وہی میں نے اور رانی نے اوڑھ رکھے تھے۔

اچانک میری نظر غیر ارادی طور پر ویران اور مدھم روشنی میں ڈوبے ہوئے برآمدے پر پڑی تو مجھے وہاں فرش پر ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید کوئی سنتری پہرے دار اپنی تسلی کی خاطر ہمیں قید زنداں دیکھنے کیلئے آ رہا تھا..... مگر..... دوسرے ہی لمحے میری مارے دہشت کے آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ایک بالوں بھرا بچہ نما جھجھکسا جانور تھا۔ وہی منحوس جگہ ویش ایک بار پھر میرے سامنے تھا۔ اس کا مکروہ انسان نما ایک آنکھ والا چہرہ..... وہ بڑے آرام سے چلتا ہوا..... سلاخ دار دروازے کے قریب پہنچ کر رکا اور اپنی اکلوتی اور خونخوار آنکھ سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے اب اپنی خوف زدہ کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ رانی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ غیر ارادی طور پر اسے بھی میری طرح خوف محسوس ہوا تھا لیکن پھر وہ فوراً سلاخوں والے دروازے کے پاس آ گئی۔ اور امید بھرے لہجے میں اس سے بولی۔

”جگہ ویش..... لک..... کیا ہو گا..... مجھے جیل ہو گئی..... اب تو ہی ہمیں

یہاں سے چھڑا سکتا ہے.....“

”کیوں..... ہوش ٹھکانے آگئے ایک ہی رات میں.....“ جگہ ویش طنزیہ لہجے میں بولا۔

”م..... م..... یہ تو کیا کہہ رہا ہے.....؟“ رانی نے حیرت سے کہا۔

”مم..... مم..... نے تو تیرا کام کر ڈالا تھا..... اب تو..... اب تو..... شوکت نے بھی میری بات مان لی ہے..... اور مجھ سے شادی.....“

”بکو اس بند کر اپنی..... تو وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں دھاڑا۔

”تو نے میرے ساتھ چھل (دھوکہ) کیا ہے..... تو نے شوکت کو ساری حقیقت بتا ڈالی..... ٹھوہر..... میں پوچھتا ہوں۔“

اس نے کہا اور پھر میری طرف اپنی اکلوتی آنکھ سے گھور کر بولا۔ ”کیوں شوکت میاں..... کیا تو رانی سے شادی پر آمادہ ہے اور اب پھر کیا میرے راستے میں نہیں آئے گا؟“ میں جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہوئے بغیر اس کی باتوں پر اندر ہی اندر کھل رہا تھا نفرت بھرے لہجے میں اسے گھور کر بولا۔ ”ہرگز نہیں..... میں..... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا مردود شیطان کے چیلے۔“

”سن لیا تو نے رانی اس نے تیرے ساتھ بڑی مکاری سے ساری بات اگلو لی اور تو نے نادانی میں اسے میری ”بدنگری“ تک پہنچنے والے ”کالی باؤلی“ کا راستہ بھی بتا دیا۔ اب بھگت تو یہ سزا..... میں چلا۔“

جگہ ویش نے کہا اور جانے لگا تو رانی نے اسے روکا اور منت سماجت والے انداز میں بولی۔

”نہیں..... نہیں..... ہمیں معاف کر دو..... شوکا اس وقت غصے میں ہے..... تو ہماری پہلے یہاں سے جان چھڑا دے میں شوکے کو سمجھا لوں گی.....“ اس کی بات سن کر جگہ ویش مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”کیوں شوکے میاں..... کیا کہتا ہے..... پھر..... میں چاہوں تو چٹکی میں تم حوالا ت سے باہر ہو جاؤ گے۔ تم نے میری طاقت تو دیکھ لی ناں..... میں جب بھی

چاہوں تجھے بڑی سے بڑی مصیبت میں ڈال سکتا ہوں..... بول..... چھوڑے گا میرا پیچھا؟“ میں اس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر نفرت انگیز لہجے میں ہونٹ چبا کر بولا۔ ”اوہ مصیبت شیطان کے چیلے..... اس مصیبت تو مجھے میرا اللہ بچا ہی لے گا مگر اس کے بعد تو جس بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے اس سے تو تجھے تیرا باپ شیطان بھی نہیں بچا سکے گا..... اب یہاں سے دفع ہو جا.....“

”ہوں..... رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے.....“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”تو ٹھیک ہے پھر..... تم دونوں کو اب پھانسی چڑھنے سے کوئی نہیں بچا سکے گا..... مرد یہیں دونوں.....“ وہ غصیلے لہجے میں بولا اور پھر دھوئیں میں تحلیل ہو گیا۔ ”یہ..... یہ تو نے کیا کر دیا شو کے..... اسے ناراض کر دیا تو نے..... تو..... تو..... کہتا تھا کہ.....“

”تو چپ رہ رانی..... یہ سارا تیری ہی وجہ سے ہوا ہے.....“ میں نے رانی کی بات کاٹ کر برہمی سے کہا۔ ”ورنہ اس جگہ دش جیسے شیطان کو میں نے خوب مزہ چکھانا تھا.....“ رانی نے میری بات پر منہ سو جھالیا۔ ”تو نے مجھے دھوکا دیا..... شو کے..... کیا..... کیا..... وہ سب فریب تھا جو تو نے مجھ سے کیا تھا اب تک.....“

”وہ فریب نہیں تھا..... مگر جگہ دش تک پہنچنے کیلئے یہ سب ضروری تھا.....“ میں نے کہا پھر قدرے نرمی سے اسے سمجھانے کی غرض سے بولا۔ ”دیکھ رانی! میری ایک بات سن..... تو پاگل مت بن..... دیکھ لیا تو نے جگہ دش کے ہاتھوں اپنے اس پاگل پنے کی وجہ سے کتنی بڑی مصیبت میں تو پھنس گئی اور مجھے بھی پھنسا دیا۔“

”نہیں..... جگہ دش تیرا فریب جان گیا تھا اس نے اس لئے تیرے ساتھ مجھے بھی سزا دے ڈالی۔“ رانی نے غصے سے کہا۔ وہ الٹا مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہی تھی۔ میں اس کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے دوبارہ ملائمت آمیزی سے بولا۔

”رانی..... جگہ دش ایک شیطان ہے..... مجھے ہر قیمت پر اسے ختم کرنا

ہے..... اس پاک دھرتی کو ایک گندے وجود سے پاک کرنا ہے..... یہ اللہ کا بھی حکم ہے.....“ وہ میری طرف طنزیہ نظروں سے دیکھ کر بڑی نخوت کے ساتھ بولی۔ ”تو جگہ دش کو ختم کرنا چاہتا ہے یا..... اس کڑی سونی کو حاصل کرنا چاہتا ہے جسے تو شراہوں میں دیکھا کرتا تھا۔“

میں ہکا بکا اس کا چہرہ نکتے لگا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ رانی جگہ دش سے گٹھ جوڑ کر چکی تھی اور اس نے ہی اسے ساری تفصیل بتا ڈالی تھی۔ مگر میں بھی چور بننے کی بجائے صاف صاف لہجے میں بولا۔ ”ہاں..... یہ بھی صحیح ہے کہ ایک شیطان کے چنگل سے ایک بے گناہ اور معصوم دکھیااری لڑکی کو چھڑانا چاہتا ہوں۔“

”تا کہ بعد میں تو اس سے شادی کر سکے..... کیوں یہی بات ہے ناں.....“ رانی کا لہجہ لمحہ بہ لمحہ زہریلا ہونے لگا تھا۔ ”ہاں..... میں سونی سے شادی کرنا چاہتا ہوں.....“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ مجھے اب اس کی پروا نہ تھی جو میں اس سے اگلوانا چاہتا تھا وہ میں اگلو چکا تھا..... مگر میں رانی کو راہ راست پر لانا چاہتا تھا۔ میری بات پر وہ انگارہ آنکھوں سے میری طرف گھورتے ہوئے بولی۔ ”تو..... تو..... پھر مجھے تو نے کیوں پیار کا فریب دیا..... بولا۔“ اس کی تیوریوں پر اچانک بل پڑنے لگے۔ چہرہ غصے اور تذلیل کے احساس سے سرخ ہونے لگا۔

”یہ سب میں نے جگہ دش تک پہنچنے کیلئے ایسا کیا تھا..... کیوں کہ مجھے جیسے ہی پتہ چلا کہ تو بھی اس حرامی شیطان کی چیلی بننے لگی ہے تو..... تجھے راہ راست پر لانے کیلئے یہ سب ضروری تھا۔“ میں نے گہری متانت اور صاف گوئی سے کہا۔ ”میں..... میں..... تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی..... دعا باز..... فریبی.....“

رانی کا پارہ جیسے لبریز ہو گیا۔ وہ زخمی شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹی۔ میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بڑے آرام سے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے مروڑ مروڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ ہانپنے لگی اور روتی بھی جا رہی تھی۔ اس کی اکڑفوں جاتی رہی تھی۔ پھر اچانک نجانے اسے کیا ہوا..... وہ..... اکھڑے ہوئے سینٹ والے سیلن زدہ فرش پر آدھے کنول کا

آسن بنائے بیٹھ گئی..... پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس نے آنکھیں موندے بہ آواز بلند کہا۔  
 ”اے منخوس گہرائیوں کے بے تاج بادشاہ..... مجھ سے غلطی ہو گئی..... مجھے معاف کر دے..... کیا تو اسے میری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر مجھے معاف نہیں کر سکتا..... میں وعدہ کرتی ہوں..... کہ..... آج سے تیرا دشمن..... شوکت حسین میرا بھی دشمن ہے..... اور میں اسے تجھ تک کبھی بھی پہنچنے نہیں دوں گی.....“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں پہلے تو اس کے خطرناک اور ناپاک عزائم جان کر ششدر رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی طرف دیکھ کر نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑے..... تب پھر اچانک میں نے دیکھا..... دیوار پر ایک سایہ ابھرنے لگا..... مکروہ سایہ ایک سر کا تھا جس کے منخوس اور ڈراؤنے چہرے کے نقوش واضح ہونے لگے تھے..... وہ ایک آنکھ والے جگدوش کا چہرہ تھا جس کے بدہیت ہونٹوں پہ مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس نے رانی کو پکارا رانی نے یکدم آنکھیں کھول دیں پھر دیوار پر جگدوش کے مکروہ چہرے کو دیکھتے ہی خوشی سے نہال ہو گئی اور بے قابو ہو کر بولی۔ ”جگدوش..... جگدوش..... کیا..... کیا تو نے مجھے معاف کر دیا.....؟“

”ہاں..... ہم نے..... منخوس گہرائیوں کے بے تاج بادشاہ نے تمہیں معاف کر دیا..... مگر اب تم اپنے وعدے پر قائم رہنا۔“  
 جگدوش نے اسے اپنا وعدہ یاد دلایا تو رانی میری طرف ایک نفرت بھری نگاہ ڈال کر اس سے دانت پیستے ہوئے بولی۔

”ہاں اے منخوس گہرائیوں کے بادشاہ جگدوش..... مجھے اب اس شخص سے نفرت ہو گئی ہے..... یہ صحیح ہے کہ پہلے میں اس کے عشق میں دیوانی ہو رہی تھی مگر اب اسے بھی پتہ چل جائے گا کہ..... جو عورت کسی کو ٹوٹ کر چاہتی ہے تو وہ دل ٹوٹنے پر اس سے زیادہ نفرت بھی کرنا جانتی ہے..... مگر جگدوش میں ایک کمزور لڑکی بھی تو ہوں..... اور..... اور..... یہاں قید ہوں..... میں تیرے لئے کیا کر سکتی ہوں؟“

”تو فکر مت کر..... میں ہوں ناں..... تیرے پر مقدمہ چلے گا تو صاف صاف سارا الزام شوکت کے سر پر تھوپ دیتا..... آگے میرا کام ہے.....“

میں دم بخود سایہ منظر..... ان دونوں رذیلوں کی آپس میں گفتگو سن رہا تھا۔ وہ مردود رانی کو بہکا رہا تھا اور رانی مجھ سے انتقام لینے کی خاطر بہک رہی تھی۔ یہ میرے لیے خطرناک صورتحال ثابت ہو سکتی تھی۔ رانی اب جگدوش کی چیلی بن کر میری راہ میں رکاوٹیں ڈالنے پر رضا بہ آمادہ ہو گئی تھی۔ جگدوش کی مکروہ صورت غائب ہو چکی تھی۔ رانی اب مجھے معاندانہ نظروں سے گھورے جا رہی تھی۔

اگلے دن صبح ہی رانی نے شور ڈال دیا کہ اسے اس وقت حوالدار صاحب کے سامنے پیش کیا جائے۔ وہ اسے بیان دینا چاہتی ہے۔ تھانے والے یہی سمجھ رہے تھے کہ ایک ہی رات حوالات میں گزارنے سے رانی کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے اور اب وہ ”سچ“ بولنے پر راضی ہو گئی تھی۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ”سچ“ کیا تھا؟

ناچار مجھے بھی رانی کے ساتھ ہی حوالدار کریم داد کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ اپنی میز کے پیچھے بکھی اونچی پشت گاہ والی کرسی پر بڑے ”کر“ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ حسب معمول کالا سیاہ رول اس کے ہاتھوں میں تھا..... جسے وہ بڑے ڈرامائی انداز میں بار بار اپنے دوسرے ہاتھ کی تھیلی پر مارے جا رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں میز پر دھری تھیں اور اس کا رخ ہماری جانب تھا۔ مجھے اس کی اس بے ہودگی پر غصہ تو بہت آیا تھا مگر میں اندر ہی اندر تمللانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

”بول رانی..... اب تو کیا کہنا چاہتی ہے.....؟“ اس نے باری باری ہم دونوں کے چہروں کی طرف دیکھ کر سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا تو..... رانی بولی۔  
 ”حوالدار صاحب میں بالکل بے قصور ہوں..... میں نے اس شوکے کے کہنے پر چودھری عالم خان کا خون کیا تھا۔“

رانی کے یہ الفاظ ہم کی طرح میرے سر پر پھٹے تھے۔  
 ”یہ ہوئی نا بات..... اس کا مطلب ہے..... میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔“  
 حوالدار کریم داد فاتحانہ انداز میں گویا کلکاری مارتے ہوئے بولا۔

جھوٹا بیان دہرا دیا۔

”مجھے تو پہلے ہی شک ہے کہ یہ دونوں ہمارے دشمن چودھری حشمت علی خان سے رلے ملے ہوئے ہیں۔“ چودھری نیاز ہماری طرف غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”اب آپ ان دونوں کے خلاف پرچہ کٹوا کر سب سے پہلے چودھری حشمت علی خان کی گرفتاری کے احکامات جاری کریں۔“

”آپ لوگ پہلے میری بات تو سن لیں چودھری صاحب!“ اس بار میں نے نیاز محمد پرویز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”رانی جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ نہ تو چودھری حشمت علی خان سے ملی ہوئی ہے اور نہ ہی اس نے آپ کے بزرگوار والد صاحب کا خون کیا ہے۔ رانی دراصل ایک شیطان کے کہنے پر یہ سب کچھ کر رہی ہے جس کا نام جگدوش ہے اور جگدوش نے ہی رانی کے بہروپ میں یہ خون کیا ہے۔“ میری بات پر وہ دونوں ہتھے سے اکھڑ گئے غصے سے دانت نکوستے ہوئے مجھے مارنے کو لپکے مگر حوالدار کریم دادا چانک میرے اور ان کے درمیان میں آ گیا۔

”نہیں..... نہیں..... چودھریو! اس طرح تو یہ اس کا قانونی پوائنٹ بن جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔ اب یہ لوگ پھانسی کے پھندے سے نہیں بچ سکتے۔“

”حوالدار صاحب! ان دونوں کو تو ایک طرف رکھو..... اصلی مجرم تو چودھری حشمت علی خان ہے۔ اسے پھانسی چڑھنا چاہیے۔“ چودھری پرویز ناک بھوں چڑھا کر حوالدار سے بولا۔ میں نے دیکھا حوالدار کریم دادا خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ چودھری حشمت علی خان کے خلاف کوئی کارروائی کرتے ہوئے کتراتا تھا لیکن چونکہ رانی نے کھلم کھلا جھوٹا بیان دیا تھا اس لئے وہ خاصی مشکل میں پھنس گیا تھا۔

”اب آپ کیا سوچ رہے ہو حوالدار جی! وقت کیوں ضائع کر رہے ہو..... چلو چودھری حشمت کو گرفتار کریں۔“

”یہ..... یہ..... یہ جھوٹ بول رہی ہے..... صاحب..... م..... میں بھلا اتنے وڈے چودھری عالم خان کا کیوں خون کروں گا۔“ میں رانی کی طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے حوالدار سے بولا۔

”کتنے پیسے لیے تھے تو نے چودھری حشمت علی خان سے.....“ حوالدار کریم دادا میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ میرے وجود میں چیونٹیاں دوڑنے لگیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور برماتی ہوئی نظروں سے میری طرف گھورتے ہوئے چند قدم بڑھا۔

”حوالدار صاحب! میری بات کا یقین کریں یہ کینی جھوٹ بول رہی ہے..... میں تو..... میں تو..... چودھری حشمت علی کو جانتا بھی نہیں ہوں.....“ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

”یہ..... یہ کینی..... اس شیطان جگدوش کے کہنے پر ایسا کہہ رہی ہے.....“

”اوائے..... یہ جگدوش کیا بلا ہے.....؟“ حوالدار نے استہزائیہ لہجے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ میری بات کو تہمتے میں اڑاتے ہوئے بولا۔ ”اوائے تو نے جنوں بھوتوں کی کہانی سنانی شروع کر دی اب دوبارہ یہ فرضی کہانی سنانی تو تیری انج (جان) نکال دوں گا۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک مقتول چودھری عالم خان کے دونوں بیٹے..... چودھری نیاز خان اور چودھری پرویز خان بھی آن دھمکے..... ان کے ہمراہ ایک میری عمر کا بھی نوجوان تھا اس کی عمر بائیس تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ باقی نیاز خان پینتیس اور پرویز خان تیس سالہ بیٹے میں تھے۔ ان کے ساتھ تین چار اسلحہ بردار حواری بھی تھے۔

”کیوں جی حوالدار صاحب انہوں نے زبان کھولی کہ نہیں۔“ چودھری نیاز خان نے اندر کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

”آہو جی..... کاکی (رانی) نے تو زبان کھول ہی دی ہے..... میں نا کہتا تھا کہ ایک رات حوالات میں گزراں گے تو آپ ہی ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔“

حوالدار کرم دادا نے فخر سے اپنا سینہ پھلاتے ہوئے ان سے کہا اور ان کے سامنے رانی کا

چھوٹے چودھری نیاز خان نے حوالدار کو گویا اپنے کرکراتے لہجے سے ٹھوکا دیا تو وہ گہری پرتفکری سسکاری بھرتے ہوئے بولا۔

”دیکھو! صرف کلی رانی کے اس بیان سے ہم یہ کارروائی نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے ساتھ..... اس کے ساتھ شوکا بھی ہے جو صحت جرم سے سرے سے انکاری ہے۔ بات تو تب تھی جب شوکا بھی ایسا بیان دیتا بلکہ یہ تو یہاں تک بھی کہہ رہا ہے کہ رانی کا یہ بیان جھوٹا ہے۔“

”حوالدار! پتہ نہیں کون سی ہمیں پٹیاں پڑھا رہے ہو؟ رانی اقبال جرم کر چکی ہے اب کیا مسئلہ ہے؟“ چھوٹے چودھری نیاز نے سخت لہجے میں اس سے کہا تو حوالدار اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”دیکھو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں چاہتا ہوں۔ چودھری حشمت علی خان کے خلاف مضبوط کیس بنے تاکہ نہ اس کی ضمانت ہو سکے نہ رہائی۔ اگر یہ بد بخت شوکا بھی راہ راست پر آ جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔“

اس بار حوالدار کریم داد کی صراحت انگیز گفتگو نے ان دونوں چھوٹے چودھریوں کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ کھڑے تیسرے اور میری ہم عمر کے نوجوان نے بھی حوالدار کی بات کی تائید کرتے ہوئے انہیں سمجھایا تھا۔ یہ مجھے ذرا سمجھدار اور سلجھا ہوا شخص دکھائی دے رہا تھا اور اب تک بالکل خاموشی سے ساری ہونے والی دھواں دھار گفتگو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ نوجوان مجھے انہی دونوں چھوٹے چودھریوں کا کوئی قریبی رشتہ دار ہی لگتا تھا۔ بہر طور..... تب پھر چھوٹے چودھری پر دیز نے میری جانب پیش قدمی کی اور سنجیدہ لہجے میں مکاری سے بولا۔

”اوائے میری بات غور سے سن۔ ہماری دشمنی بیچ کے آدمیوں سے نہیں ہوتی کیونکہ وہ ہماری سطح کے نہیں ہوتے۔ تم نے چودھری حشمت علی خان کے کہنے پر اگر یہ قتل کیا ہے تو بیچ اپنا بیان لکھا دے۔ ہماری دشمنی تو صرف چودھری حشمت علی خان سے ہے۔ تو ایک بار عدالت میں یہ بیان دے بس پھر تو آزاد اور چودھری حشمت علی خان

اندر۔“

میں اس کی چالاکی کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر قتل تو میں نے سرے سے کیا ہی نہیں تھا۔ میری حالت واقعی رونے جیسی ہو گئی۔ بد بخت رانی نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ مارے بے بسی سے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے روہانے لہجے میں رانی سے کہا۔

”رانی! یہ تو مجھ سے اچھا عشق کر رہی تھی۔ اپنے چاہنے والے کو یوں پھنساتے ہیں؟“

مگر رانی بدستور سنگ دل بنی کھڑی رہی۔ وہ مجھ سے محبت کرتے کرتے یکدم نفرت کرنے لگی تھی اور اس کی نفرت کی اہم وجہ رقابت تھی۔ عورت کوئی بھی ہزار رقابت کی آگ میں ہی اپنا سب کچھ جلا بیٹھی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی۔

دونوں چودھری غصے سے کھڑے میری طرف شعلہ باز نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ادھر ہی میری ٹکا بوٹی کر ڈالتے۔ البتہ وہ بھلا مانس نوجوان میری طرف سوچتی ہوئی نظروں سے نکلے جا رہا تھا۔ وہ چند قدم میری طرف بڑھا اور میرا نام پوچھا۔

”شوکت حسین نام ہے جی میرا۔ شوکا کہتے ہیں سب مجھے۔“ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

”کس کے بیٹے ہو؟“

”وہ جی..... چودھری اکبر خان کا۔“

”کیا کرتے ہیں وہ؟“

”ان کی گاؤں میں کھاد اور بار دانے کی دکان ہے۔“

”چودھری حشمت خان کو جانتے ہو؟“

”اوجی رب دی سوں..... میں نے تو یہ نام بھی ادھر ہی تھانے آ کر سنا ہے۔“

مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ چودھری عالم خان کون تھے کس گاؤں کے تھے۔ میں نے اتنا کہہ کر ذرا امید بھرے لہجے میں اس بھلے مانس نوجوان سے کہا۔

”آپ جی..... میرے بارے میں پورے گاؤں سے یہ سب پوچھ سکتے ہو کہ

”تم دونوں اس لڑکے کو ذرا ڈرائنگ روم میں لے جاؤ اور رانی کو لاک اپ میں ڈال دو۔“ ان دونوں سپاہیوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور پھر مجھے لے کر وہ دونوں برآمدے سے ہوتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہ کمرہ مستطیل تھا مگر اس کی حالت کسی تعذیب خانے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی چھت نسبتاً بلند تھی۔ فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ دیواروں کے پلستر کی بھی یہی حالت تھی۔ کمرے میں صرف ایک روشن دان تھا جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں چھت سے ایک سی جھول رہی تھی۔ ایک طرف کونے میں تختاری رکھی ہوئی تھی جس کے اندر کوئی گاڑا مواد نظر آ رہا تھا شاید تیل تھا۔ ایک سانپ جیسے چوڑے پھن والا سیاہ رنگ کا ہنتر بھی بیٹھا ہوا رکھا تھا۔ باقی کمرہ ہر شے سے عاری تھا۔ وہ دونوں سپاہی مجھے وسط میں کھڑا کر کے واپس چلے گئے۔ میں اندر بند تھا۔ میرا دل بری طرح گھبرانے لگا اور اندر میرے دھکڑ پکڑی ہونے لگی۔ مجھے فوری اس جاں گسل حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے اب ہولناک اذیتوں سے گزارا جانے والا تھا۔ ذرا دیر گزری تھی کہ دروازہ ہلا سب سے پہلے حوالدار کریم داد میری طرف خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں ایک کچم شخم شخص کو دیکھ کر میں سر تا پا لرز اٹھا۔ اس کی رنگت اٹلے توے جیسی سیاہ تھی۔ جسم پر صرف بنیان اور نیچے لنگی باندھی ہوئی تھی۔ سر بالکل مہنجھا تھا۔ صورت سے ہی وہ قصائی نظر آ رہا تھا اور اندر داخل ہوتے ہی وہ مجھے یوں گھورنے لگا جیسے قصائی ذبح کیے جانے والے بکرے کو تاڑتا ہے۔ وہ سپاہی بھی ایک کرسی اٹھائے اندر داخل ہو گئے۔ کرسی انہوں نے ایک طرف رکھوا دی جس پر اب حوالدار کریم داد براجمان ہو چکا تھا باقی تین افراد جیسے حکم کے خطر باادب کھڑے رہ گئے۔ میں پریشان تھا اور بوکھلائی ہوئی نظروں سے باری باری ان سب کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مہنجا اور سیاہ رو شخص یقیناً کا سو جلا د ہی تھا۔

”اوئے! میری بات سن ذرا غور سے۔“ اچانک تعذیب خانے کے سیلن زدہ ماحول میں حوالدار کی کڑکراتی آواز ابھری۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر قریب کھڑے کا سو جلا د کی طرف اشارہ کر کے

میں کیسا لڑکا ہوں۔“

وہ نوجوان چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”تمہارا کہنا ہے کہ رانی پر جن کا سایہ تھا۔“

”ہاں جی..... یہ بات تو پورے گاؤں کو بھی معلوم ہے۔ رانی پر آئے دن جن کے دورے پڑتے رہتے تھے۔“ میں یکدم آس بھرے لہجے میں بولا۔

”..... اور ایک سادھو بھی رانی کا جن نکالنے آیا تھا وہ بھی اس جن کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ بات تو خود حوالدار صاحب کو بھی معلوم ہے۔“ وہ بھلا مانس نوجوان حوالدار کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کیا یہ صحیح کہہ رہا ہے حوالدار صاحب؟“

”اوجی! یہ سب ڈرامہ بازی ہے اس کی..... آپ ذرا ایک دو دن اور اسے یہاں رہنے دو۔ میں اس کی اچھی طرح چھستروں کروں گا تو یہ بھی اس کڑی (رانی) کی طرح راہ راست پر آ جائے گا۔“ اتنے میں چودھری نیاز صاحب نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا۔

”بشیر احمد! تم ہٹ جاؤ۔ حوالدار صاحب کو اپنی کارروائی کر لینے دو۔“

وہ نوجوان اپنے چہرے پر الجھن آمیز سوچ پر شکن تاثرات لئے خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”حوالدار کریم داد! تمہیں ہم ایک دن کی اور مہلت دیتے ہیں اس کا منہ کھلوا لو تو بہتر ہے۔ پھر ہم اپنا قانون آزمائیں گے۔ چلو بھراؤں..... آؤ چلتے ہیں۔“ چودھری نیاز نے کہا اور (ماسوائے بشیر احمد کے) سب مجھے غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی حوالدار کریم داد نے وہاں موجود تین سپاہیوں میں سے ایک کو کڑک دار لہجے میں مخاطب کر کے کہا۔

”اوئے حامد! جا ذرا کا سو جلا د کو لے کر آ۔“ میں اس کے حکم پر لرز اٹھا۔ نجانے یہ کیوں کسی کا سو جلا د نامی شخص کو بلا رہا تھا؟ حامد نامی سپاہی کے جانے کے بعد حوالدار نے دو دوسرے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

مجھ سے دوبارہ بولا۔

”اس کا نام کا سو جلا د ہے۔ یہ پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ اپنا قصائیوں جیسا محبوب مشغلہ تم پر آزمائے۔ اس لئے میں تمہیں آخری بار موقع دے رہا ہوں کہ دردناک عذاب جھیلنے سے پہلے یہ بیان دے دو کہ تمہیں چودھری حشمت علی خان نے ہی چودھری عالم خان کا قتل کرنے پر اکسایا تھا۔ اس طرح تمہیں بھی کم سے کم سزا ہوگی ورنہ پھینسی بھی لگے گی اور پھانسی کی سزا سے بھی تم نہیں بچ سکو گے۔ کیا کہتے ہو.....؟“ وہ مجھے اپنی طرف سے دھمکا کر میرے چہرے پر نظریں جمائے گھورنے لگا۔

”مگر..... حوالدار جی! م..... جھوٹا بیان بھلا کیسے دے سکتا ہوں..... میں نے تو یہ قتل کیا ہی نہیں..... وہ تو رانی کے ہاتھوں ہوا ہے۔“ میں روہانے لہجے میں اس سے بولا۔

”ہوں.....!“ حوالدار کریم داد نے ایک سنسنی خیز ہنکاری بھری۔ پھر کرسی سے اٹھ کر کا سو جلا د سے بولا۔

”اوئے کا سو! مجھے آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ بولنا ہوا نظر آئے۔“  
”اوجی تسی فکر ہی نہ کرو۔“ کا سو جلا د تیل جیسی آواز کے ساتھ مجھے گھورتا ہوا

حوالدار سے بولا۔

”آدھا گھنٹہ تو بہت ہے۔ یہ تھڑولا تو دس منٹ کے اندر ہی اندر آپ کا پہاڑا پڑھنا شروع کر دے گا۔“ اس کے بعد حوالدار اپنے سپاہیوں سمیت کمرے سے نکل گیا۔ کرسی بھی اٹھالی گئی۔ کا سو جلا د نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا پھر کسی وحشی سائنڈ کی طرح بڑھا۔ پھر قصائی کی طرح مجھے دبوچ لیا پھر چھت سے جھولتی ہوئی رسی کی مدد سے میرے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو سر سے بلند کر کے مضبوطی سے باندھ دیا۔ اب میرے دونوں ہاتھ فضا میں بلند تھے۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس کم بخت نے میری قمیض کے بٹن کھول کر اونچی کر کے میرے چہرے پر گول مول کر کے لپیٹ دی۔ پھر ذرا دیر بعد اس نے وہ بھی اوپر کر دی تو میں یہ دیکھ کر لرز گیا۔ وہ چمڑے کا سیاہ ہنتر تیل میں

بھگوئے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے میرے قریب آ رہا تھا پھر میرے عقب میں کھڑے ہو کر اس نے کوڑے کی طرح اسے گھمایا اور میری نگلی پیٹھ پر رسید کر دیا۔

”پٹاخ۔“ کی آواز ابھری اور میرے حلق سے ابھرنے والی لرزہ خیز چیخ سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔ اس ظالم کوڑے کی ایک ہی ضرب سے مجھے یوں لگا جیسے میری پیٹھ کی کھال اتر گئی ہو۔ اذیت کی ایک سنسناتی ہوئی لہر نے جیسے میرے پورے وجود کو گھائل کر دیا۔ پھر تو جیسے مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک کے بعد ایک ہنتر میری نگلی پیٹھ پر پڑنے لگے۔ میری لرزہ خیز چیخیں بھی اس تواتر سے جاری تھیں۔ کا سو جلا د کو جیسے کسی وحشی سائنڈ کی طرف مجھ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب تو وہ میرے چاروں طرف گردش کرتے کرتے جہاں جی چاہ رہا تھا اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔ میں تکلیف اور اذیت سے بالکل چور ہو گیا۔ اب تو مجھ میں چیخنے چلانے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ ٹانگیں بھی رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑنے لگیں اور میں رسی کے سہارے نڈھال سا ہو کر جھول گیا۔ تب کہیں جا کر کا سو جلا د کا ہاتھ رکا۔ وہ بد بخت خود بھی بری طرح ہانپ رہا تھا۔ ادھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

”اب بول کیا کہتا ہے..... مگر یاد رکھنا اس بار اگر میں نے تجھے کا سو جلا دے

”بس کرو..... اب تم جو کہو گے میں وہی کہوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے چہرہ جھکا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ کاسو جلا د میرے ہاتھوں کو چھت سے جھلوتی رسی سے آزاد کر دے گا مگر دوسرے ہی لمحے میری سماعتوں میں ایک شناسا آواز ابھری۔



حوالے کیا تو وہ تیری کھال اتارے بغیر نہیں رکے گا۔“ حوالدار نے تہدید ی لہجے میں کہا اور میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہنا شروع کیا۔

”ہاں..... ہاں..... میں نے..... سچ..... چودھری حشمت علی خان کے کہنے پر ہی..... چودھری عالم خان کا قتل رانی کے ہاتھوں کروایا تھا۔“

”یہ ہوئی ناں بات۔“ حوالدار خوشی سے قلقاری مارتے ہوئے بولا اور پھر ایک پہلے سے تحریر شدہ کاغذ میرے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ ”چل شاباس پتر! اس پر اپنے دستخط کر دے۔ چل جلدی کر۔“ اس نے مجھے ایک قلم تھما چاہا مگر میں بولا۔

”مجھے تو اپنا نام بھی لکھنا نہیں آتا۔ انگوٹھا لگا دیتا ہوں میں۔“ میرے ذہن میں اچانک یہ خیال آیا تھا حالانکہ میں تو دسویں پاس تھا۔ حوالدار کو پہلے تو حیرانی ہوئی پھر جیسے جان چھڑانے کی خاطر اس نے یہی کیا اور ایک سیاہی والے اسٹپ پیڈ پر میرا انگوٹھا رگڑا اور پھر اس نے پہلے سے تحریر شدہ خود ساختہ بیان میں نکا دیا۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہاں رانی بھی موجود تھی جسے سپاہی اندر دھکیل کر واپس لوٹ گئے تھے۔ میں اکھڑے ہوئے پلستر والے فرش پر چت لیٹ گیا تھا۔ رانی ایک طرف کھڑی دیوار سے پشت نکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر اسے جانے کیا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب سرک آئی اور نرم لہجے میں مجھ سے بولی۔

”دیکھ شوکے! میری بات مان لے۔ مت کر خود پر اتنا ظلم تو اگر جگدوش کی بات مان لیتا ہے تو تیری اس مصیبت سے جان ہمیشہ کیلئے چھوٹ جائے گی۔“ میں نے نفرت سے اسے پرے دھکیل دیا مگر بولا کچھ نہیں۔ وہ یکدم زخمی ناگن کی طرح غصے سے پھنکار کر بولی۔ ”ٹھیک ہے پھر۔ میں بھی تجھے سوئی تک نہیں پہنچنے دوں گی۔ چاہے مجھے اس کیلئے جگدوش کے ساتھ ساز باز ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔“ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں اس کے عزائم سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ اتنے میں میرا تایا اور پیش امام صاحب کا وہی لڑکا طفیل احمد ملاقات کرنے آیا۔ میری حالت زار دیکھ کر دونوں ہی پریشان ہو گئے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے ذہن میں زکریا کا خیال آیا اور پھر میں نے انہیں ساری بات بتادی کہ مجھ پر تشدد کر کے جھوٹے

بیان والے ایک خود ساختہ کاغذ پر میرا انگوٹھا لگا لیا گیا تھا۔ میں نے طفیل سے کہا۔ ”بھائی! تو میری ایک مدد کر دے۔ کسی طرح چودھری حشمت علی خان سے یہ

ساری بات کہہ ڈال۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔“ طفیل علی چند ٹائیے سوچنے کے بعد بولا۔ ”ٹھیک ہے میں چودھری حشمت علی خان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ پاس ہی کے ”نئے پنڈ“ میں رہتا ہے وہ۔ میں ابھی اسے اس سازش سے آگاہ کرتا ہوں۔“ وہ دونوں چلے گئے۔

یہ اس شام کا ذکر تھا۔ تھانے میں اچانک جیسے لوگوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ لوگ حوالدار کے خلاف نعرے بلند کر رہے تھے اور مجھے خوشگوار سی حیرت ہو رہی تھی۔ پھر چند پولیس والوں کو میں نے ادھر ادھر بوکھلائے ہوئے دوڑتے دیکھا۔ پھر اس کے بعد دو سپاہی دوڑتے ہوئے میری بیرک میں آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ تھانے کے برآمدے اور احاطے تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ وہ سب مشتعل نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے لڑکے اور بعض کے پاس تو رائفلیں اور بندوقیں بھی تھیں۔ چند لوگوں کو چھوڑ کر یہ سب کسی اور ہی گاؤں کے لگتے تھے۔ بہر طور مجھے حوالدار کریم داد کے کمرے میں پیش کیا گیا تو وہاں ایک لمبا تڑنگا اور ٹھسے دار شخص کھڑا نظر آیا۔ اس نے سر پر بڑا سا مکلف طرے دار پکڑ پہنا ہوا تھا۔ سردی کی مناسبت سے اس نے بے داغ نرم شلوار قمیض کے اوپر قمیض قسم کی سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی جس کے بٹن سنہری لگے ہوئے تھے۔ پاؤں میں طلے دار دیسی کھسہ تھا۔ اس نے گولڈن رنگ والی اسٹیک بھی پکڑ رکھی تھی حالانکہ وہ ساٹھا ہاتھا تھا۔ مونچھیں بھی گھنی اور بچھو کے ڈنک کی طرح دونوں نوکیں انھی ہوئی تھیں۔ ہولستر بھی اس کی بغل سے جھول رہا تھا۔ دو تین مسلح حواری بھی اس کے قریب کھڑے تھے۔ تایا اکبر خان اور پیش امام صاحب کا ہونہار بیٹا طفیل احمد بھی قریب کھڑے تھے۔ البتہ حوالدار کریم داد پریشان نظر آ رہا تھا۔

”اوئے پتر! تیرا نام شوکا ہے؟“

”آہو جی..... چودھری صاحب!“ میں نے اس کے اپنائیت بھرے لہجے میں مسکسی صورت بنا کر بولا۔

”اوائے تجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے..... صاف صاف بتا..... یہاں تیرے ساتھ کیا ہوا تھا۔“

میں نے ساری حقیقت بلا کم و کاست سنا دی جسے سن کر حوالدار کریم داد مجھے خشمگین نظروں سے گھورنے لگا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ساٹھا ہاتھ اٹھے دار شخص چودھری حشمت علی خان ہی تھا۔

”حوالدار! اب کیا کہتا ہے۔ اب تو مجھے بتا کہ تو نے مرحوم چودھری عالم خان کے بیٹوں سے میری گرفتاری کیلئے کتنے روپے لئے ہیں؟“ چودھری حشمت علی خان نے نخوت سے حوالدار کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”او جی، چودھری صاحب! ذرا ٹھنڈے پڑو۔ اس نے تو آپ کے خلاف بیان ہی دے دیا ہے..... یہ دیکھو۔“

حوالدار کریم داد نے وہی خود ساختہ بیان اس کے آگے کر دیا اس میں میرا انگوٹھا لگا ہوا تھا مگر چودھری حشمت نے انتہائی نخوت سے حوالدار کے ہاتھ میں پکڑا ہوا وہ کاغذ پرے جھٹک دیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔

”میں ایسے کئی بیان مارا ماری کروا کر لکھوا سکتا ہوں۔ تیرے سامنے یہ شوکا کہہ رہا ہے کہ یہ بیان جھوٹا ہے اسے کا سوجلا دے پنوانے کے بعد زبردستی اس پر اس کا انگوٹھا لگوا یا گیا ہے جبکہ چودھری عالم خان کا قتل رانی نے کیا ہے۔“

”یہ بات تو اب عدالت میں ہی ثابت ہوگی چودھری حشمت علی صاحب!“ حوالدار کا جانے کس طرح روایتی اکھڑ پن بیدار ہو گئی مگر چودھری حشمت علی خان بھی کب نکلا بیٹھنے والا تھا۔ بری طرح اسے گھور کر بولا۔

”مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کر حوالدار! تو نے عدالت سے ریماڈ لئے بغیر اس پر غیر قانونی انسانیت سوز تشدد کیا ہے۔ ہم نے اپنے وکیل کو شہر سے بلایا ہے۔ وہ ایڈیشنل سیشن جج کی ایک تحقیقاتی ٹیم لے کر یہاں پہنچنے والا ہے۔ اب تو اپنی بیٹی (نوکری) کی فکر کر حوالدار کریم داد۔“ چودھری حشمت علی خان کے لہجے میں حقارت اتر آئی۔ میں نے دیکھا کہ حوالدار کریم داد کے چہرے کا رنگ یکا یک پھیکا پڑ گیا۔ پھر فوراً

ہی اس مکار انسان نے اپنی کینچلی بدلی اور چودھری حشمت خان سے بولا۔

”چودھری صاحب! آ..... آپ..... غصہ نہ کرو..... آپ ہماری مجبوری تو سمجھتے ہی ہوتا..... ہم پر کتنے لوگوں کا دباؤ ہوتا ہے۔“

”اوائے! اس مجبوری کا کیا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تم کسی بیگانہ کو پھانسی پر چڑھا دو۔ ہیں!!!“ چودھری حشمت علی خان نے ابلتی کھولتی آنکھوں سے اسے گھور کر کہا۔

”کدھر ہیں وہ دونوں نیاز اور پرویز۔ ان کو ادھر لاؤ۔ میں خود ان سے بات کرتا ہوں کہ انہیں مجھ سے ایسی بزدلانہ حرکت کی امید کیسے ہوئی۔ یہ ٹھیک ہے بعض زمینوں کے معاملے میں میرا ان کے پو (باپ) کے ساتھ تنازع چل رہا تھا مگر اس کی جان لینے کا تو ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔“

”بس چودھری صاحب! اب گل ادھر مکا دو۔ میں شوکے کو چھوڑ دیتا ہوں مگر رانی کو نہیں چھوڑوں گا۔“ حوالدار کریم داد بالآخر سپر ڈالتے ہوئے بولا۔

اس کے بعد مجھے چھوڑ دیا گیا مگر تایا اکبر خان اپنی بیٹی رانی کی وجہ سے خاصے پریشان ہو گئے تھے مگر چودھری حشمت علی خان نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا وہ رانی کا کیس شہر کی عدالت منتقل کریں گے اور پھر وہاں ان کا وکیل رانی کا کیس لڑے گا۔ ان کی بات پر تایا کو ذرا تسلی ہوئی۔

میں اللہ تعالیٰ کا دل ہی دل میں شکر بجالاتے ہوئے گھر پہنچا تو تائی میرے دوالے ہو گئی۔ لگی مجھے کوسنے پینے۔

”ہائے..... رانی کے تایا! شوکا تو ہمارے لئے بڑا ہی منحوس ثابت ہوا۔ میری پھول سی بچی کو پھنسا دیا اور خود بڑے آرام سے چھوٹ کر آ گیا۔ میں کہتی ہوں اس نمک حرام کو اسی وقت گھر سے نکال دو۔“

تایا کیا کہتا۔ وہ خاموش رہا مگر اس دن کے بعد سے میرا اس گھر میں رہنا دو بھر ہو گیا۔ تائی روز مجھ سے لڑنے جھگڑنے لگتی۔ مجھے روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ پھر تائے کے خاموش رویے نے بھی مجھے سمجھا دیا کہ اب میرا اس گھر میں رہنا ناممکن تھا۔ پھر ایک روز میں اپنا مختصر بوریا بستر سمیٹ کر رخصت ہونے لگا۔ تائے نے مجھے

تے دب گئی۔“

اس بار میں بھی یہ غور کرنے لگا کہ آخر پھر وہ کون تھی جسے مراد نے قبر میں اتارا تھا۔ میں نے بہت زور دیا ذہن پر مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔ اب تو بس میرے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح اس کالی باؤلی میں داخل ہوا جائے۔ چنانچہ اگلے روز میں صبح سویرے اٹھا اور مقتول چودھری عالم خان کے گاؤں کا پتہ میں یہاں ہی ادھر ادھر سے جان چکا تھا چنانچہ میں اللہ کا نام لے کر نکل کھڑا ہوا۔ مقتول چودھری عالم خان کا گاؤں یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ میں نے چالاکی کے ساتھ رانی سے ”کالی باؤلی“ تک جانے والا راستہ اگھو لیا تھا اس لئے میں بہ آسانی اپنے مطلوبہ راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اور بابا کمال شاہ کے دیئے ہوئے دو تعویذ میرے پاس محفوظ تھے۔ مقتول چودھری عالم خان کے گاؤں کی حدود شروع ہو چکی تھی۔

”کالی باؤلی“ اس گاؤں کی شمالی طرف آخری حدود پر تھی۔ میرے اطراف میں کماد کے کھیتوں کا سلسلہ تھا اور میں اس کے درمیان بنے بل کھاتے پگڈنڈی نما راستے پر چلا جا رہا تھا۔

اچانک میں چلتے چلتے ٹھنک کر رک گیا کیونکہ معا ہی مجھے چار پانچ مسلح افراد نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان میں ایک لمبے ترنگے شخص کو دیکھ کر میں پریشان سا ہو گیا۔ یہ مقتول چودھری عالم خان کا بڑا بیٹا چودھری نیاز تھا۔ وہ میری طرف خشناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

”اوئے نا ہنجا! تو نے ہمارے گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت کیسے کی۔ کیا اب اپنے باپ چودھری شمس علی خان کے کہنے پر یہاں کوئی نیا گل کھلانے آیا ہے۔“ اس نے زہر خند لہجے میں مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

مجھے اس کا انداز گفتگو ناگوار تو گزرا مگر میں مصلحتاً اسے ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے معلوم نہ تھا، غلطی ہو گئی۔ میں دوسرے راستے سے چلا جاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں پلٹنے لگا تو چودھری نیاز کی کڑک دار آواز گونجی۔ ”ٹھہر جاوے!“

روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھی تائی کے درغلانے میں آگئے تھے اور مجھے ہی رانی کے جیل جانے کا ذمہ دار سمجھ رہے تھے۔ میں سیدھا پیش امام صاحب کی اجازت سے مسجد آ گیا۔ پیش امام مولوی تمیز الدین صاحب نے مجھے اپنے حجرے میں ہی ایک کونارہ بنے کو دے دیا تھا۔

رانی کا کس شہر کی عدالت میں چل رہا تھا۔ پھر ایک روز میں نے سنا کہ رانی جیل سے چھوٹ کر گھر آ گئی۔ اسی روز تایا مجھے لینے آ گیا۔

”چل پتر! میں تینوں لین آیا واں۔“ انہوں نے پیار سے کہا۔ میں نے احترام سے کہا۔

”نہیں تایا! مجھے دیکھ کر تائی کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

”تو ہمارا بیٹا بن جائے گا تو پھر رانی کی ماں بھی تجھے کچھ نہیں کہے گی۔“

”مگر میں رانی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

میں نے دیکھا کہ تائے کے چہرے کا رنگ یکفخت بدل گیا۔ پھر وہ بڑی رکھائی سے یہ کہہ کر چل دیئے۔ ”پھر تو ادھر ہی ٹھیک ہے۔“ میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں اب مسجد میں رہنے لگا تھا مگر چند دنوں بعد ہی پیش امام صاحب نے بھی مجھے اشارہ کنایہ میں یہاں سے بھی جانے کا کہہ ڈالا تھا۔ ان کی بھی مجبوری جائز تھی ظاہر ہے میں یہاں چند دن تو گزار سکتا تھا مگر مستقل نہیں۔ ایک روز سوئی کا بد نصیب باپ

مراد آ گیا۔ اسے میرے بارے میں سب معلوم تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کا غم اب تک تازہ تھا۔ مجھے اس نے سوئی کا ہی کمرہ رہنے کو دیا تھا جہاں اس کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ میں نے اسے پر جوش انداز میں پوری تسلی دی تھی کہ میں نے جگہ و ش کی بدگمری پہنچنے کے راستے کا کھوج لگا لیا ہے اور میں ایک نہ ایک دن سوئی کو لے کر آؤں گا۔

”پتر.....! میں تیری بات کیسے مانوں؟“ وہ مایوسی سے بولا۔

”سوئی کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا ہے۔ وہ تو بیچاری منوں مٹی

دن چودھری حشمت علی خان کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ آخر کو آپ کے بھی کھوجی ہوں گے۔ ان کو تو معلوم ہو گا ہی کبھی انہوں نے مجھے چودھری حشمت علی خان کے ساتھ یا اس کے ڈیرے پر دیکھا ہے؟“ میں نے مدلل لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ میری بات پر اس کے چہرے کا رنگ ذرا بدلا اور پھر وہ سیدھا کھڑے ہو کر ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے بولا۔

”اس کا کوئی ثبوت“

”اس کا تو سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مجھے رانی نے بھی دھتکار دیا اور تایا نے بھی گھر سے نکال دیا ہے۔ میں غریب تو در بدر ہو گیا ہوں۔“ میں نے مسکسی صورت بنا کر کہا۔

”ہوں..... مگر ہم تو اپنے بابا جانی کا بدلہ ضرور لے کر رہیں گے اور ہماری نظروں میں تو اور رانی دونوں ہی قصور وار ہو۔“ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا تو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی اترتی محسوس ہوئی۔

”مم..... مگر..... چودھری صاحب! میں تو بالکل بے قصور ہوں۔“

”اوئے چپ کر..... یہ بے قصوری کا پہاڑا۔ حوالدار کریم داد کو سنانا۔ ہم پہلے تیرے ٹوٹے کریم گے پھر رانی کو یہاں لا کر اس پر اپنے کتے چھوڑیں گے۔“ چودھری نیاز نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔

میں لرز اٹھا اور لگا داد فریاد کرنے کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان سے لڑنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ سارا انہی لوگوں کا علاقہ تھا۔ پھر میں خود ایک یتیم لڑکا تھا۔ اب تو تایا نے بھی سر سے ہاتھ ہٹا دیا تھا۔

”چل اوئے چپ کر۔“ چودھری نیاز نے مجھے جھڑکا۔ پھر گہرے لہجے میں بولا۔

”اگر تو ہم سے جان چھڑانا چاہتا ہے تو ایک ہی صورت بن سکتی ہے۔“

”وہ کون سی چودھری صاحب؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”تجھے چودھری حشمت علی خان کا خون کرنا ہو گا۔“

میں چونک کر رکا۔ اس لمحے وہ اپنے مسلح حواریوں سے بولا۔

”اسے لے چلو ڈیرے پر۔“ میں سن ہو گیا۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا مگر اس کے چاروں حواریوں نے مجھے چھاپ لیا۔ چند قدم آگے روانہ ہوئے تو ان کی جیب بھی وہیں کھڑی تھی۔ مجھے زبردستی جیب میں سوار کر لایا گیا اور پھر چودھری نیاز کے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہوتے ہی جیب ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میرے اندر بری طرح دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی۔ مجھے چودھری نیاز کے اس رویے پر بہت طیش آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جیب رکی اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا گیا۔ سامنے سرخ اینٹوں کی ایک بلند عمارت تھی۔ میں یہی سمجھا شاید مجھے حویلی لایا گیا تھا مگر یہ ان کا ڈیرہ تھا جسے ”بینھک“ کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ وہ مجھے اندر لے آئے۔ یہاں دو چار پائیاں اور بیڈ کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک چار پائی پر دھکیلا گیا۔ میں اس پر گر سا گیا۔ پھر چودھری نیاز مجھے معاندانہ نظروں سے گھورتے میری چار پائی کے قریب آیا اور پھر ایک ٹانگ چار پائی پر ٹکا کر عناد بھرے لہجے میں بولا۔

”اوئے! تو کیا سمجھتا ہے تو اگر اندھے قانون سے بچ گیا ہے تو ہم بھی تجھے چھوڑ دیں گے۔ میں تو تیری بوئیاں نوچ کر کتوں کو کھلا دوں گا۔“ میں اس کے خطرناک عزائم جان کر ذرا ڈر سا گیا اور بولا۔

”چودھری صاحب! آپ میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ قتل تو رانی نے کیا تھا۔ وہ بری ہو گئی اب بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو شروع ہی سے بے قصور تھا۔“

”چودھری حشمت علی خان سے تم دونوں عاشق معشوق کا پرانا گٹھ جوڑ لگتا ہے۔“ وہ بے ہودگی سے بولا۔

”یہ جھوٹ ہے۔“ میں نے پرزور احتجاج کیا۔

”اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر تمہارا باپ چودھری حشمت علی خان تمہارے معاملے میں کیوں پڑا تھا۔ اس نے نہ صرف تجھے ہی حوالات سے رہائی دلا دی بلکہ شہر کے وڈے وکیل کی خدمات لے کر رانی کی بھی عدالت سے ضمانت کروالی۔“

”چودھری صاحب! آپ کچھ بھی سمجھیں لیکن سچ یہی ہے کہ میں نے تو اس

حالات کی ان سیاہ آندھیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ خود کو مضبوط بنا..... لوہے جیسا مضبوط۔“ اس کے بعد وہ آواز معدوم ہو گئی۔ ایک ایک کی مجھے محسوس ہوا جیسے میری رگوں میں گردش کرنے والا لہو پارہ بن چکا ہے۔ میں اپنے اندر ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے اپنے دائیں بازو سے بندھے تعویذ کو ہولے سے تھپتھپایا اور پھر ایک نئے عزم مصمم کے ساتھ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سب سے پہلے میں نے کمرے کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ یہ کمرہ مستطیل تھا اور خاصا بڑا بھی۔ کمرے کے آخری حصے میں کاٹھ کباڑ اور کچھ اناج وغیرہ کی بوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کی شمالی اور جنوبی دیواروں پر تین پٹ کی کھڑکیاں بھی تھیں جن پر باہر سے آہنی گرل نصب تھی۔ پٹ بند تھے۔ کمرے کی چھت خاصی بلند تھی اور ایک طرف ذرا بلندی پر کھلا روشن دان تھا جو ”آدم گزار“ تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں کسی طرح روشن دان تک پہنچ بھی جاتا تو دوسری طرف مجھے چھلانگ لگانی پڑنی اور اتنی بلندی سے تو چھلانگ لگانے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں پھر دروازے کی طرف بڑھا جو باہر سے بند کر دیا گیا تھا اور کوئی بعید نہیں کہ مقفل بھی ہو۔ مفر کی کوئی راہ مجھے سرست بھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں تھک ہار کر چارپائی پر گر سا گیا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی کوندے کی طرح لپکا۔ میں نے کھڑکیوں کا تو جائزہ ہی نہیں لیا تھا۔ چنانچہ میں اٹھا پھر پہلے شمالی دیوار والی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اسے اچھی طرح کھول کر دیکھا اور پھر باہر سے مضبوط مگر زنگ آلودہ گرلیں نصب تھیں۔

میں یہاں سے مایوس ہو کر دوسری طرف کی دیوار والی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اسے کھولا تو وہاں بھی حسب توقع گرل نصب تھی۔ میں نے یونہی زنگ آلود گرل کی مضبوطی جانچنے کیلئے اسے ذرا ہلایا تو اچانک میرے اندر امید کی جوت جاگی۔ گرل ڈھیلی تھی۔ میں نے جلدی سے کیلوں کا جائزہ لیا تو مجھے ایک طرف کی کیلوں کی پوری قطار میں سے نصب سے زیادہ کیلیں اکھڑی ہوئی نظر آئیں اور جو باقی ماندہ لگی ہوئی تھیں وہ بھی سب ڈھیلی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں ذرا زور لگا کر آہنی گرل کے اس جھٹکے کو باہر کی طرف جھٹکے دوں تو یقیناً باقی ماندہ کیلیں بھی اکھڑ جائیں گی۔ چنانچہ میں نے سب سے

”کک..... کیا؟“ میں سر تاپا لرز اٹھا تھا۔

”ہاں! میں نے کوئی فارسی نہیں بولی ہے۔“

”کیا کہتا ہے پھر تو؟“

”مم..... مگر..... میں نے تو کبھی ایک کبھی بھی نہیں ماری ہے۔ میں غریب

بھلا اتنے وڈے چودھری صاحب کا خون کیسے کر سکتا ہوں؟“ میں نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

”اچھا تو ٹھیک ہے پھر۔ ادھر ہی مرد۔“ یہ کہہ کر وہ سب لوگ مجھے وہاں قید کر کے چلے گئے۔

میں اتنے بڑے کمرے میں تنہا رہ گیا۔ میں بہت رویا چلایا مگر کسی نے بھی میری نہ سنی۔ پھر مجھے جیب کے اشارت ہونے اور اس کے روانہ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ جا چکے تھے۔ یہ ڈیرہ گاؤں کی آبادی سے دور تھا۔ میں تھک ہار کر ڈولیدہ سا چارپائی پر ڈھے گیا۔ اس بار تو میں بڑی خطرناک نوعیت کی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ آج مجھے اپنی کم مانگی اور بے بسی کا بری طرح احساس ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے چودھری نیاز کی اس ظالمانہ حرکت پر تملہاٹ بھی ہو رہی تھی۔ میں اب بری طرح پچھتا رہا تھا کہ کاش میں اس منحوس ”کالی باؤلی“ کی طرف جانے والا راستہ اس گاؤں سے نہ اختیار کرتا۔ آخر کو ”کالی باؤلی“ کی طرف پچاس راستے جاتے تھے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ مجھے تو اپنے تایا اکبر خان سے بھی یہ امید نہ رہی تھی کہ وہ مجھے تلاش کرنے کی بھی زحمت گوارا کرے گا۔ رفتہ رفتہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں چودھری نیاز کے ہاتھوں بے موت ہی مارا جاؤں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیسے یہاں سے چھٹکارا پاؤں۔ تب پھر اچانک جیسے میرے اندر غیبی آواز ابھری۔ وہ آواز خود میری اپنی تھی۔

”شوکت حسین! تو نے ابھی سے ہی ہمت ہار دی۔ ابھی تو تجھے جلدوش جیسے شیطان سے مقابلہ کرنا ہے اور اس کے شیطانی بنیوں سے سوئی کو آزاد کرانا ہے۔ چل اٹھ اللہ کا نام لے۔ تیرے پاس تو پایہ اعمال شاہ کا تعویذ ہے تو کیوں گھبراتا ہے۔ تجھے اب

اور بدستور چلتا رہا۔ ادھر آن کی آن میں بادلوں کے گرجنے کی دل دہلا دینے والی آوازیں ابھریں اور دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی ہواؤں کے جھکڑوں کے ساتھ ساتھ دھواں دھار بارش کا بھی آغاز ہو گیا۔ میں سارا بھیگ چکا تھا۔ طوفانی ہوائیں میرے قدم اکھڑنے لگیں۔ مجھ سے تو اب ایک قدم بھی آگے بڑھانا دوہرا ہو گیا تھا مگر میں نے ہمت نہیں ہماری اور شوریدہ سر ہواؤں کے سرد ترین تھپڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بمشکل آگے بڑھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے طوفانی ہواؤں کے یہ طاعونتی بگولے میرے وجود کو اٹھا کر کہیں دور پھینک دیں گے۔ میں کالی باؤلی کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ پھر میں نے جیسے ہی کنویں کی سیاہ منڈیر پر اپنا ہاتھ جمایا۔ یکدم جیسے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ بل کے بل طوفان باد و باران نہ صرف ختم گیا بلکہ ایسے غائب ہو گیا جیسے کچھ ہوا نہیں تھا۔ اب وہی ماحول تھا وہی منظر تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا ویسے ہی چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میں ہونٹ بھیجنے کر تنگی سے مسکرایا تھا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ اس مردود جگہ و شہ کی حرکت ہو سکتی تھی اور کیا خبر یہ میری نظر تک ہی محدود تھا۔ بہر طور میں نے تعویذ پر ہاتھ دھرا اللہ کا نام لیا اور منڈیر پر چڑھ گیا۔ نیچے کنواں تیرہ و تاریک تھا۔ ایک بیڑھیاں نیچے اندھیرے میں گم ہو رہی تھیں۔ کنویں کی اندھی گہرائی کو دیکھ کر میرا دل ہولنے لگا۔ جی میں آیا کہ واپس بھاگ جاؤں مگر پھر دوسرے ہی لمحے من موہنی سوہنی کا رخ روشن چشم شوق میں ابھرا تو میرے اندر آپوں آپ ہی ایک عجیب سی نئی قوت عود کر آئی۔ پھر میں نے دل مضبوط کیا اور جیسے ہی بیڑھیوں پر ایک قدم اتارا اندر کنویں کی تاریک گہرائیوں سے ایک گونجی آواز ابھری۔

”خبردار! اندر اترنے کی غلطی مت کرنا ورنہ ساری عمر اس کی تاریک گہرائیوں میں پڑے سڑتے مڑتے رہو گے۔ اب بھی وقت ہے واپس لوٹ جاؤ۔“

کنویں کی تاریک گہرائیوں سے ابھرنے والی اس گونجدار آواز کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ یہ آواز مردود شیطان کے چیلے جگہ و شہ کی تھی مگر میں اب کہاں رکنے والا تھا لہذا میں نے دوسرا پاؤں بھی بیڑھیوں پر نکالیا اور نیچے اترنا شروع کر دیا اور اترتا چلا گیا..... اترتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ بیڑھیوں کے آخری سرے تک جا پہنچا مگر کنویں کی تہ یا

پہلے کھڑکی کے اندر سے باہر کا جائزہ لیا۔ وہاں دور دور تک مجھے کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ تب پھر میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی جھنگے کو باہر کی طرف دھکیلتا شروع کر دیا۔ اس پیہم کوشش میں مجھے پسینہ آ گیا۔ میری محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ جھنگے کی ایک طرف کی کیلیں نکل کر باہر ہی گر گئی تھیں اور اوپر نیچے کی بھی کافی حد تک ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ مجھے یہ بھی ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں چودھری نیاز کا کوئی آدمی ادھر نہ نکل آئے ورنہ میری ساری محنت اکارت چلے جانے کا خدشہ تھا۔ میں ذرا دیر کو سستانے رکا تو اچانک ایک خیال میرے دماغ میں آیا۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا اور جدھر کاٹھ کبڑا بکھرا ہوا تھا وہاں مجھے کچھ رنگ آلودہ اور پرانے بیکار زرعی آلات کے اپنی نکلنے دکھائی دیئے۔ میں نے ایک موٹا سا بھاری آہنی ٹکڑا اٹھایا اور پھر کھڑکی کے قریب آ گیا۔ پھر اس آہنی راڈ کو میں نے جھنگے کے اکھڑے ہوئے حصے میں پھنسا کر اڑیا دی تو پورا جنگلا ہی ایک طرف کو جھول گیا۔ مسرت کے احساس تلے میرا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ پھر میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کھڑکی کی چوکھٹ پار کر کے باہر کود گیا اور دڑکی لگا دی۔ میں اب چودھری نیاز کے گاؤں کی حدود سے دور نکل جانا چاہتا تھا اور ایک بنجر میدان سے لبا چکر کاٹ کر ”کالی باؤلی“ والے راستے کی سمت پر ہو لیا۔ میں دوڑتا ہوا کافی دور نکل آیا تھا۔ ایک جگہ میں ذرا سانس لینے کیلئے رکا ہی تھا مگر پھر آگے چل پڑا۔

جاڑے کی چمکیلی خوشگوار دھوپ چہار اطراف پھیل چکی تھی۔ مجھے شدید پیاس ستانے لگی۔ حلق میرا سوکھ کر کاٹا ہو رہا تھا مگر میں رکنا نہیں تھا اور چلتا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے سامنے ذرا فاصلے پر دھریک کے درختوں کے قریب ایک سیاہ پتھروں کی منڈیر والا کنواں نظر آ گیا۔ میرے اندر بالچل سی چپتا شروع ہو گئی تھی۔ میرے دیرینہ مقصد کے حصول کی پہلی بیڑھی مجھے نظر آ گئی۔ میرے اندر کا جوش اور حوصلہ ہوا ہونے لگا۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر تیز تیز قدموں سے باؤلی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں باؤلی سے ذرا ہی فاصلے پر تھا کہ اچانک آسمان پر سیاہ گھٹا چھا گئی اور تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنا شروع ہو گئے مگر میں نے پھر بھی اس پراسرار کالی باؤلی کی طرف بڑھنا ترک نہیں کیا

زمین تک پھر بھی میرے پاؤں نہیں پہنچے تھے۔ اب تو میں بڑا سٹ پٹایا۔ اوپر دیکھا تو کنویں کا روشن سرا بہت چھوٹا اور خاصا اونچائی پر نظر آ رہا تھا۔ نیچے تاریکی تھی..... گھٹاؤپ تاریکی..... پھر میں نے اللہ کا نام لیا اور میڑھیوں کے اختتامی حصے سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

☆.....☆.....☆

میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی الٹا، کبھی سیدھا اور کبھی سر کے بل تو کبھی ہوا میں قلابازیاں کھاتا۔ تاریک گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا تھا جیسے کوئی قصر فنا تھا جس کے اندر میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو میرے حواس بھی ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ میرا دل ہولنے لگا تھا اور حلق سے اضطرابی طور پر چیخیں بھی خارج ہونے لگی تھیں مگر کنویں کی گہرائی تھی کہ کسی طور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی بلآخر میں ہوش و خرد کی دنیا سے بالکل بیگانہ ہو گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میری سماعتوں میں پانی کا شور سانسائی دیا۔ شپا..... شپ موجوں کی روانی کی ہموار آواز۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا پورا بدن پانی سے بھیگ گیا ہو۔ میں نے آنکھیں کھولیں مگر مجھے اپنے چاروں طرف گھٹاؤپ تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی گیلی زمین پر پشت کے بل لیٹا تھا۔ مجھ پر پانی کے قطرے بھی ٹپک رہے تھے۔ ذرا دیر بعد میری آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے بالکل مدہم سی روشنی کا سا احساس ہوا۔ ایک عجیب سی گھٹن اور سلین محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو اچانک میرا سر پتھر لی چھت سے ٹکرایا۔ قطرہ قطرہ مجھ پر گرنے والا پانی اس چھت سے ٹپک رہا تھا۔ اب تو میں بری طرح شپٹایا۔ پھر میں نے کچھ زندہ زمین میں ریگتے ہوئے اپنا رخ مدہم روشنی کے مخرج کی طرف کیا تو سامنے مجھے ایک طویل قوس کی صورت میں چھپا نظر آیا جس کے باہر مدہم سی روشنی میں مجھے ٹھانٹیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دیا۔ میں نے کہنیوں اور گھٹنوں کے بل جلدی جلدی ریگتے شروع کر دیا۔ میں اس قبر نما سلین زدہ سے ماحول سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ کچھ

یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا اور ابھی قدم بڑھایا ہی تھا کہ ساحل کے قریب چھپا کے کی آواز ابھری اور دوسرے ہی لمحے میں جیسے اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا وہ تھا تو مگر کچھ مگر اتنا جسیم۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں اتنا بڑا اور غیر معمولی جسامت کا مگر کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ کسی چھپکلی کی طرح ریختا ہوا اپنا غار جیسا منہ پھاڑے میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کے نوکیلے لمبے لمبے دانت قوی ہیکل چوڑے جڑوں کے اندر سے چھروں کی طرح جھانک رہے تھے۔ اس کی کھال بہت موٹی تھی۔ میں نے دوڑ لگا دی۔ وہ قوی ہیکل مگر کچھ بھی ساحلی ریت پر دھپ دھپ کرتا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ میری سانسیں پھول گئیں مگر اس وقت خوف نے میرے اندر عجیب سی طاقت بھر دی تھی۔ مگر کچھ کسی پرانے دور کے بھاری بھر کم عرفیت کی طرح دوڑتا میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اگر میں گر جاتا تو وہ چشم زدن میں مجھے اپنے غار ایسے بھیاںک جڑوں میں دبوچ کر سالم نگل جاتا۔ جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ میرا اور اس کا فاصلہ بتدریج گھٹتا جا رہا تھا۔ وہ قوی الجبہ ہونے کے باوجود خاصی تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ جلد ہی مجھے یہ روح فرسا احساس ہونے لگا کہ میں کسی وقت بھی بے دم ہو کر گر پڑوں گا۔ اگر جلد ہی کوئی محفوظ پناہ گاہ نہ ملے تو..... لہذا اب میں نے بجائے سیدھا دوڑنے کے بائیں طرف مڑ کر ساحل کے ساتھ ساتھ ذرا فاصلے پر نظر آنے والے بدہیت مٹی کے تودوں اور چٹانوں کی طرف دوڑ لگا دی اور پھر ایک اونچے تودے پر چڑھ گیا جس کی سطح نمی اور پانی کے عجیب نظر نہ آنے والے رساؤ کی وجہ سے پھسلاواں ہو رہی تھی۔ میں بمشکل اونچائی تک پہنچ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر عقب میں دیکھا تو وہ دیو قامت مگر کچھ اوپر چڑھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک جگہ زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور پہاڑی تودے کے دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں سے میرا پاؤں پھسلا تو میں لڑکھڑاتا ہوا ایک چھوٹی سی پتھریلی راہگوار پر آن گرا۔ مگر کچھ کے خراٹے دار غرانے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہیں وہ دیو زاد مگر کچھ اس راستے نہ آ کر مجھے دبوچ لے۔ میں ہمت کر کے اٹھا اور ساحلی چٹانی تودوں کے درمیان بنے میڑھے میلن زدہ راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ مگر ساحلی چٹانوں کا سلسلہ تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا بلکہ خرمیں تھک ہار کر

سے میرے کپڑے لٹھڑ چکے تھے اور بالآخر میں نیم روشن سرے پر پہنچ ہی گیا۔ اب مجھے سانس لینے میں بھی دشواری نہیں ہو رہی تھی مگر پھر بھی مجھے ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ قبر نما زمین سے ابھرنے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور حیران و پریشان چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میرے چہار اطراف عجیب سی روشن تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر اس مدہم اور پراسرار سی روشنی کا خراج مجھے کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ چاند کی روشنی تھی یا سورج کی۔ ایک عجیب سی ویرانی اور سنائے کا راج تھا۔ سامنے سمندر کی طرح کا پانی پھیلا ہوا تھا اور اس کے بعد گھورتاریکی تھی۔ ساحلی ریت پر کھڑے کھڑے میں حیران و پریشان نظروں سے ساحل کے کنارے ریت کے ٹیلوں کے پراسرار ہیولوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو آسمان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس ایک تاریکی تھی مستقل قائم اور آباد رہنے والی گھنگھورتاریکی اس ہولناک ماحول سے مجھے اپنے وجود میں خوف کی پھریری سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر میرے اندر ایک روح فرسا خیال ابھرا کہ کہیں میں زمین کے اندر پاتال کی نادیہ دنیا میں تو نہیں اتر آیا ہوں؟ اف خدایا! کیسا پرہول ماحول تھا۔ ہر طرف سنائے کا راج تھا۔ نہ بندہ تھا نہ بندے کی ذات حتیٰ کہ ایک معمولی سا چھوٹا چرند پرند تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک مجھے سامنے سمندری پانیوں کی سطح پر ہلچل سی ہوتی نظر آئی۔ میں چونک کر مذکورہ سمت دیکھنے لگا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی کچھ ہو جائے گا جیسے کوئی ناقابل یقین انہونی..... پانی کی سطح اب پرسکون ہو گئی۔ میں سمجھا شاید کوئی بڑی مچھلی باہر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ساحل کے ساتھ ساتھ آگے قدم بڑھائے تو اچانک پانی کی پرسکون سطح میں ایک بار پھر زبردست ہلچل ہوئی۔ میں ٹھٹھک کر مذکورہ سمت دیکھنے لگا تب دوسرے ہی لمحے مجھے پانی کی سطح پر کوئی شے ابھرتی ہوئی دکھائی دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور بغور پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی اس عجیب شے کو دیکھنے لگا۔ وہ شے ذرا قریب آئی تو میں جی جان سے لرز اٹھا۔ وہ کسی جانور کا لمبوتر اچہرہ تھا جس کی دو بڑی بڑی ابھرواں آنکھیں مجھے اپنی طرف گھورتی ہوئی صاف نظر آرہی تھیں۔

”مگر کچھ!!!“ میرے ٹھٹھکے ہوئے ذہن میں یہ نام ابھرا تھا۔ میں نے فوراً



میری پیاس شدید ہو گئی۔ میرے بدن اور کپڑوں پر بے تحاشا کچڑ لگا ہوا تھا۔ میں ریت پر دوڑتا ہوا سمندر کے کنارے پر آ گیا اور یہاں میرے گھٹنوں تک پانی تھا۔ میں نے کپڑوں سمیت غسل کیا اور اپنے کپڑے اور بدن سے کچڑ صاف کیا اور تھوڑا چلو بھر کر اسے چکھا تو مجھے اس کا ذائقہ نکلین لگا۔ میں نے اسے پینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ نجانے کیسا پانی تھا کہیں اسے پی کر میرے پیٹ میں مروڑ نہ اٹھتے۔ مجھے اس قوی بیکل مگر مجھ کا بھی ڈر تھا کہیں وہ کم بخت دوبارہ نہ نکل آتا۔ اس لئے میں جلدی جلدی نہادھو کر دوبارہ ریت پر آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے اب ایک نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا اور وہ تھی صاف اور میٹھا پانی اس کے بعد خوراک۔ یہ دونوں چیزیں میری بقا کیلئے لازمی تھیں چنانچہ میں نے چٹانوں سے دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تیس چالیس قدم تو میں ساحلی ریت پر سمندر کے کنارے چلتا رہا تو کافی آگے جا کر مجھے ساحلی چٹانوں کے عقب سے کچھ درخت جھانکتے دکھائی دیئے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی میں اب دوڑنے لگا پھر چٹانوں کے درمیان بنی میڑھی میڑھی سنگلاخ راہ گزر سے ہوتا ہوا دوسری طرف آ گیا۔ سامنے عجیب وضع کے درختوں اور خورد و جھاڑیوں کا خاصا طویل سلسلہ پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ میں رے بغیر چلتا رہا۔ حتیٰ کہ جنگل کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ یہاں عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ نہ پرندوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور نہ ہی کوئی اور ذی نفس نظر آیا۔ میں اللہ کا نام لے کر اس پر اسرار جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہاں ہرے بھرے درختوں اور خورد و جھاڑیوں کے علاوہ رنگارنگ خوشنما پھول بھی نظر آ رہے تھے۔ درختوں پر عجیب زرد رنگ کے پھل لدے ہوئے تھے۔ سارے درختوں کے تنے آہستہ رنگت کے تھے۔ میں ایک درخت پر بمشکل چڑھا اور ایک موٹی سی تنے دار شاخ کو زور زور سے جھلایا تو مائلوں کے جیسے پھل زمین پر آن گرے۔ میں جلدی سے نیچے اترا اور وہیں زمین پر بیٹھ کر ایک پھل کو ہاتھ میں پکڑا اور اسی میں دانت گاڑ دیئے۔ اندر سے اس کا گودا سفید رنگ کا تھا۔ پھل خوش ذائقہ اور سیلا تھا۔ میں نے ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا کھاتا چلا گیا۔ اس سے کسی حد تک میری پیاس بھی بجھ گئی اور خاصی حد تک شکم سیری بھی ہو گئی۔ میں نے دو تین پھل مزید کھائے اور کچھ میں نے جیبوں

ذرا سستانے کیلئے ایک جگہ بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہی منحوس تاریک ہولے تھے اور تاریک آسمان ..... پتہ نہیں آسمان تھا بھی کہ نہیں۔ دور خلا میں تو مجھے کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ ماسوائے اندھیروں کے۔ عجیب سا تاریک ماحول تھا۔ میں سوچنے لگا آخر میں اس پر اسرار کھنڈر تک کیسے پہنچ پاؤں گا؟ جہاں اس مردود شیطان کے چیلے جگہ و ش نے سوہنی کو قید کر رکھا تھا۔ نجانے وہ منحوس کھنڈر کہاں تھا اور کس مقام پر تھا؟ بہر طور میں مایوس نہیں تھا کیونکہ میں اتنا تو جان ہی گیا تھا کہ میں جگہ و ش کی جس بدنگری میں پہنچنا چاہتا تھا وہاں پہنچ چکا تھا۔ اب کھنڈر تک بھی پہنچ ہی جاؤں گا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں متواتر خواب میں اس کھنڈر میں خود کو دیکھا کرتا تھا تو وہ طلسماتی چاند کی روشنی ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے یہاں ایسی رات ہو۔ یہ سوچ کر میں کچھ مطمئن ہوا اور میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر یہاں رات کا وقت ہے تو پھر مجھے یہ رات ادھر ہی گزارنی چاہیے تھی۔ پھر مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ آخر رات میں بھی آسمان پر چاند یا تارے تو چمکتے ہوئے نظر آنے ہی چاہیے تھے۔ بہر طور میں یہی دعائیں مانگنے لگا کہ کاش یہاں بھی دن رات کا سماں ہو ورنہ تو مشکل پڑ جائے گی۔ اگر یہاں مستقل اندھیروں نے ڈیرے ڈالے رکھے تو مصیبت ہو جائے گی۔ بہر طور میں اللہ سے دعائیں مانگتا ہوا وہیں لیٹ گیا اور پھر نجانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

آنکھ کھلی تو مجھے جیہن کا احساس ہوا۔ پھر دوسرے ہی لمحے یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میرے چاروں طرف دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں جلدی سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر بے اختیار سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ دن کا اجالا وہیں سے ہی نمودار ہو رہا تھا لیکن مجھے سورج کہیں نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی دھوپ کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ دن کی روشنی تھی جو چہار اطراف پھیلی ہوئی تھی۔ میرے لئے یہی کافی تھا ورنہ تو مجھے یہاں کے تاریک ماحول سے بڑی وحشت سی ہونے لگی تھی۔ موجوں کا شور بھی اب میری سماعتوں کو بھانے لگا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور واپس ساحل کی طرف بڑھا۔ وہاں کا ماحول بھی اب روشن ہو چکا تھا۔

حدنگاہ تک بیکراں سمندر پھیلا ہوا تھا مگر اس کا پانی قدرے سیاہی مائل تھا۔

میری حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں سامنے ذرا ہی فاصلے پر دراڑ کی پتھر ملی دیوار سے ٹپک لگائے کھڑے سوئی کو نکلے جا رہی تھیں۔ وہ میری محبت میرا سکون اور میرے دل کا قرار من موئی سوئی تھی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس بار اس کے چہرے سے سوگواری اور اداسی نہیں ٹپک رہی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے تراشیدہ یا توئی لب جوش جذبات سے لرزاں تھے۔ جمیل سی گہری اور کججاری آنکھوں میں ملنے کی تڑپ تھی۔ دیپ روشن تھے۔ سوئی کو اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر سامنے پا کر میری دم بخود سماعتوں میں امید کے سکھ گونج رہے تھے۔

”سوئی!!!“ بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا اور ساتھ ہی میں نے اس کی جانب جیسے عالم بے خودی میں قدم بڑھا دیئے۔ اس نے بھی مجھے اپنی ریشمیں اور مہربان بانہوں میں بھرنے کیلئے دونوں بازو داکر دیئے اور میں جیسے برسوں کا پیاسا پنجھی اس سے جالپنا۔ وہ بھی مجھ سے لپٹ گئی۔ اسکے مرمریں وجود کا پر شباب لمس اور مہکتے وجود کی سحر آفریں نکبت نے جیسے مجھے مدھوش سا کر کے رکھ دیا۔

”مم..... مم..... مجھے یقین نہیں آ رہا سوئی کہ..... کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں..... اور..... اور..... تم میرے سامنے ہو۔“

میں دفور جذبات انگیز خوشی میں اسے چومنے لگا۔ سوئی بھی بہت خوش اور پرست دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بھی خوشی سے لبریز ہو کر بولی۔

”ہاں شوکت! مجھے بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم میری خاطر یہاں تک بھی آ سکتے

”ہو۔“

میں بھی بھولنے اور پھر آگے چل پڑا۔ تقریباً نصف گھنٹہ مسلسل چلتے رہنے کے بعد جنگل تمام ہوا تو سامنے چٹیل میدان تھا مگر یہ زیادہ وسیع نہ تھا کیونکہ اس کے آخری سرے پر مجھے دوبارہ پہاڑیاں دکھائی دیں مگر ان پہاڑیوں کی ڈھلانیں سبزے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میں ذرا دیر سستانے رکا اور پھر آگے چل پڑا۔ خاصی دیر بعد جب میں سبزے سے ڈھکی پہاڑیوں کے قریب پہنچا تو میں نے ہری ہری دوب نما گھاس کو چھو کر دیکھا۔ عام گھاس کی طرح نرم اور ملائم تھی۔ مجھ میں پہاڑی پر چڑھنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے اس امید پر اس کے متوازی آگے چلنا شروع کر دیا کہ شاید سنگلاخ راہ گزر ان کے درمیان میں موجود نظر آ جائے۔ چند قدم چلا تھا کہ میری امید برآئی۔ ایک خاص چوڑی دراڑ نما راہ گزر مجھے نظر آئی تھی۔ میں فوراً اس کی طرف بڑھا اور اس میں داخل ہو گیا۔ یہ خاصی تنگ دراڑ تھی۔ روشنی کا گزر بھی بمشکل ہی ہو رہا تھا مگر بہر حال کسی حد تک ماحول روشن تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ دراڑ ذرا ہی آگے جا کر کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب مڑ رہی تھی۔ میں بھی چلتا رہا۔ اچانک مجھے ایک آواز آئی۔ میں نے سر اٹھا کر سنگلاخ بلند یوں کی طرف دیکھا تو مجھے کوئی نیچے جھانکتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ تھوٹنی نما کسی کا سر تھا۔ میں بغور اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تو وہ اچانک غائب ہو گیا۔ میرا دل یکبارگی کسی انجانے خوف میں دھڑکا تھا۔ میں چند ثانیے سر اٹھائے بدستور سنگلاخ بلند یوں تک دیکھتا رہا شاید وہ تھوٹنی والا عجیب سردوبارہ جھانکتا نظر آئے مگر وہ دوبارہ نظر نہ آیا۔ میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ آگے ایک تنگ موڑ کا نٹے ہی میری سامنے نظر پڑی اور میں بری طرح ٹھک کر رک گیا۔ پھر سامنے کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں پھلتی چلی گئیں۔ ایک لمحے کو تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ میں جو دیکھ رہا تھا وہ خواب تھا..... یا حقیقت۔

☆.....☆.....☆

میں پڑے کھڑی تھی۔ اندر سے کھوہ کافی کشادہ تھی اور اس کی پتھرلی چھت بھی کافی اونچی تھی مگر یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کھوہ میں آگے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ میں نے سوئی سے پوچھا۔

”سوئی! آگے تو مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔ ہم کہاں جائیں؟“ وہ میری بات سن کر مسکرائی۔

”ذرا رات ہونے دو۔ اس کے بعد اس کی ایک دیوار خود ہی شق ہو جائے گی۔ پھر ہم اس میں داخل ہو کر واپس اپنی دنیا میں پہنچ جائیں گے۔“ میں اس کی بات پر عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا تھا تاہم میں نے اس سے کہا کہ میں جگہ و ش کو کب فر کر دار تک ضرور پہنچانا چاہتا ہوں۔ اللہ کے برگزیدہ بزرگ نے مجھ سے وعدہ لیا ہے اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے یہ نیک سعادت ملی ہے۔ میں اسے ضرور پورا کروں گا۔

”چلو سوئی! مجھے بتاؤ وہ مردود اس وقت کہاں ہے؟“

میرے اٹل ارادے پر سوئی کے چہرے کے تاثرات متغیر سے ہو گئے اور پھر اس نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے..... میں تمہیں وہاں تک ضرور لے کر چلوں گی لیکن یہ تو بتاؤ تم جگہ و ش جیسے اتنے بڑے جادوگر سے کس طرح مقابلہ کرو گے؟“

”میرے پاس اللہ کی طاقت ہے اور یہ تعویذ۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور فخر کے ساتھ سوئی کو اپنی جیب سے بابا کمال شاہ والے پڑھے ہوئے منصوری پیپے والے تعویذ نکال کر اسے دکھایا۔ پھر اپنے دائیں بازو کی آستین اوپر اٹھا کر اسے دوسرا تعویذ بھی دکھایا۔ میں نے دیکھا سوئی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ جانے کیوں مجھے سوئی کے یہ انداز و اطوار مختلف سے نظر آرہے تھے۔ وہ مسکرا کر میرے قریب آئی اور میرے گلے میں بائیں ڈال کر بولی۔

”اچھا! اب یہ دونوں تعویذ اتار کر تم ایک طرف رکھ دو اور تھوڑا آرام کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ یہاں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ میں حیرت سے اس کا منہ نکتے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا نشہ تیرنے لگا تھا۔ پھر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا

”میں نے تو تجھے حاصل کرنے کی قسم کھا رکھی تھی سوئی!“ میں اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھ کر محبت پاش لہجے میں بولا۔ ”تمہاری خاطر تو میں آگ میں بھی کود سکتا تھا۔ اس سے پہلے تو میں تجھے خواب میں ملا کرتا تھا نا اب دیکھو ہم حقیقت میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ اب تو تم میرے ساتھ چلنے سے انکار تو نہیں کروں گی ناں۔ میں نے آخر میں اس کی گہری جھیل سی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے رکھاؤ سے پوچھا تھا۔“

”نہیں..... اب جہاں تم کہو گے میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ سوئی نے مضبوط لہجے میں کہا تو پہلی بار مجھے اچھسا سا ہوا۔ میں سوچنے لگا کیا اب اسے جگہ و ش کا خوف نہیں رہا تاہم میں نے پوچھ لیا۔

”سوئی! یوں تو تمہیں حاصل کرنا میرا اہم مقصد تھا لیکن میں اس مردود شیطان کے شتو گنڈے ملعون جگہ و ش کو کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ سوئی! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ وہ پراسرار کھنڈر کہاں ہے جدھر وہ مردود رہتا ہے۔“ میں نے دیکھا میری بات پر سوئی کے چہرے پر عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا ہو۔ وہ جیسے بات بتانے کے انداز میں بولی۔

”شوکت! اس مردود کو دفع کرو۔ آؤ ہم یہاں سے بھاگ چلتے ہیں۔“ مجھے اس کی بات پر پہلی بار حیرت سی ہوئی تاہم میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا جو برف کی طرح سرد تھا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک تاریک سی غار نما کھوہ کے قریب لے آئی۔ پھر وہ ذرا رکوع کے بل جھک کر اندر داخل ہو گئی۔ میں حیران و پریشان باہر ہی کھڑا رہا تو وہ اندر گونجیلی آواز میں بولی۔

”شوکت اندر آ جاؤ۔“

”مگر کیوں سوئی؟ اندر کیا ہے؟“ میں نے باہر کھڑے کھڑے اس سے کہا تو وہ بولی۔

”یہاں سے ہماری دنیا تک جانے کا راستہ نکلتا ہے۔ آؤ جلدی کرو۔“ میں متذبذب سا آگے بڑھا اور سر ذرا جھکا کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر آیا تو سوئی ایک دیا ہاتھ

خدا خدا کر کے یہ منحوس پہاڑی سلسلہ ختم ہوا تو سامنے چٹیل لق و دق میدان نظر آیا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پوری طرح پھیل چکی تھی مگر جب میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنا چاہا تو وہاں دبیز کبر اور دھند کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اس چٹیل میدان کو عبور کرنے سے پہلے اپنے پاس موجود زرد رس دار پھل کھائے پھر آگے چل پڑا۔ میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا..... چلتا رہا..... جدھر تھک جاتا ذرا دیر کو سستانے کیلئے بیٹھ جاتا اور ذرا ہی دیر بعد تازہ دم ہو کر دوبارہ چل پڑتا۔ اس طرح چلتے رہنے کے باوجود بھی میدان ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا حتیٰ کہ ایک بار پھر چاروں طرف اندھیا رے سے چھانے لگے۔ میرا دل جانے کیوں ہولنے لگا۔ اور میں قدرے سہم کر وہیں بیٹھ گیا اور رفتہ رفتہ اس دیران ماحول میں اترنے والے اندھیروں کو خاموشی سے دیکھنے لگا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گھورتا ریکی چھا گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ آس پاس کا ماحول پھر روشن ہونے لگا لیکن اسے بہر حال دن کا اجالا نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ چٹیلی سی پر اسرار طلسمانی روشنی تھی اور مدھم مدھم سی تھی۔ جیسے دور کہیں چاند نکل آیا ہو مگر وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بڑی عجیب دنیا تھی یہ..... شاید میں پاتال کی منحوس گہرائیوں میں اتر آیا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی جانے کیوں میرے پورے بدن میں خوف کی سرسراہٹ دوڑ گئی۔ ایک عجیب سی سنسنی کا احساس ہونے لگا تھا مجھے۔ میں دم بخود سا اس دیران اور ہولناک ماحول میں بیٹھا رہا۔ پھر میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ میں وہیں بھر بھری مٹی والی زمین پر لیٹ گیا۔ پھر جانے کب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی اور میں سو گیا۔

اچانک میری آنکھ کھلی۔ لیٹے لیٹے مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم پر لاتعداد جیونیاں رینگ رہی ہوں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو دہشت سے میرا چہرہ فق ہو گیا۔ میرے بدن پر ان گنت موٹے موٹے سروں والے سرخ رنگ کے چیونٹے رینگ رہے تھے بلکہ میرے بدن پر ہی نہیں مجھے زمین پر بھی ان کی فوج ظفر مونج سی رنگت نظر آئی۔ میں پاگوں کی طرح دوڑ پڑا اور ساتھ ہی ساتھ دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم اور کپڑوں پر چپے ہوئے موٹے موٹے چیونٹوں کو بھی جھٹکتا جاتا۔ چند نے تو مجھے کارٹ بھی لیا تھا۔

لیا۔ فرط جذبات سے مرتعش آواز میں بولی۔

”رکھ دو تاں اتار کر یہ دونوں تعویذ شوکت! میرا بدن بہت ٹوٹ رہا ہے۔ تم نہیں جانتے میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں اور جس طرح تم میرے لئے تڑپتے رہے ہو اسی طرح میں بھی تمہاری جدائی میں کڑھتی رہی ہوں۔ آؤ نا..... اتنا مت ستاؤ۔“ ایک عجیب سی ادائے دلربائی کے سے انداز میں بولی۔ مجھے اس کا یہ عامیانہ پن نہایت ناگوار محسوس ہوا تھا۔ وہ برابر اسرار کرتی رہی اور اپنے پر شباب بدن کے لمس سے مجھے آشنا کرنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر تب پہلی بار میری چھٹی حس نے مجھے کسی انجانے خطرے سے خبردار کیا تو میں نے فوراً ہاتھ میں پکڑے ہوئے منصوری پیسے والے تعویذ کو سوئی کے بدن سے لگایا تو اگلے ہی لمحے سوئی ایک دلخراش چیخ مار کر مجھ سے دور ہٹ گئی۔ پھر میں نے ایک روح تک کو لرزا دینے والا دہشت ناک منظر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں سبک اندام سوئی کا حسین چہرہ یکنخت سیاہ پڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے دیدے پھیل کر باہر کو ابل آئے۔ ستواری ناک غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ..... دو بدہیت سوراخ جھانکنے لگے تھے۔ اوپر نیچے کے دونوں ہونٹ بھی سکڑ کر اندر کی طرف کھینچ گئے تھے اور اب ان کی جگہ لمبے لمبے نوکیلے دانت نظر آ رہے تھے۔ جن سے تازہ اور سرخ سرخ خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ اس کے مکروہ چہرے پر ان گنت دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ دونوں کان پیچھے کی طرف مڑ گئے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن بھی لمبے ہونے لگے تھے۔ پاؤں الٹے ہو چکے تھے۔ وہ کوئی چیزیل تھی..... جو سوئی کے روپ میں دھوکے سے میرے دونوں تعویذ اتروانا چاہتی تھی۔ میں نے اپنی خوف زدہ سی کیفیات پر قابو پایا اور جلدی سے کھوہ کے اندر سے باہر نکل آیا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ عقب سے اس خوفناک چیزیل کے ڈراؤنے قہقہے دور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔ میں تب تک بھاگتا رہا تھا جب تک کہ میری سانسیں نہ پھول گئیں۔ پھر میں ایک پہاڑی کی پتھریلی دیوار سے پشت نکائے سستانے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں اپنی پھولی ہوئی سانس بحال کرتا رہا۔ اب شیطانی قہقہوں کی آواز معدوم ہو چکی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور آگے بڑھ گیا۔

چاروں طرف سے رن بستہ کر ڈالا اور میں بے دم ہو کر گر پڑا۔ زمین پر گرتے ہی میں جس قدر اس جال سے چھٹکارہ پانے کیلئے ہاتھ پاؤں چلاتا اسی قدر میں مزید الجھتا چلا جاتا بلکہ خرتھک ہار کر میں نے یہ کوششیں ترک کر دیں اور لگا زور زور سے ہانپنے۔ پھر میں نے لیٹے لیٹے اس دیوقامت کڑی کو اپنی طرف دھیرے دھیرے بڑھتے دیکھا۔ تب یہ دیکھ کر مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی کہ جال کڑی کے سوراخ دار منہ سے جالے کی صورت اٹل رہا تھا جو اس کا شاید لعاب دہن تھا۔ مجھے خوف کے ساتھ کراہت آنے لگی۔ میں دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس خوفناک کڑی کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے نکلے جا رہا تھا۔ وہ اپنی ابھری ہوئی منہ کے دانوں جیسی کالی کالی آنکھوں سے مجھے گھورتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے باہر کو نکلے ہوئے ڈنک کی طرح کے دانوں کو بھی کچکا رہی تھی۔ مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ بھوتوں، چیزیلوں سے تو میں اپنے تعویذوں کے زور پر لڑ سکتا تھا مگر اس حیوانی مخلوق سے کیسے مقابلہ کرتا جس نے مجھے آن کی آن میں اپنے لیس دار جالے میں پھنسا لیا تھا۔ میں جال میں الجھا ہوا زمین پر لینا کڑی کو گویا اپنی موت کی صورت اپنی طرف بڑھتے ہوئے نکلے جا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔ کڑی میرے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ مجھے اس سے گھن آنے لگی۔ اس کا فٹ بال جیسا گول سرمیالے رنگ کا تھا اور چھوٹے چھوٹے کانے دار بال اگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے منہ سے جھانکتے ڈنک نما دانوں سے رقیق مادہ نپک رہا تھا۔ مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔ میں نے ایک بار پھر خود کو اس لیس دار جال سے چھڑانے کی کوشش کی مگر میں اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔ میرے چہرے پر بس کڑی کے جالے سے چپک گئے تھے جس کی وجہ سے مجھے دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ میں جیسے جال کے گولے میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ تب پھر جانے ایک اس دیوقامت کڑی کے منہ سے تاریا آمد ہوئی جو جال کے ساتھ منسلک ہو گئی۔ اس کے بعد کڑی نے پیچھے سر کنٹا شروع کیا۔ وہ مجھے جال سمیت اپنے ساتھ کھینچے جا رہی تھی۔ جال اتنا تلامم اور ریشے دار تھا کہ با آسانی زمین پر پھسلتا چلا جا رہا تھا۔ جال کے باریک تار بہت مضبوطی سے باہم جڑے ہوئے تھے اور ان کا کوئی سرا مجھے نظر نہیں آ

مجھے بے اختیار جھرجھری آگئی تاہم میں نے بہت جلد ان خونی چیونٹوں سے نجات حاصل کر لی اور وحشت زدہ ہو کر دوڑنے لگا۔ پھر کافی دور جا کر میں کھڑا ہو گیا اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ یہاں امن تھا۔ نجانے یہ کم بخت کہاں سے آن وارد ہوئے تھے بلکہ یہ تو مجھے قبروں میں رہنے والے مردہ خور چیونٹے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے یہ سوچ کر پھریری آگئی کہ کہیں یہ کم بخت مجھے کوئی مردہ سمجھ کر تو نہیں کاٹنے لگے تھے۔ بہر طور میں وہیں بیٹھ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے اب کوسوں دور بھاگ چکی تھی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ میں دم بخود سا بیٹھا رہا۔ تب پھر اچانک میں چونکا۔ وہ ایک عجیب سی آواز تھی بالکل مدھم سی ”سرسر“ کرتی سرسراتی آواز جو میرے دائیں جانب سے آ رہی تھی۔ میں نے جلدی گردن موڑ کر مذکورہ سمت کی طرف دیکھا اور دہشت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ایک دیوقامت اور بڑی خوفناک کڑی تھی۔ اس کی لانی لانی ان گنت ٹانگیں تھیں اور ان پتلی پتلی غلیظ ٹانگوں کے آغاز مرکز میں ایک فٹ بال جتنا اس کا بڑا سا سر بھی تھا جن پر ابھری ہوئی دو منہ کے دانوں جیسی بڑی بڑی کالی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ آنکھوں سے نیچے منہ اس کا چھوٹا سا تھا مگر دو اوپر اور دو نیچے اس کے بڑے بڑے ڈنک نما دانت صاف نظر آ رہے تھے۔ اتنی بڑی کڑی میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی قدیم دور میں موجود تھا۔ ساحل سمندر پر ملنے والے جسیم مگر چھ پھر غیر معمولی جسامت کے موٹے موٹے سرخ چیونٹوں کے بعد میں یہ تیسری دیوزاد مخلوق دیکھ رہا تھا جس نے میرا خون ہی خشک کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک تو میں تھا بھی تھا۔ میں بھلا کیسے اتنی بڑی کڑی کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ کڑی مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اب تیز تیز اپنی پتلی مگر مضبوط ٹانگیں چلاتی میرے قریب آنے لگی۔ میں اس قدر دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ میری ٹانگیں تک لرزنے لگی تھیں مگر بہر حال جلد ہی جان بچانے کا جذبہ خوف پر غالب آیا اور میں پھرتی سے اٹھ کر دوڑ پڑا۔ پھر دوڑتے دوڑتے میں نے پیچھے ذرا گردن گھما کر دیکھا تو وہ کڑی میرے سر پر پہنچ چکی تھی۔ بے اختیار میرے طلق سے مارے دہشت کے چیخ خارج ہو گئی۔ پھر اچانک جیسے کسی نے میرے اوپر جال پھینکا ہو۔ وہ جال عجیب سا تھا لچلچا سا بد بو دار جس نے مجھے

رہا تھا۔ میں تھک ہار کر تن بہ تقدیر ہو گیا تھا تاہم اتنا مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ منحوس مکڑی مجھے اپنی کسی کمین گاہ پر لے جا کر بڑے آرام سے مجھے لقمہ بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ مکڑی بڑے آرام سے مجھے اپنے جال سمیت مھینے جا رہی تھی۔ لگ بھگ کوئی آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر اونچے نیچے ٹیلے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر ایک نسبتاً اونچے ٹیلے کی اوٹ میں آ کر مکڑی رک گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ مجھے اپنی یقینی موت بالکل سامنے نظر آ رہی تھی کیونکہ رکنے کے بعد مکڑی نے اب دھیرے دھیرے میرے قریب آنا شروع کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اوپر نیچے چاروں دانتوں کو بھی حرکت دے رہی تھی۔ میں سمجھ گیا اب وہ مجھے کتر کتر کر ہڑپ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں بے بسی سے گویا اپنی موت کا منتظر تھا کہ اچانک فضا میں ایک تیز چیخ کی آواز ابھری۔ مکڑی یک دم ٹھنک کر رکی۔ میں نے چیخ کی سمت دیکھا تو مجھے مکڑی کے گرد پتلی پتلی ٹانگوں اور ہاتھوں والے پستہ قامت انسان نظر آئے۔ وہ ننگ دھڑنگ تھے۔ سر پوشی کے نام پر صرف ایک کھال کا ٹکڑا باندھ رکھا تھا۔ ان کے جسم تانبے کی طرح چمک رہے تھے۔ چہرے نگوں تھے۔ بھنوں غائب تھیں۔ منہ بھی پتلا تھا۔ بال نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں اپنے قد سے بھی بڑے لائے لائے آہنی انیوں والے سان (بھالے) تھام رکھے تھے۔ ان عجیب و غریب وضع کے انسان کو دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا تھا۔ شاید انہوں نے ہی مکڑی کو چیخ کر لکارا تھا۔ ان کی تعداد آٹھ دس کے قریب ہی تھی۔ میں نے دیکھا مکڑی نے اپنا فٹ بال نماسر دائیں بائیں گھما کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ تب پھر عجیب الحقت انسانوں نے اپنے سان کے ساتھ مکڑی کو پرے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔ مکڑی غضب ناک ہونے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس سے اس کا شکار چھینا جا رہا تھا اور وہ اتنی آسانی سے اپنے منہ کا نوالہ دینے پر ہرگز تیار نہ تھی۔ نتیجتاً ایک جنگ کا سامان بندھ گیا۔ مکڑی نے ان کا گھیرا توڑنے کیلئے ایک طرف کھڑے حربیوں پر جھپٹی۔ دو تو ایک طرف کو ہو گئے۔ البتہ تیسرے پر مکڑی نے اپنے منہ کا لیس دار تار پھینکا۔ تار میں جکڑنے کی دیر تھی کہ مکڑی نے اسے تار سمیت گھسیٹ لیا اور اپنی بڑی بڑی ٹانگوں سے اسے مارنے لگی۔ اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر باقیوں نے اپنے ہاتھوں میں

تھامے سان مکڑی پر اچھال دیئے۔ ان کے نشانے خطا نہیں گئے تھے۔ سب کے سب سان مکڑی کے فٹ بال جیسے سر میں پیوست ہو گئے اور مکڑی کے سر سے سیاہ رنگ کا مواد خارج ہونے لگا تھا۔ اس نے جان بچانے کی کوششیں کی اور دوڑ لگا دی مگر ذرا ہی دور جا کر پتلی پتلی لائبی ٹانگوں پر لڑکھرائی اور زمین بوس ہو گئی۔ ان عجیب الحقت انسانوں نے خوشی اور فتح کا اظہار کیلئے ایک نعرہ بلند کیا اور پھر انہوں نے آگے بڑھ کر اپنے اپنے سان کھینچ لئے۔ ان کا ایک ساتھی جو ابتدائی حملے میں اچانک مکڑی کے حملے کی زد میں آ گیا تھا زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ دو افراد اس کی طرف متوجہ ہوئے باقی میری طرف بڑھے۔ جہاں مجھے اس دیو زاد اور آدم خور مکڑی سے جان چھوٹنے کی خوشی ہو رہی تھی وہاں ان عجیب و غریب منحنی سے انسانوں کے ٹولے کو دیکھ کر پریشانی بھی تھی۔ جانے اب یہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ کہیں میرے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں انکا والا معاملہ نہ ہو جاتا۔ خیر میں اب اپنے ان نجات دہندوں کو آس بھری نظروں سے نکلنے لگا جو اپنے سان کی مدد سے میرے گرد لپٹا ہوا جال توڑنے کی کوشش میں جتے ہوئے تھے۔ جلد ہی میں آزاد ہو کر زمین پر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اب مجھے گھیر لیا تھا اور نیزے (سان) سنبھالے ٹکڑے ٹکڑے عجیب نظروں سے مجھے نکلنے لگے۔ خدا جانے وہ کون سی زبان سمجھتے تھے مگر میں نے ہی ہمت کر کے ان سے پوچھا۔

”تت..... تم لوگ کون ہو؟“

وہ خاموش رہے۔ میں پھر دوستانہ انداز میں مسکرانے کے سے انداز میں

بولاً۔

”تمہارا شکریہ! تم نے مجھے اس آدم خور ذلیل مکڑی سے نجات دلائی۔ اچھا

اب میں چلتا ہوں۔“

یہ کہہ کر جیسے ہی میں نے آگے قدم بڑھائے اچانک سب حرکت میں آئے اور پھر سان کی انیاں مجھے چھو چھو کر ایک طرف کو دھکیلنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے اب درشتگی ہو رہی تھی۔ ساتھ وہ اپنے حلق سے عجیب عجیب غراتی ہوئی آوازیں بھی نکالے جا رہے تھے جن میں غصہ اور دھمکی مترشح تھی۔ بلا خرواہی ہوا تھا یعنی آسمان سے

گرا اور کھجور میں اٹکا۔ ناچار میں ان کا خاموش حکم ماننے پر مجبور ہو گیا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ وہ ب مجھے اسی طرح گھیرے ایک ایسی وادی میں لے آئے جس کے ایک طرف اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ تھا۔ دوسری طرف آب و ہوا کی چٹانیں اور باقی دو طرف گھٹا جنگل تھا۔ یہ بڑی عجیب و غریب وادی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ سامنے جا بجا مجھے خشک مٹی کی ڈھیریاں سی بنی نظر آ رہی تھیں۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہ طرز عجیب الخلق تھیں انسانیوں کی آبادی تھی اور یہ خشک مٹی کی ڈھیریاں ان کے گھر تھے۔ وہاں مجھے انہی جیسے اور بھی لوگ ادھر ادھر آتے جاتے نظر آئے۔ ان میں مرد و جوان بوڑھے عورتیں اور بچے بھی تھے تاہم مجھ پر ان کی نگاہ پڑتے ہی وہ سب لوگ حیرت و استعجاب کے ساتھ کھڑے ہو کر مجھے نکلنے لگے۔ پھر مجھے بستی کے وسط میں کھڑا کر دیا گیا۔ اسی طرح جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔ اس کے بعد فضا میں نقارہ پینے کی آواز ابھری۔ اس آواز کے ابھرتے ہی سب لوگ باادب قطار بنا کر مودبانہ کھڑے ہو گئے۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دل و دماغ میں سوطر کے اندیشے اور دوسرے سرباہر رہے تھے۔

تب پھر میں نے دیکھا چند خداموں کی معیت میں ایک نسبتاً بڑے ذیل ڈول کا شخص ایک طرف سے نمودار ہوا۔ یہ ان کا سردار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ میرے ذرا قریب پہنچ کر رکا اور میری طرف گھورنے لگا۔ اس کے دائیں بائیں اور عقب میں کھڑے خدام ہاتھوں میں سانیں سنبھالے چوکس کھڑے تھے۔ پھر جو مجھے یہاں لائے تھے ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اپنے سردار سے مودبانہ انداز میں میرے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی آواز باریک تھی۔ زبان بھی مختلف تھی جس سے میں نا بلد تھا۔ وہ میرے بارے میں بتا کر دوبارہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ تب سردار مجھے پہلے سے بھی زیادہ تیز اور درشت نظروں سے گھورنے لگا۔ اب تو اس کے چہرے پر بھی مجھے قہر و غضبناکی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا ان کی مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ان کی بولی نہ میں سمجھ پا رہا تھا اور نہ ہی وہ میری زبان سمجھ رہے تھے۔

تب پھر سردار نے کچھ کہا۔ فوراً ایک شخص نمودار ہوا۔ میں اسے دیکھ کر چونک

پڑا۔ اس نے اپنے کاندھے پر ایک بہت ہی ضعیف شخص کو اٹھا رکھا تھا۔ اس کے ٹکونے چہرے اور برہنہ جسم میں لاتعداد جھریوں کا جیسے جال سا پھیلا ہوا تھا۔

سردار نے اپنی عجیب زبان میں اس بوڑھے سے کچھ کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بوڑھے سے مخاطب ہوتے وقت سردار کا لہجہ قدرے احترام لئے ہوئے تھا۔ سردار کی بات سن کر بوڑھے نے دھیرے سے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے چند ثانیے میری طرف بغور دیکھا۔ پھر جب وہ مجھ سے مخاطب ہونے کیلئے بولا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ میری زبان میں بات کر رہا تھا۔

”تم نے ہماری دنیا میں آنے کی جرأت کیسے کی ہے؟“

”میں ایک شیطان کا خاتمہ کرنے یہاں آیا ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”شیطان کا خاتمہ کرتا؟“ وہ الجھن آمیز انداز میں ہولے سے بڑبڑایا۔

”کس شیطان کی بات کر رہے ہو تم؟“ بوڑھے مجھ بولنے پوچھا۔

”اس شیطان کا نام جگدوش ہے۔“ میں نے جواباً کہا تو وہ عجیب الخلق بوڑھا چونک کر میرا چہرہ نکلنے لگا۔ پھر اپنی چندنی چندنی آنکھیں سکیڑ کر بولا۔

”کیوں..... تم اسے کیوں مارنا چاہتے ہو؟“ اس نے باریک آواز میں پوچھا۔

”وہ ہماری دنیا کی ایک لڑکی کو یہاں اٹھا لایا ہے۔“

”وہ لڑکی تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”وہ..... وہ..... میں اسے پسند کرتا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا میں۔“ میں نے بتایا تو وہ چند ثانیے اسرار بھری خاموشی سے مجھے نکتا رہا۔ پھر اس کے بعد اس نے قریب کھڑے سردار کو اپنی اور میری گفتگو کے بارے میں اپنی زبان میں بتایا تو میں نے دیکھا سردار کو جیسے ایک جھٹکا لگا اور پھر سے میری طرف عجیب سی نظروں سے نکلنے لگا۔ اس کے چہرے سے درشتی اب غائب ہونے لگی تھی اور اس کی جگہ الجھن آمیز سوچ نے لے لی۔ پھر اس نے اس بوڑھے ضعیف سے اپنی بولی میں کچھ کہا تو بوڑھا مجھ

ذرا دیر گزری تھی کہ دو منحنی سے انسان اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے مٹی کے عجیب و غریب برتن اٹھا رکھے تھے۔ ان میں آب خورہ بھی تھا۔ شاید میرے لئے کچھ کھانے کو لائے تھے وہ انہوں نے خاموشی سے میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے عجیب و غریب مٹی کے برتنوں کی طرف دیکھا۔ آب خورہ پانی سے لبا لب بھرا ہوا تھا۔ پانی کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ باقی شکم سیری کیلئے دیگر برتنوں میں عجیب عجیب سے پھل اور بھنے ہوئے گوشت کے پارچے رکھے ہوئے تھے۔ میری بھوک دوچند ہو گئی۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ گوشت بڑا لذیذ تھا اور کسی پہاڑی چوپائے کا لگ رہا تھا۔ میں نے پھل بھی کھائے۔ اس کے بعد پانی پیا۔ وہ دونوں نووارد میرے آگے سے خالی برتن اٹھا کر خاموشی سے واپس لوٹ گئے۔ شکم سیری کے بعد میں اپنے بدن میں طاقت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ان عجیب الحقت انسانوں کے دوستانہ رویے سے میرے دل کو کافی ڈھارس بندھ گئی تھی ورنہ تو میں ڈر گیا تھا کہ نجانے یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ مگر اب یہ لوگ میری مدد کرنے کے خواہاں تھے اس لئے میں بھی خوش تھا۔ کھانا وغیرہ کھا چکنے کے بعد بوڑھے نے مجھ سے کہا۔

”اللہ تمہارے کسی دیوتا کا نام ہے۔“ میں جواباً مسکرا کر بولا۔

”میرا اللہ دیوتاؤں کا بھی دیوتا ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے اور پوری دنیا اور کائنات کا مالک ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو ہمیں یقین ہے کہ تم اس ساحر جگدوش کو ضرور ہلاک کر ڈالو گے۔“ بوڑھے نے کہا اب اس کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ وہ مزید بولا۔

”دراصل اس خالماً ساحر نے ہمیں بھی تنگ کر رکھا ہے اور اس بد بخت نے ہمارے سردار کے بیٹے روکش کو بھی مار ڈالا ہے اس لئے ہمارا سردار بھی اس سے انتقام لینا چاہتا ہے مگر ہم کمزور ہیں۔ اس سے جنگ نہیں کر سکتے..... لیکن میں تمہیں اس کی بدنگری تک پہنچا سکتا ہوں۔“ اس کہہ کر وہ لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔

”لیکن اس کی بدنگری یہاں سے میلوں دور ہے۔ میں تمہارے وہاں تک پہنچنے کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اپنی زبان میں اپنے قریب کھڑے ان خدام

سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جس شیطان جگدوش کی تم بات کر رہے ہو وہ تو بہت بڑا ساحر ہے۔ تم بھلا اس سے کس طرح مقابلہ کرو گے؟“

”میرے پاس اللہ کی طاقت ہے اور مجھے یقین ہے میں اس کی طاقت کے بل بوتے پر اس مردود و ساحر جگدوش کا خاتمہ کر کے رہوں گا۔“ میں نے پر عزم جوش سے کہا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”نہیں..... مگر مجھے یقین ہے کہ میں اسے تلاش کر لوں گا۔ وہ اس دنیا کا باسی

ہے۔“

بوڑھے نے میری بات سن کر اپنے سردار تک پہنچا دی۔ سردار کے چہرے پر تحسین آمیز تاثرات ابھرے اور پھر اس نے اپنی زبان میں بوڑھے سے کچھ کہا تو وہ مجھ سے بولا۔

”ٹھیک ہے..... اگر ہم تمہیں جگدوش ساحر کی بدنگری تک پہنچا دیں تو تم

ہماری یہ مدد قبول کر لو گے؟“

میں اس کی بات سن کر خوشی اور ممنون بھرے لہجے میں بولا۔

”میں تم لوگوں کا احسان مند رہوں گا۔“

”تو ٹھیک ہے پھر..... تم میرے ساتھ آؤ۔“ بوڑھے نے کہا اور اس کے بعد

وہ جس انسان کے کاندھے پر سوار تھا اس نے اس سے کچھ کہا تو وہ ایک طرف چل پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا باقی سب لوگ اپنی جگہ جہاں کے تہاں کھڑے ہمیں ایک طرف جاتا دیکھتے رہے۔ خاصی دور تک چلتے رہنے کے بعد ایک کھوہ نظر آئی۔ وہ شخص بوڑھے کو لئے اس میں داخل ہو گیا۔ میں بھی حیران و پریشان اس کے عقب میں کھوہ کے اندر داخل ہو گیا۔ کھوہ اندر سے کافی کشادہ تھی اور آس پاس جانے کیا کیا الابلا بکھرا ہوا تھا۔ بوڑھے نے مجھے پتھر لے فرش پر بیٹھنے کو کہا اور خود بھی اس انسان کے کندھے سے اتر آیا اور فرش پر آلتی پالتی ناز کر بیٹھ گیا۔



سے جس کے سہارے اپنی آمدورفت رکھتا تھا بولا تو وہ بولے سے اپنے سر اٹھا کر کھوہ سے باہر نکل گئے۔ پھر ذرا ہی دیر میں اس نے نہایت مؤدبانہ انداز میں اسے مختصراً کچھ کہا اور پھر بوڑھے نے اسے شاید بیٹھنے کو کہا تھا۔ خدام نے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اسے پھر دوبارہ اپنے کاندھے پر سوار کر لیا اور بوڑھے نے مجھے باہر نکلنے کو کہا۔

جب ہم کھوہ سے باہر نکلے تو سامنے میری نگاہ پڑتے ہی میں بری طرح ٹھٹھک گیا اور میری آنکھیں حیرت و خوف سے پھیل گئی۔ سامنے ایک عجیب و غریب جھپکلا موجود تھا جو تقریباً سات آٹھ فٹ لمبا تھا اور محض ایک فٹ اونچا مگر پورے تین فٹ چوڑا تھا۔ اس کی جلد بہت موٹی اور کھردری تھی۔ ایک چھوٹا سا کوہان بھی تھا۔

”تم اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔ یہ تمہیں اس جگہ دش سحر کی بدنگری تک پہنچا دے گا۔“ بوڑھے نے مجھ سے کہا۔

”پشت پر.....م.....میں..... اس پر۔“ میں نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔

”ہاں! ڈرو نہیں۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“ بوڑھے نے کہا۔ اس کے بعد اس نے مجھے ایک سان بھی دیا۔ میں ڈرتے ڈرتے جھپکے کی پشت پر کوہان سے چٹ کر بیٹھ گیا اور پھر جھپکے نے دھیرے دھیرے ریٹکنا شروع کر دیا۔ میں اس کی کچھوے جیسی رفتار پر پریشان سا ہو گیا۔ میں سوچنے لگا آخر اتنی ست چال کے ساتھ یہ مجھے کس طرح منزل تک پہنچائے گا؟ مگر جیسے ہی جھپکلا چٹیل میدان پر پہنچا اس نے سر پٹ دوڑنا شروع کر دیا اور میں ایک ہاتھ سے سان سنبھالے دوسرے سے بمشکل اس کا کوہان تھامے اس سے چٹنا رہا۔ میدان طے کرنے کے بعد جھپکلا ڈرار کا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا مگر منزل تک پہنچنے کی آرزو نے اس تکلیف کو دبا دیا تھا۔ سامنے پہاڑیاں تھیں۔ جھپکلا ایک بلند پہاڑی پر بڑے آرام سے چڑھنے لگا حتیٰ کہ وہ چوٹی پر پہنچ گیا۔ یہ وادی کا اختتام تھا۔ سامنے گھٹا جنگل تھا اور اس کے درمیان ایک نہر سی جاری تھی۔

ماحول رفتہ رفتہ تاریک ہونے لگا تھا۔ میں نے اس زیر زمین دنیا میں یہی ایک بات محسوس کی تھی کہ یہاں دن کا اجالا کم کم اور اندھیا رازیاہ اترتا تھا یعنی شام اور رات کا سماں یہاں زیادہ دیر تک قائم رہتا تھا۔ جھپکے نے اب تیزی سے جنگل کی طرف بڑھنا

شروع کر دیا۔ پھر نہر کے قریب پہنچ کر وہ کنارے سے ٹکا پانی کی سطح میں اپنا بدہیت تھوٹنا ڈال کر لپ لپ کر کے پانی پینے لگا۔ میں بھی اس کی پھلکے دار کھردری پشت سے اتر آیا۔ پھر سان زمین پر رکھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی اوک بنا کر خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پانی بہت شفاف اور میٹھا تھا۔ اس کے بعد میں کھڑا ہو کر سامنے گھنے جنگل کی طرف آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگا۔ یوں تو شام ہو چکی تھی مگر جنگل میں لگتا تھا جیسے رات اتر آئی ہو۔ وہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ نہر بل کھاتی ہوئی جنگل میں کہیں گم ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ کنارے کنارے ایک کچا راستہ بھی چلا جا رہا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ادھر ہی نہر کے کنارے جنگل کے سرے پر رات گزار دوں اور دن کا اجالا پھیلے ہی آگے کا سفر اختیار کروں مگر پھر جانے کیا سوچ کر میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا اور دوبارہ سان سنبھالے جھپکے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ میرے سوار ہوتے ہی جھپکے نے ریٹکنا شروع کر دیا۔ میں نے دھیرے سے اس کی موٹی والی گردن پر سان چھوئی تو وہ دوڑنے لگا۔ نہر کے کنارے کنارے تاریک گھٹا ٹوپ جنگل میں میرا سفر شروع ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

میری کنپیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ سان میں نے مضبوطی سے تمام لیا اور سامنے روشنی کی طرف آنکھیں پھاڑے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ جھپکلا بھی شاید اس روشنی کو دیکھ کر اچانک رک گیا تھا کہ آگے بڑھنے سے انکاری تھا۔ میں نے سنا تھا کہ جن بھوتوں کا احساس جانوروں کو انسانوں کی بہ نسبت جلدی ہو جاتا ہے اور وہ بے چینی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ میں بدستور جھپکے کی پیٹھ پر سوار تھا۔ جھپکلا بھی بے چین اور بدحواس سا نظر آنے لگا۔

”چمن چمن..... چھنا چمن..... چمن چمن..... چھنا چمن۔“ کی پراسرار آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ جھپکلا شاید مارے خوف کے سمٹنے لگا تھا اور اس نے دیرے دیرے الٹی طرف ریٹنا شروع کر دیا۔ تب پھر اچانک جھپکے نے ایک پھنکارنا چیخ ماری اور ایک جھپکے سے مڑا۔ میں اس کے اچانک کا یا کلب کیلئے تیار نہ تھا اس لئے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور جھپکے کی پیٹھ سے نیچے آ رہا۔ جھپکلا مجھے گرتا چھوڑ کر واپس بھاگ گیا اور تاریکی میں گم ہو گیا۔

میرا دل مارے خوف کے سائیں سائیں کرتے کنپیوں پر دھڑکنے لگا۔ میں نے سان سنبھالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میری متوحش نظریں سامنے روشنی پر جمع ہو کر رہ گئی تھیں۔ جواب میرے خاصے قریب آ چکی تھی۔ میرا پورا وجود خوف و دہشت سے کپکپا رہا تھا۔ جانے یہ پراسرار روشنی کیسی تھی اور کیا بلا تھی کہ جھپکلا اسے دیکھ یا پہچان کر واپس سر ہٹ ڈکی لگا گیا تھا۔ پھر جب روشنی میرے ذرا قریب آئی تو میں نے دیکھا روشنی ایک عجیب سی لائین نمائش کی تھی جس کی پیلی اور مدہم سی روشنی میں مجھے ایک انسان کا عجیب جھکا جھکا سا وجود نظر آیا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گیا۔ میرا دل کنپیوں پر دھڑکنے اور آپوں آپ سانس پھولنے لگیں۔ تاریکی کی دبیز چادر میں ملفوف اس انسان کے خط و خال واضح نہیں ہو رہے تھے۔ لائین کی لوبھی کافی مدہم تھی۔ پھر میں نے دیکھا اس کا لائین والا ہاتھ دیرے دیرے اوپر اٹھنے لگا۔ وہ واقعی ایک انسان تھا۔ خاصا لمبا ترنگا۔ اس کے شانے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ جب لائین اس نے تھوڑی اور اوپر کی تو مارے دہشت کے میری چیخ نکل گئی۔ اس بھیا تک منظر کو دیکھ کر میرے روکنے

جنگل بہت تاریک اور گنجان تھا۔ عجیب و غریب وضع کے آہنی رنگت والے پٹر بہت ہی پراسرار محسوس ہو رہے تھے۔ ایک ایک درخت کی درجنوں سبز دار شاخیں تھیں اور وہ سب باہم مل کر جنگل کو مزید گھنا اور تاریک بنائے ہوئے تھیں۔ درختوں کے سبز بھی غیر معمولی چوڑے اور موٹے تھے۔ مجھے تو اپنے آس پاس گھور تاریکی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ جھپکلا بڑے آرام سے دوڑے جا رہا تھا۔ جنگل کے وحشت ناک ماحول سے مجھے اب خوف سا آنے لگا تھا۔ دل میں پچھتاوا بھی سرا بھارنے لگا کہ کاش میں دن کے اجالے میں اپنے باقی سفر کی ابتدا کرتا مگر اب میں واپس لوٹنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ پھر بابا کمال شاہ کے تعویذ کا خیال آتے ہی مجھے کافی حوصلہ محسوس ہوا۔

یہ خوفناک جنگل نجانے کتنا طویل تھا میں نہیں جانتا تھا؟ تاہم مجھے امید تھی کہ میں اسے صبح ہونے تک پار کر لوں گا۔

اچانک جھپکلا دوڑتے دوڑتے رک گیا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ بے زبان تھا۔ میں اس سے یوں اچانک رکنے کی وجہ کیسے پوچھتا تاہم میں نے جب اس کی گردن پر سان کی نوک چھوئی تو پھر بھی وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ مجھے پریشانی ستانے لگی۔ نجانے یہ کیوں رک گیا تھا۔ میں نے دوبارہ ذرا زور سے انی چھوئی تو وہ میری طرف گردن موڑ کر خرائے دار غراہٹ کے ساتھ پھنکارا۔ میں ڈر کر سہم گیا کہیں یہ غصے میں مجھ پر ہی حملہ نہ کر دے۔ دفعتاً مجھے سامنے دور روشنی سی چمکتی نظر آئی۔ میرا دل بری طرح خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ پھر دفعتاً ایک آواز ابھری۔

”چمن..... چمن..... چھنا چمن..... چمن چمن..... چھنا چمن۔“  
یہ جھانچھریوں کی آواز پر جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا۔ خوف سے

”آؤ..... میرے ساتھ.....“ اتنا کہہ کر وہ جانے کیلئے پوری بے نیازی سے پلٹا جیسے اسے مجھ سے اپنے حکم کی تعمیل کا پورا یقین ہو۔ بے اختیار پھر میرے پاؤں اس کے پیچھے اٹھتے چلے گئے۔ میں خاموشی سے اس پر اسرار سرکے انسان کے پیچھے چلنے لگا۔ آنہوی پیڑوں اور خاکستر سوکھی شاخوں والے گنجان درختوں کے اس تاریک

جنگل میں آگے پیچھے ہم دونوں بڑھے چلے جا رہے تھے۔ میں اس کے ہاتھ میں پکڑی لائین نما روشنی میں عقب میں چلتا جا رہا تھا۔ خاصی دیر تک چلنے کے بعد مجھے سامنے ان گنت ٹھناتی روشنیاں نظر آئیں۔ قریب پہنچے تو میں ٹھک گیا۔ یہ ایک آبادی تھی جہاں جا بجا سرکنڈوں کی چھپر نما مڑھیاں (جھونپڑیاں) بھی نظر آ رہی تھیں مگر میرے چونکنے کی اصل وجہ کچھ اور تھی وہ یہ کہ وہاں مجھے ہر عمر کے جتنے بھی لوگ نظر آ رہے تھے ان سب کے ہی سر دھڑوں سے غائب تھے مگر وہ یوں ادھر ادھر آ جا رہے تھے جیسے سب دیکھ رہے ہوں۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ یہاں تو جیسے دن کا سماں تھا۔ خشک جھاڑیوں کے موٹو اور گٹھے قد یلوں کی طرح جل رہے تھے۔ ان میں عورتیں، مرد بچے سبھی تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ سب میری طرف رخ پھیر کر اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے مجھے غیر مرئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ میں نے ان سب کی محویت کا اندازہ لگاتے ہوئے سوچا کہ اگر ان بدنصیبوں کے سر ہوتے تو یقیناً ان کی آنکھوں میں استعجاب نمایاں ہوتا۔

ان میں سے ایک عمر رسیدہ سرکنے نے عجیب سی بولی میں میرے ساتھ آئے ہوئے سرکنے کو مخاطب کر کے اس سے میرے بارے میں ہی شاید کچھ پوچھا جس کے جواب میں پہلے والے سرکنے نے بھی اس اجنبی بولی میں ادھیڑ عمر سرکنے کو میرے بارے میں بتایا۔ اس کے یہ بتانے کی دیر تھی کہ وہاں کھڑے سرکنوں نے خوشی سے اچھلنا کودنا شروع کر دیا اور بہترے تو نعرے بھی بلند کرنے لگے تھے۔ میں ان سرکنوں کی ہستی میں خود کو مضحکہ خیز محسوس کر رہا تھا اور بری طرح شیشا بھی رہا تھا۔ ساتھ ہی پریشان بھی ہو رہا تھا کہ میں اپنی منزل سے بھی بھٹک گیا تھا۔ اچھا بھلا مجھے عجیب و غریب دیو قامت چھپکھلا اس خبیث شیطان جگدوش کی کمین گاہ یعنی اس پر اسرار کھنڈر کی طرف لے جا رہا تھا مگر اس کم بخت سرکنے کے بچ میں فک پڑنے پر سارا سفر دھرا کا دھرا

کھڑے ہو گئے تھے۔ پورا وجود جبر جبرانے لگا اور میرا رواں رواں کا پنپنے لگا۔ میری جگہ اگر کوئی اور یہ دہشت ناک منظر دیکھتا تو اس کی تاب لائے بغیر اس نے بیہوش ہو جانا تھا۔ اس کا سر چوڑے شانوں سے غائب تھا۔ وہ سرکٹا انسان تھا۔

☆.....☆.....☆

میں اس قدر دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ مجھے آیت کریمہ کا ورد بھی کرنا بھول گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے خوف اور کچکی پر بمشکل قابو پایا۔ اس کی وجہ یہ تھی شاید کہ اس سرکنے نے انسان کی طرف سے ابھی تک کوئی جارحانہ حرکت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایسے ہی خاموش لائین اونچی کیے اس طرح کھڑا تھا جیسے مجھے دیکھ رہا ہو۔ پھر چکراتی ہوئی سرگرداں سی آواز ابھری۔

”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ میں اس آواز پر چونکا۔ یہ آواز یقیناً اس سرکنے انسان کی تھی مگر میں اس کا مزید نہ دیکھ سکا تاہم مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور میں نے پھسلی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ت..... تم کون ہو..... تمہارا سر؟“ میں آگے نہ کہہ پایا۔

وہ بولا۔ ”تم میرے ساتھ چلو۔ تمہیں سب معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں۔“

”مم..... مگر..... میں..... ت..... تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں۔ مجھے تو..... ت..... تم سے خوف آ رہا ہے۔“ میں نے کلفت زدہ لہجے میں کہا۔ پھر آواز ابھری۔

”میں نے کہا ناں۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تو اب تک تم زندہ میرے سامنے نہیں کھڑے ہوتے۔ ہمیں دراصل تمہارے جیسے انسان کی مدد کی ضرورت ہے۔“ میں اس کی بات پر ذرا چونکا۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے میری مدد کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ اس کے ”ہم“ کے صیغہ پر بھی میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کیا اس کا اور بھی سر بریدہ ساتھی ہے؟ میں نے جبر جبراکر سوچا۔

بستی کی جنگجو فوج کا سپہ سالار ہوں اور یہ جو سامنے جس ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ رہے ہو۔ یہ ہمارا بڑا سالار ہے۔ اس کا نام غرنافر ہے۔ باقی دو محافظ ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہماری بستی میں ایک غیر قبیلے کے چار افراد آئے۔ وہ ہمارے بڑے سالار غرنافر سے ملنا چاہتے تھے۔ انہوں نے شاید کوئی خاص بات کرنا تھی۔ انہیں ہم نے عزت و احترام کے ساتھ بٹھایا اور ان سے آنے کا مقصد پوچھا۔ اس وقت مہمان جھونپڑے میں صرف میں اور بڑے سالار غرنافر موجود تھے۔ یہ انہی چاروں کا مطالبہ تھا کہ وہ صرف بڑے سالار اور سپہ سالار یعنی میرے سامنے ہی اپنے آنے کا مقصد بیان کرنا چاہتے تھے۔ بہر طور ہم نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا تھا۔ تب انہوں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ آرتاش قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو قریب ہی سرہنگل پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ایک جادوگر وید نے پیشگوئی کی ہے کہ عنقریب ارضی دیوتا شمعون اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے والا ہے اور ہماری زمین میں دراڑیں ڈال کر ہم سب کو اس کے اندر زندہ دفن کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ناراضگی دور اور اسے خوش کرنے کیلئے ہمارے جادوگر وید نے یہ حل بتایا ہے کہ اگر اسے چالیس ایسے انسانوں کی قربانی دی جائے جو آبی دیوتا کے پیروکار ہوں تو یہ بلا ہم سب کے سر سے نکل سکتی ہے۔ میں اور سردار غرنافر ان کی بات سن کر نہ صرف چونک پڑے بلکہ مجھے ان کی بات سن کر غصہ بھی آیا کیونکہ ہم ہی آبی دیوتا کے پیروکار تھے لیکن ہمیں ان کی یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ آخر ان کے روحانی پیشوا نے ارضی دیوتا پر قربان کرنے کیلئے ہمارے ہی قبیلے کے چالیس لوگوں کا کیوں انتخاب کیا تھا۔ ہمیں سازش کی بو آ رہی تھی۔ سردار غرنافر نے درشت لہجے میں ان سے کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی آفت تم لوگوں پر اور اسے دور کرنے کی بھیٹ ہم دیں۔“  
ان میں سے ایک نے کہا۔ ”یہی ضروری ہے ورنہ ہمارے ساتھ تمہارے قبیلے کا بھی نام و نشان مٹ جائے گا۔“  
”ٹھیک ہے اگر یہ بات ہے تو ایسا کیوں نہ کر لیں کہ ہمیں افراد تمہارے قبیلے کے ہوں اور ہمیں ہمارے قبیلے کے۔“

رہ گیا تھا۔

بہر طور مجھے ایک جھونپڑے کے اندر لایا گیا۔ وہاں مجھے کسی جانور کے بھنے ہوئے گوشت کے پارچے کھانے کو دیئے گئے اور ایک مٹی کے آب خورے میں بیٹھا مشروب تھا۔

وہ سرکٹا جو میری زبان جانتا تھا میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ عمر رسیدہ سرکٹا اور دو ان کے اور ساتھی بھی میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے انداز و اطوار میں جارحانہ پن کے بجائے احترام تھا۔ پھر میرے ہم زبان سرکٹے نے مجھے مخاطب کر کے سوال کیا۔

”اے اچھے انسان! تو پہلے اپنے بارے میں بتا۔ تو یہاں ہماری دنیا میں کیسے آ پھنسا۔“

میں نے کچھ سوچا کہ شاید انہیں حقیقت بتا ہی دوں ہو سکتا ہے یہ لوگ جگدوش کی بدگیری تک پہنچانے میں میری کوئی رہنمائی کر سکیں چنانچہ میں نے انہیں جگدوش کے بارے میں اور اپنے مقصد کے بارے میں بھی تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ وہ سن ہو کر میری کتھا سننے میں محو تھے۔

”جگدوش کو تو ہم نہیں جانتے کیونکہ ہماری یہ پاتال نگری ایسے جادوگروں اور بڑے بڑے ساحروں سے بھری پڑی ہے۔“ میرا ہم زبان سرکٹا بولا۔

”اب ہمیں ہی دیکھ لو۔ ہم بھی ایک ایسے ہی ساحر کے عتاب کا شکار ہوئے ہیں۔ ہمارے سر کاٹ کر لے گیا ہے۔ اگر جلد ہی ہمیں ہمارے سر نہ ملے تو ہم سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ کر عبرت ناک موت مارے جائیں گے۔“ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ میرا بھی دل پیچنے لگا۔

پھر میں نے پوچھا۔ ”مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ تم لوگوں کے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا ہے اور یہ کہ میں تم لوگوں کی کیا اور کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟“ میرے وضاحت طلب لہجے پر وہ چند ثانیے پر سوچ خاموشی کے بعد بولا۔

”سب سے پہلے میں تمہیں اپنا بتاتا ہوں۔ میرا نام آغروب ہے۔ میں اپنی

گز رے زمانوں کی باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔“ بلا خر میں نے بیزار ہو کر پوچھا۔

”آخر پھر میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔“

”تم اتاشی قبیلے کا مقابلہ کرو گے۔“ آغروب نے کہا۔

”مم..... میں..... بھلا تمہا اتنے بڑے قبیلے کا کس طرح مقابلہ کر سکتا ہوں۔“

میں نے بوکھلا کر کہا تو وہ بولا۔

”ہمارے جادو گروں نے یہی بتایا ہے کہ ہم سے اوپر بھی ایک دنیا آباد ہے

جو اپنے اندر بڑی زبردست روحانی طاقت رکھتی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے خدا کے ماننے

والے ہیں اور ان کا ہر ایک فرد اپنے اندر تنہا بڑی غیر معمولی طاقت رکھتا ہے۔ ایسا کوئی

انسان اگر اتاشی قبیلے والوں سے مقابلہ کرے تو وہ مجبور ہو کر ہمارے سر ہمیں واپس لوٹا

دیں گے۔“ وہ اپنی باتیں مکمل کر کے چپ ہو رہا۔

”لل..... لیکن پھر میں..... میں بھلا ایک اکیلا انسان..... اتنے بڑے جادوگر

قبیلے سے کیسے مقابلہ کروں گا؟“ میں نے حیرت آمیز پریشانی سے کہا۔

آغروب بولا۔ ”تم کو لو گے ان کا مقابلہ..... دیکھو تمہیں اپنے خدا کا واسطہ

ہماری مدد کرو۔“ وہ منت اور عجز سے بولا تو میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اچانک مجھے

اپنے دماغ میں ایک جھماکہ محسوس ہوا اور میں نے سوچا کیا خبر اللہ نے مجھے اسی لئے ہی

یہاں تک پہنچایا ہو کہ میں ان مصیبت زدہ پراسرار مخلوقات کی پریشانی دور کروں اور ہو

سکتا ہے کہ اس بہانے میرے مقصد کی بھی راہ آسان ہو جائے۔

اس تمام عرصے میں وہاں موجود اس کا سردار غرنافر اور اس کے دونوں محافظ

خاموش بیٹھے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری زبان نہیں جانتے تھے مگر گاہے بگاہے سپہ

سالار آغروب اپنی زبان میں انہیں کچھ نہ کچھ بتاتا جا رہا تھا۔ بہر طور میں نے یہ سوچنے

کے بعد ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور بلا خر بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں ان سے مقابلہ کرنے کی کوششیں کرتا ہوں مگر پھر بھی تم

لوگ میری اتنی رہنمائی تو کرو گے کہ میں کس طرح وہاں جاؤں اور کیسے اکیلا اتنے بڑے

قبیلے کا مقابلہ کروں؟“

”نہیں..... ایسی قربانی ضائع جائے گی۔“ انہوں نے انکار کیا تو سردار غرنافر

نے بھی ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ان کے خلاف سازش ہے اور قربانی سے بچنے

کا ذھونگ کیا ہے اتاشی قبیلے نے۔ ہم اسے نہیں مانیں گے۔ ہمارے سردار کی بات پر وہ

لوگ دھمکیوں پر اتر آئے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر ہمارا سردار صلح جو اور امن پسند انسان

ہے۔ اس نے بھی جنگ کرنے سے روک دیا۔ وہ چاروں ہمیں خطرناک نتائج کی

دھمکیاں دیتے ہوئے واپس چلے گئے۔

ہمیں اطمینان تھا کہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے کیونکہ یہ لوگ تعداد میں

ہمارے قبیلے سے آدھے بھی نہ تھے مگر ہمیں ان سے صرف ایک بات کا خطرہ تھا اور وہ یہ

کہ یہ لوگ جادو ٹونے کے ماہر تھے۔ اگرچہ ہمارے قبیلے میں بھی ساحر تھے مگر وہ اتنے

بڑے علوم کے ماہر نہ تھے۔ بلا خر وہی ہوا انہوں نے ہم سے براہ راست جنگ تو نہ لڑی

لیکن کچھ عرصے بعد ہمیں اپنے دم گھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے اور تب ہی ہم پر

انکشاف ہوا کہ ہمارے سر غائب کر دیئے گئے ہیں۔ یوں تو ہم سب کچھ دیکھ سکتے ہیں مگر

ہمیں سانس لینے میں دن بدن تنگی ہوتی جا رہی ہے۔ کئی لوگ تو دم گھٹنے سے مر بھی گئے

ہیں۔“ آغروب اتنا بتا کر چپ ہوا جیسا کہ مجھے اس کا سر نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کی

پھولی ہوئی سانسوں کی بازگشت مجھے صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہانپنے لگا تھا

جیسے میلوں کا سفر پیدل طے کر کے آیا ہو۔ میں نے پوچھا۔

”تو اس سے یہ بہتر نہ تھا کہ تم لوگ بجائے اس طرح سسک سسک کر مرنے

کے ان کی بات ہی کیوں نہیں مان لیتے۔“

”ہرگز نہیں۔ یہ بات ہماری غیرت کے خلاف جاتی ہے۔“ وہ بولا۔

”اگرچہ ہمارے قبیلے کے لوگوں نے خود کو رضا کارانہ بھینٹ چڑھنے کیلئے

پیش کیا مگر اس طرح ہمارے آبی دیوتا کی ناراضگی کا خطرہ تھا۔ وہ ہم پر طوفانی سیلاب

مسلط کر کے ہمارے پورے قبیلے کو غرق کر سکتا تھا۔“ میں اس کی عجیب و غریب باتیں سن

رہا تھا اور ششدر ہو رہا تھا۔ میں نے بے اختیار خدا سے دعا مانگی کہ ”یا اللہ! میں یہ کس

عجیب و غریب اور پراسرار سی نادیدہ دنیا میں پہنچ چکا ہوں جہاں اس مخیر العقول اور

”ہاں..... ہم اتنی مدد تو ضرور کر سکتے ہیں۔“ آغروب نے جواباً کہا۔  
 ”تم آج رات آرام کرو..... اپنی تھکن اتارو۔ تازہ دم ہو جاؤ۔ ہم جب تک  
 اپنے قبیلے کے ساحروں سے صلاح مشورہ اور کرتے ہیں۔ صبح تمہیں مزید تفصیل کے  
 ساتھ سب کچھ بتا دیا جائے گا۔“ میں نے اس کی بات پر خاموشی سے اپنا سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن میں سو کر اٹھا تو خود کو بالکل تازہ دم اور ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔  
 مجھے کھانے پینے کو اچھی اور مقوی خوراک دی گئی تھی۔ اس کے بعد آغروب اپنے سردار اور چند  
 لوگوں کے ساتھ میرے پاس آیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”ہم نے اتاشی قبیلے کی کمزوریوں کا پتہ چلا لیا ہے مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا  
 کہ ان کی ان کمزوریوں سے صرف تم ہی فائدہ اٹھا سکتے ہو اس لئے میں تمہیں بتاتا ہوں  
 کہ تم نے کس طرح اتاشی قبیلے والوں کا مقابلہ کرنا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر چند ثانیوں کیلئے  
 رکا۔ سر کٹا ہونے کی وجہ سے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے میں قاصر ہی تھا  
 تاہم میں خاموشی سے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کہنا شروع ہوا۔

”ہو سکتا ہے تمہیں شاید ان کے پورے قبیلے سے جنگ نہ لڑنی پڑے۔  
 دراصل ہم اپنے سروں کے چھن جانے کی وجہ سے اتاشی قبیلے کا مقابلہ کرنے سے قاصر  
 ہیں۔ اور وہ اپنی بات منوانے سے ہمیں جیسے ہی اپنے سر مل جائیں گے ہم دوبارہ مستعد  
 ہو جائیں گے اور اپنے بچاؤ کی اب تدبیر بھی کر لیں گے۔ تمہیں صرف اتنا ہی کرنا ہوگا  
 کہ اتاشیوں کے سب سے بڑے مربی جو اتاشی قبیلے کا بڑا ساحر بھی ہے اسے ہلاک کرنا  
 ہوگا کیونکہ اس نے ہی ہمارے سر غائب کر رکھے ہیں۔ اس کے مرتے ہی ہمارے سر  
 خود بخود ہمیں مل جائیں گے اور اتاشی قبیلہ کے لوگ بھی کمزور پڑ جائیں گے۔ پھر کبھی بھی  
 وہ اپنے سے کم طاقت والے قبیلے پر جارحیت کا خواب دیکھنے کی جرأت نہیں کریں  
 گے۔“

ذرا توقف کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ”میں اب تمہیں بتاؤں گا کہ تم کس طرح

آغروب نے مجھے بتایا تھا کہ اتاشیوں کا قبیلہ زیادہ دور نہ تھا۔ یہ میدان جو زیادہ طویل نہ تھا اس کے بعد اسی میدان رفتہ رفتہ بے آب و گیاہ صحرا میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ پھر اس کے بعد نخلستان شروع ہو جاتا جو بعد میں بتدریج گھٹنے جنگل میں تبدیل ہو جاتا۔ اس کے بعد پہاڑی سلسلہ آ جاتا جس کے عقب میں پوری وادی اتاشی قبیلے کی کین گاہ تھی۔ آغروب نے مجھے تاکید کی تھی کہ اتاشی قبیلے میں مجھے داخل ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی بلکہ جیسے ہی مجھے پہاڑی نظر آ جاتی مجھے اسے سر کرنے کے بجائے بائیں جانب مڑ جانا تھا اور پہاڑی کے متوازی تقریباً ڈیڑھ دو سو قدم چلتے رہنے کے بعد مجھے پہاڑی میں ایک چوڑی دراڑ نظر آ جاتی۔ پھر مجھے اس میں داخل ہو جانا تھا اور اس کے دوسری طرف مجھے اس اتاشی ساحر غاغون کا سنگی معبد نظر آ جاتا۔ آگے پھر اسے ہلاک کرنے کی حکمت عملی مجھے خود تیار کرنا تھی۔

چنانچہ میں آگے بڑھتا رہا۔ درمیانی رفتار سے چلتے رہنے کی وجہ سے مجھے ٹھکن کا احساس بھی کچھ زیادہ نہیں ہو رہا تھا۔ آغروب نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ یہ اگر اسی طرح درمیانی رفتار سے بھی چلتا رہوں تو اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہل منزل تک پہنچ جاؤں گا چنانچہ میں چلتا رہا۔ حتیٰ کہ اس پھیلنے میدان کی بھر بھری مٹی..... ریت میں تبدیل ہونے لگی اور پھر صحرا کی حدود شروع ہو گئی۔ میں ذرا سستانے کیلئے بیٹھ گیا۔ میرے چہار اطراف ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔ مجھے اپنے مقصد کے حصول کے سلسلے میں بے چینی سی ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں میں اس گورکھ دھندے میں الجھ کر اپنے اہم مقصد سے نہ بھٹک جاؤں مگر پر یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے اس نیک کام کے صلے میں مجھے اس خبیث شیطان جگدوش کے ٹھکانے کے بارے میں بھی کچھ مدد حاصل ہو جائے۔ گھر کا بھی خیال آ رہا تھا۔ یوں تو میں تایا اور تائی سے ناراض ہو کر مسجد میں رہنے لگا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ تایا مجھے لینے بھی آیا تھا مگر جب میں نے رانی کے سلسلے میں واشگاف انداز میں ان کی یہ خوش فہمی دور کی کہ میں اس سے کسی صورت بھی شادی نہیں کر سکتا تو وہ رکھائی کے ساتھ منہ موڑ کر واپس لوٹ گئے۔ پتہ نہیں وہ اب میری یوں اچانک گشددگی پر پریشان بھی ہو رہے ہوں گے یا نہیں۔ کہیں مجھے

اس اتاشی ساحر غاغون کو تلاش کرو گے اور کیسے اسے موت کے گھاٹ اتارو گے۔“  
..... وہ دیکھنے میں انتہائی ضعیف اور دبلا پتلا مگر اپنے قبیلے کا سب سے دراز قامت اور طویل العمر بوڑھا ہے۔ آبادی سے ذرا ہی دور ویران پہاڑی سلسلوں کے درمیان میں ایک معبد نما پتھر لے مینارے میں رہتا ہے۔ وہ رات کے درمیانی پہر میں سوتا ہے۔ سونے کیلئے اپنی روح ایک چمگاڑ میں منتقل کر کے اس پر کچھ پھونک کر معبد سے باہر چھوڑ دیتا ہے کیونکہ اس کی کمزوری ہی یہی ہے کہ وہ جب سو جائے تو اسے ایک عام بچہ بھی نیزہ یا سان مار کر سوتے میں اسے با آسانی ہلاک کر سکتا ہے اس لئے وہ اپنے بچاؤ کیلئے سونے سے پہلے ایک چمگاڑ پر خاص عمل پڑھ کر پھونک دیتا ہے اور پھر اس کی روح چمگاڑ میں منتقل ہوتے ہی وہ بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ چمگاڑ ساری رات جنگل میں بھٹکتی ہی رہتی ہے اور پھر پو پھٹنے سے ذرا ہی دیر پہلے دوبارہ معبد کے کسی بلند و بالا سنگی کے در پیچے سے اندر داخل ہو کر سوئے (مرے) ہوئے ساحر غاغون کے سینے سے چپک جاتی ہے اور پہلے سے کیے گئے عمل کے مطابق اس کی روح خود بخود چمگاڑ سے غاغون کے جسم میں حلول کر جاتی ہے۔“

”اب تمہارے پاس اسے ہلاک کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ غاغون کو کسی طرح لمحہ بھر کیلئے ہی سہی اس طرح نیند آ جائے اور وہ جب سو جائے تو اپنی سان اس کے سینے میں دل کے مقام پر اتار دی جائے یا پھر اس چمگاڑ کو مار ڈالا جائے جس کے اندر اس نے اپنی روح حلول کر رکھی ہے۔“ وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ میں نے دل میں اس غاغون کو دونوں میں سے ایک طریقے سے ہلاک کر کے ان بے چارے سرکٹوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر جب روانہ ہونے لگا تو انہوں نے مجھے ایک سان اور تیر کمان دیا۔ ساتھ ہی پندرہ تیروں کا ایک ترکش بھی تمہا دیا۔ میں اسی وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

مجھے سرکٹوں کے قبیلے والوں نے اچھی طرح راستہ سمجھا دیا تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا تھا۔ میرے سامنے لقمہ و دق میدان تھا۔ میں درمیانی رفتار سے چل رہا تھا۔

اپنی اس یکدم اور خود بخود بدلتی کیفیت پر حیران تھا حالانکہ میں اس سے بھی زیادہ آہستی اور خوفناک دیرانوں اور تاریک جنگلوں سے گزرا تھا مگر جانے کیوں اس جنگل سے گزرتے ہوئے آپوں آپ میرے اندر ہیبت ناک اترنے لگی جسے باوجود کوشش کے میں ذہن سے جھٹک نہ سکا۔ پھر میں چلتے چلتے رک گیا اور اپنی کیفیت پر ذرا غور کرنے لگا۔ آخر ایسا اچانک کیوں ہو رہا تھا۔ اس پر اسرار جنگل کے ماحول میں داخل ہوتے ہی کیوں میرا دل و دماغ ایک انجانے سے خوف میں جکڑنے لگا تھا۔ جب خوف رفتہ رفتہ میرے دل پر حاوی ہونے لگا تو میں پریشان ہو گیا اور تب پھر اچانک مجھے پیر کمالی شاہ کے تعویذ کا خیال آیا جسے میں نے دائیں بازو سے باندھ رکھا تھا۔ میں نے آستین اٹھا کر اسے چوما اور چند آہ کریمہ کا ورد کیا تو پھر جا کے کہیں میرے دل کا خوف کچھ کم ہوا مگر باوجود اس کے مجھے ہلکی سی گھبراہٹ ہو رہی تھی تاہم دوسرے ہی لمحے میں نے اللہ کا نام لے کر آگے قدم بڑھا دیئے۔ دفعتاً ایک کریمہ اور غیر انسانی چیخ ابھری اور گویا جنگل کے سرے سے لے کر دوسرے سرے تک گونجتی چلی گئی۔ میرا پورا وجود اس اچانک ابھرنے والی غیر انسانی ہیبت ناک چیخ پر لرز اٹھا۔ میں رک گیا۔ چیخ کی سمت میں نے نظریں گاڑی ہوئی تھیں مگر وہاں تاریک جھنڈوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ تب پھر مجھے مذکورہ جھاڑیوں میں ہلکی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اچانک میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ میں نے جلدی سے کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر سنان تان لیا اور نظریں بدستور جھاڑیوں پر مرکوز رہنے دیں۔ اگلے ہی لمحے سرسراہٹیں بڑھ گئیں پھر معاہی میں نے ایک جھجھرے سے عجیب الخلقیت جانور کو ایک چٹکھاڑ مارتے ہوئے نکلتے دیکھا۔ وہ رچھ نما جانور تھا۔ بہت قوی ہیکل اور بھاری بھر کم۔ اسکے جسم پر بال ہی بال تھے۔ آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ وہ اپنے چاروں ہاتھوں پیروں سے کسی بدست شکم سیر رچھ ہی کی طرح جھومتا جھامتا میری طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے خونخوار شکاری دانت اس کی لمبوتری اور بدہیت باجھوں سے جھانکتے ہوئے بڑے خوفناک نظر آ رہے تھے۔ میں فوراً سنان سنبھالے چوکس کھڑا ہو گیا۔ وہ جیسے ہی ڈولٹا ڈولٹا میرے قریب آیا میں نے سنان اس کے بالوں بھرے سیاہ پہلو میں گھونپ دی۔ اس کے حلق

واقعی انہوں نے رانی والے واقعہ کے بعد بھلا تو نہیں دیا ہو گا۔ میں ان کیلئے دعا ہی مانگ سکتا تھا۔ پھر مجھے چودھری نیاز وغیرہ کا بھی خیال آیا جسے ابھی تک مجھ پر شک تھا کہ میں نے ہی اس کے باپ چودھری عالم خان کا قتل کیا ہے۔ اگرچہ میں باعزت بری ہو گیا تھا اور رانی کو بھی شک کے فائدہ پر شہر کی عدالت نے بری کر دیا تھا مگر پھر بھی چودھری نیاز وغیرہ اسی ہٹ پر تلے بیٹھے تھے کہ میں ان کی یہ جھوٹی بات تسلیم کر لوں کہ میں نے ہی چودھری حشمت علی خان کے کہنے پر ان کے (چودھری نیاز کے) باپ چودھری عالم خان کا قتل کیا تھا۔ قانون نے تو مجھے باعزت بری کر دیا تھا لیکن چودھری نیاز نے تب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور بعد میں مجھے غیر قانونی طور پر بریغمال بنا کر اپنی بات منوانے کیلئے تشدد بھی کیا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ میں اس کے قبضے سے بھاگ نکلا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ان خیالات سے نجات حاصل کی اور پھر آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

یہ صحرا بھی بلا آخر اختتام پذیر ہوا اور پھر سامنے گھٹا جنگل نظر آنے لگا۔ فضا میں دن کا اجالا غروب ہونے لگا تھا اور اس کی جگہ رفتہ رفتہ اندھیاروں کے بھوت اتر رہے تھے۔ میں نے اپنے چلنے کی رفتار تیز کر دی۔

یہ گنجان جنگل عجیب و غریب درختوں، پھلوں، پودوں اور جنگلی بیلوں سے اٹا پڑا تھا۔ مجھے خود ان کے درمیان سے راستہ بنا کر آگے بڑھنا پڑنا پڑ رہا تھا۔ میں رات ہونے سے پہلے پہلے یہ جنگل عبور کر کے اس پہاڑی تک پہنچ جانا چاہتا تھا جس کی دوسری طرف اتاشی قبیلہ آباد تھا مگر آغروب کی ہدایت کے مطابق مجھے سو قدم پہاڑی کے متوازی آگے بڑھنا تھا۔

جنگل گھٹا اور گنجان ہونے کی وجہ سے اندھیرے کی زد میں تھا۔ میں اپنے طے شدہ راستے پر آگے چلا جا رہا تھا۔ سنان میرے ہاتھ میں تھی کمان میرے بائیں کاندھے پر انکی ہوئی تھی جبکہ تیروں سے بھرا ترکش میری پشت سے بندھا ہوا تھا۔ جنگل میں عجیب سی خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ میرے دل کو جانے کیوں انجانے خوف نے جکڑ لیا تھا۔ مجھ پر جنگل کے دیران اور خوفناک ماحول کی آہستی سراپیسگی طاری ہونے لگی۔ میں خود



سے خارج ہونے والی چنگھاڑ بڑی بھیاںک تھی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کے نوکیلے غم دار ناخون کا پنجہ چلایا جو میرے دائیں شانے کو گھائل کر گیا۔ میں دور جا گرا۔ سان میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اس کے پہلو سے خون بہنے لگا تھا۔ شکر تھا کہ مجھے اس کے خونی پنچے نے کچھ زیادہ گھائل نہ کیا تھا مگر پھر بھی مجھے اپنے زخم میں جلن آمیز ٹیسس اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے متوحش نظروں سے اس بد ہیئت مگر خوفناک عفریت کی طرف دیکھا تو وہ ایک بار پھر وحشیانہ انداز میں چیخا چنگھاڑتا ہوا میری طرف دوڑا چلا آنے لگا۔ سان میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا مگر میں نے پھرتی سے لینے لینے ہی کمان سنبھال پشت کی طرف بہ سرعت ہاتھ لے جا کر ترشش سے ایک تیر نکالا اور اسے چلے پر چڑھاتے ہی اس کے بد ہیئت شکاری دانتوں والے تھوٹھے کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر سنسنا ہوا نکلا اور بجائے اس کے تھوٹھے میں پیوست ہونے کے اس کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ اس نے پھر دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری۔ میں نے پھرتی سے دوسرا تیر چلے پر چڑھا دیا۔ اس بار میرا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ وہ سیدھا اس کے بد ہیئت تھوٹھے پر پیوست ہو گیا۔ اس بار پہلے سے زیادہ دہلا دینے والی اس کی چنگھاڑ نے مجھے بھی سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے تیسری بار تیر ترشش سے نکال کر چلے پر چڑھایا تو وہ وحشی درندہ لڑکھڑاتا ہوا گرا اور زمین بوس ہو گیا۔ اس کا بد ہیئت تھوٹھا خون آلود ہو گیا تھا۔ اس کا وجود اب دھیرے دھیرے ہانپتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے قدم بڑھا دیئے۔ میں تاریک جنگل سے اب جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ جانے اور کتنے خونی اور وحشی درندوں سے بھرا پڑا تھا یہ جنگل..... اس لئے اب میں ذرا تیز تیز چل رہا تھا۔ میں نے چلتے چلتے اپنا سان سنبھال لیا تھا۔ کافی آگے نکل آنے کے بعد اچانک مجھے جنگل کے خوفناک سناٹے میں کسی کے رونے کی آواز ابھری۔ میں اس آواز کو سن کر ٹھنک گیا اور چلتے چلتے یکدم رک گیا۔ میرے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ میں سرتاپا سماعت بن گیا تھا۔ وہ رونے کی آواز کسی عورت کی تھی۔ میں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور آواز کی سمت قدم اٹھا دیئے۔ رونے کی آواز سامنے کی طرف سے آرہی تھی۔ میں ذرا آگے پہنچا تو مجھے سامنے ایک دکھتا ہوا الاؤ نظر آیا۔ وہ ایک گڑھا تھا جس کے اندر

سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ اس جلتے دہکتے گڑھے سے چند قدموں کے فاصلے پر مجھے ایک جوان عورت نظر آئی۔ اس نے سو رو کا جنگلی لباس پہن رکھا تھا جو اس کے پر شباب بدن پر ناکافی نظر آ رہا تھا۔ جوان عورت کا رنگ تانبے کی طرح..... آگ کے شعلوں کی حدت سے دہک رہا تھا۔ اس عورت کے قریب ہی ایک دوسرا انسانی وجود بھی بے سدھ پڑا تھا۔ اس نے صرف پیٹ سے نیچے ستر پوشی کر رکھی تھی جو کسی جنگلی جانور کی کھال تھی۔ جانے یہ کیا پراسرار چکر تھا۔ میں وہیں جھاڑیوں کی تاریک آڑ میں دم سادھے پڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ جوان عورت ماتمی انداز میں نوحہ کناں تھی اور بار بار اپنے قریب دھرے بے سدھ وجود کو بھی سو گوار نظروں سے نکلے جا رہی تھی۔ وہ کسی مرد کا نیم برہنہ جسم تھا۔ شاید اس عورت کا خاوند ہی تھا مگر میں نے بغور دیکھا اس کا مرد زندہ تھا اور منہ کھولے ہوئے ہولے ہولے ہانپنے کے انداز میں سانس لے رہا تھا۔ پھر اچانک..... گڑھے کے بھڑکتے شعلے مزید بلند ہو گئے اور ان کی حدت بڑھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ان بھڑکتے شعلوں سے عجیب الخلقہ مخلوق کو نکلتے دیکھا۔ وہ کل چھ تھے۔ ان کی کمر پر کب نکلے ہوئے تھے۔ چہرے سوکھے اور لبوترے تھے ناک لمبی اور گدھ کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھیں۔ وہ سب سرہنہ تھے۔ ان کے جسموں پر برائے نام گوشت تھا بلکہ ان کے برائے نام گوشت پیوست سے ہڈیاں یوں صاف واضح تھیں جیسے یہ ڈھانچے ہوں۔ وہ سب گڑھے سے باہر نکل کر اس کے گرد وحشیانہ رقص کرنے لگے۔ وہ جوان عورت ان کو دیکھ کر بری طرح دہشت زدہ نظر آرہی تھی۔ مجھے شعلوں کے گرد ناچتی ہوئی یہ مخلوق جہنمی بلائیں نظر آرہی تھیں۔ وہ عورت انہیں دیکھتے ہی کئی قدم پیچھے سرک گئی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے..... ان چھ کی چھ جہنمی مخلوقوں نے زمین پر پڑے بے سدھ انسان کو اٹھایا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس وجود سمیت گڑھے میں چھلانگیں لگا دیں۔ جنگل میں ایک ہولناک چیخ ابھری۔ یہ شاید اس بد نصیب انسان کی آخری چیخ تھی جسے پکڑ کر جہنمی مخلوق آگ کے گڑھے کے اندر کود گئی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے میں نے اس جوان عورت کو دیوانہ وار آگ کے گڑھے کی طرف دوڑتے دیکھا۔ وہ شاید آگ میں چھلانگ لگانے والی تھی۔ میں جلدی سے تاریک جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور دیوانہ وار

کی خاطر دوڑنا شروع کر دیا۔ مگر میں نے دیکھا وہ جنگلی عورت بھی میرے عقب میں بدستور دوڑی چلی آ رہی ہے۔ ناچار میں رک گیا۔ وہ بھی میرے قریب آ گئی اور اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے اشارے سے اس اتاشی ساحر غاتمون کا حلیہ بنا کر بتایا کہ میں اسے قتل کرنے جا رہا ہوں۔ میرا اشارہ بھانپ کر یکدم اس کے حسین چہرے پر جوش انتقام کی سرخی نمودار آئی۔ اس نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے اشاروں سے بتایا کہ وہ بھی اس سے اپنے بد نصیب شوہر کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ میں نے اشاروں کی زبان میں اسے ساحر غاتمون کے معبد کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے یکدم تیز تیز قدموں سے ایک طرف کوچل پڑی اور میں اس کے عقب میں چلنے لگا۔ خاصی دیر بعد جنگل کا اختتام ہوا تو سامنے ایک اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا وہ پہاڑی کی متوازی سمت چلنے لگی۔ پھر ایک اندھیری دراڑ میں داخل ہو گئی۔ اس سنگلاخ اندھیری دراڑ میں داخل ہوتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ انتہائی نرم و ملائم تھا۔ میں اس کے گداز ہاتھ کی گرمی محسوس کرتا ہوا اندھیری سنگلاخ دراڑ میں چلنے لگا۔

☆.....☆.....☆

دوڑتا ہوا اس عورت سے لپٹ گیا۔ مجھے اسے پکڑنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ آگ کے اندر کود چکی ہوتی۔ میں اسے مضبوطی سے اپنی بانہوں کے حصار میں قابو کیے شعلہ فشاں گڑھے سے دور لے گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو مبہوت سی رہ گئی۔ پتہ نہیں وہ میری زبان سمجھتی بھی تھی یا نہیں لیکن میں نے اس سے کہا۔

”اے لڑکی! کون ہے تو..... ہوش میں آ..... کیوں اپنی جان کی دشمن بن رہی ہے؟“ میری بات سن کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر میں نے اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔ اس نے ایک افسردہ سی نگاہ گڑھے پر ڈالی اور ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ میری زبان نہیں سمجھتی تھی یقیناً پھر اس کی زبان میرے لئے اجنبی ہی ثابت ہوئی۔ اٹائے راہ گڑھے میں بھڑکتے ہوئے شعلے بتدریج سرد پڑنے لگے اور بالآخر بالکل ماند ہو کر بجھ گئے۔

لڑکی نے اجنبی زبان میں مجھ سے کچھ کہا۔ میں نے اشاروں کی بین الاقوامی بولی کا سہارا لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ وہ خاموشی سے بغور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کا پر شاب بدن میرے سامنے تھا مگر وہ اپنی نیم برہنگی سے بے نیاز مجھے نکتے جا رہا تھا۔ میں نے اشارے سے پوچھا یہ سارا کیا چکر تھا؟ اس نے دونوں ہاتھ کے مخصوص اشاروں سے مجھے بتایا کہ وہ بد نصیب نیم بے ہوش شخص اس کا شوہر تھا اور اسے اس کے قبیلے کے لوگوں نے آگ دیوتا کے خبیث پجاریوں کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ ان کے ایک بڑے ساحر نے کسی بڑی مصیبت سے بچنے کیلئے ایک انسان کی بھیٹ چڑھانے کیلئے کہا تھا۔ میں نے سوچا کہیں اس عورت کا تعلق اس بد بخت اتاشی قبیلے سے تو نہ تھا؟ مگر میں اس سے کس طرح پوچھتا؟ میں نے اسے اشاروں سے پوچھا کہ میں اسے اس کے قبیلے تک چھوڑ آؤں۔ اس نے بڑے نفرت انگیز انداز میں زور زور سے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ میں عجیب مصیبت کا شکار ہو گیا تھا بالآخر میں نے اسے وہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں ابھی ذرا چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں کسی کے آنے کا احساس ہوا۔ میں نے چلتے چلتے مڑ کر دیکھا تو ٹھک گیا۔ وہ عورت میرے ہی پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ میں نے رکنے کے بجائے اس سے جان چھڑانے

بڑھنے لگا اور بلا خر ذرا ہی دیر بعد میں معبد خانے کی بغلی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ میں چند ٹاپے دم سادھے وہیں چپکا کھڑا رہا اس کے بعد میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس چٹان گیر معبد پر بیت ناک سناٹوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ ہر سو اسرار بھری خاموشی کا راج تھا۔ میں نے ذرا سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ محرابی سنگی درہتچے بند تھے۔ معبد کی چوٹی پر چگاڑیں گھیریاں بھر رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ کم از کم ان کا نصف پہر گزر ہی چکا تھا ضرور غاغون ساحر اپنی روح چگاڑوں میں حلول کرنے کے بعد بے سدھ پڑا سو رہا ہو گا۔ آغروب کی ہدایت کے مطابق مجھے سوئے (مردہ) پڑے غاغون پر وار کرنے کے بجائے سپیدہ سحر نمودار ہونے سے پہلے اس چگاڑوں کا انتظار کرنا چاہیے تھا جو غاغون ساحر کے عمل کرنے کے مطابق ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ کر جیسے ہی غاغون کے بے سدھ وجود کے سینے سے چٹ جاتی ہے مجھے سان گھونپ کر اسے ہلاک کر ڈالتا تھا لہذا میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور بلا خر معبد کے سنگی دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے چوٹی پٹ کو اندر دھکیلا تو وہ کراہ آمیز چرچاہٹ کے ساتھ اندر کی طرف کھٹک چلا گیا۔ اندر دم م روشن میں مجھے ایک چکر دار سنگی زینہ اوپر جاتا نظر آیا۔ میں نے اندر قدم رکھ دیا۔ پھر آہستہ آہستہ زینے طے کرنے لگا۔ اوپر پہنچا تو خود کو ایک بڑے سے ہال میں کھڑے پایا۔ سامنے نگاہ پڑی تو بری طرح ٹھٹھک گیا کیا دیکھتا ہوں وسط میں ایک مستطیل سے پتھریلے چبوترے پر ایک لانا ترنگا سا کالا بھنگ ٹھنڈے پٹ کے بل دونوں ہاتھ سینے پر رکھے محو خواب تھا مگر نہیں وہ تو محض ایک لاش تھی۔ غاغون ساحر ابدی نیند میں مستغرق تھا۔ وہ ایک عمل تناخ کے ذریعے اپنی روح چگاڑوں کے اندر حلول کر کے لاش کی مثل بے سدھ لینا پڑا تھا۔ میں نے خاموشی سے گول کی چار دیواری والے ہال کا جائزہ لیا تو سوائے ایک درہتچے کے سب بند تھے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ درہتچہ چگاڑوں کے آنے جانے کیلئے ہی کھول رکھا تھا۔ گویا اب مجھے ادھر ہی کسی خفیہ گوشے میں چھپ کر اس چگاڑوں کا انتظار کرنا چاہیے تھا لہذا یہ سوچ کر میں ایک نسبتاً تاریک گوشے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

ایک ایک لمحہ بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا۔ میری ٹھٹھکی ہوئی نظریں درہتچے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے مقدور بھر تاریک خلا نظر آ رہا تھا۔ اب مجھے بے چینی سے سپیدہ سحر کے نمودار ہونے کا انتظار تھا۔ پھر جیسے ایک ایک پل صدیوں کی طرح

بل کھاتی ہوئی یہ دراڑ بہت تنگ و تاریک تھی۔ کئی بار مجھے چٹانی پتھروں سے ٹھوکریں بھی لگی تھیں اور میں گرتے گرتے بچا تھا مگر اس جانگلو عورت نے مجھے سنبھال لیا تھا۔ یہ چٹانی دراڑ خاص طویل ثابت ہو رہی تھی۔ خاصی دیر بعد دراڑ کا دم سم سرا دکھائی دیا۔ پھر ہم دراڑ کے اس نیم روشن سرے پر پہنچ کر ذرا رک گئے۔ سامنے دائیں جانب یہی پہاڑی سلسلہ قوس کی صورت میں کھارہا تھا۔ اس جگہ سے ذرا فاصلے پر مجھے ایک پہاڑی معبد خانہ نظر آ گیا جو زیادہ بڑا نہ تھا۔ وہ مینار کی شکل کا تھا اور اسے بڑی مہارت سے پہاڑی کے سنگلاخ عطن کو چیر کر بنایا گیا تھا۔ گویا اب یہ مینار نما معبد پہاڑی سے منسلک نظر آ رہا تھا۔ اس جنگلی نیم عریاں عورت نے مجھ سے سان چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے اسے گھور کر ہاتھ اس کا جھٹک دیا۔ وہ شاید اپنے شوہر کے قاتل (غاغون ساحر) کا ٹھکانہ دیکھ کر جوش انتقام سے مغلوب ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے صبر کی تلقین کی۔ پھر سر کٹے سپہ سالار آغروب کے کہنے کے مطابق میں نے اشارے سے اسے سمجھایا کہ غاغون ساحر کو ہلاک کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ جب تک وہ رات میں اپنی روح ایک چگاڑوں میں نہیں حلول کر لیتا تب تک ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ خاموش ہو گئی مگر حقیقت یہ تھی کہ مجھے اب اس عورت سے یہ دھڑکا لگ گیا تھا کہ کہیں یہ کم بخت اپنے جوش انتقام میں میرا کھیل ہی نہ بگاڑ دے چنانچہ میں نے اسے وہیں چھپے رہنے کی تلقین کی۔ وہ میرا اشارہ سمجھ کر نیم رضامندی والے انداز سے خاموش ہو گئی لیکن اس کے چہرے سے تردد صاف عیاں تھا۔ بہر کیف میں اسے وہیں چھوڑ کر پہاڑ کی پتھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ چپکا ہوا معبد کی طرف بڑھنے لگا۔ اندر سے میں گھبرا بھی رہا تھا اگر کہیں اس بد بخت غاغون ساحر کو مجھ پر ذرا بھی شک ہو گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اس لئے مجھے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں گرد پیش پر نگاہ رکھے محاط انداز سے آگے

جنونی حسینہ کو بازو سے پکڑ کر غاغون ساحر کے مردہ وجود سے علیحدہ کیا اور اشارے سے اسے فوراً یہاں سے نکل جانے کو کہا اور پھر میں اپنا تیر کمان اور سان سنبھالے اس جانگی عورت کا ہاتھ پکڑے زینے کی طرف دوڑا۔ معبد سے باہر آیا تو تیز اور طوفانی ہواؤں کے بھکڑ کے ساتھ کرہہ چیخیں بھی گونج رہی تھیں اور کر بناک انداز میں ماتمی شور بھی گونجنے لگا۔ میں ان شیطانی چیخوں کی پرواہ کیے بغیر اس جانگی عورت کا ساتھ پکڑے پہاڑی دراڑ کی طرف دوڑ پڑا مگر ہر دراڑ میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنے عقب میں لوگوں کا شور سنائی دیا۔ میں نے ٹھٹھک کر مڑ کر دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ ان لوگوں نے مشعلیں اور سان سنبھالے ہوئے تھے۔ یقیناً اتاشی قبیلے کے لوگ تھے جنہیں شاید اپنے عظیم ساحر کی موت کا پتہ لگ چکا تھا۔ اور اب اس خطرناک صورتحال میں ان کے ہتھے چڑھنے کا مطلب ہماری عبرتناک موت تھا۔ وہ عورت بھی دہشت زدہ سی تھی۔ میں اسے لے کر اندھیری دراڑ میں داخل ہو گیا اور بے تحاشا دوڑ لگا دی۔ جانگی عورت اب میرے ساتھ تھی۔

☆.....☆.....☆

ہم دونوں اب تاریک جنگل میں آگئے تھے مگر رک کے ہم پھر بھی نہیں تھے اور مسلسل تیز تیز قدموں سے دوڑے جا رہے تھے۔ وہ عورت بھی خاصی سخت جان تھی۔ کافی دور جانے کے بعد ہم دونوں ذرا سستانے کیلئے ایک جگہ رک گئے۔ جنگل کی تاریک فضا میں اب دن کی روشنی سی پھیلنے لگی تھی۔ وہ عورت میری طرف عجیب مسکون نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں میرے لئے تو صیف اور ممنون بھرے جذبات ہلکورے لے رہے تھے۔ وہ جیسے میرے ہاتھوں اپنے بدنصیب شوہر کے قاتل غاغون ساحر کے انجام پر بہت خوش تھی اور مطمئن بھی۔ اس کی آتش انتقام اب سرد ہو چکی تھی۔ پھر اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور اسے دیوانہ وار چومنے لگی۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے پر شاباب اور نیم عریاں بدن کی مہک نے میرے حواس مختل کرنا شروع کر دیئے۔ وہ شاید اپنے حسن و شاباب کا انعام مجھے دینا چاہتی تھی مگر میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھالا اور اسے بڑھ کر نرمی

گزرتے گزرتے گزر ہی گیا۔ محرابی درپچے سے باہر تاریک خلا اب رفتہ رفتہ ملگجا ہوتا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دن کی روشنی میں ڈھلنے لگا۔ میرے سینے میں دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں اور نگاہیں بدستور محرابی درپچے پر انک کر رہ گئی تھیں۔ اب کسی بھی لمحے وہ چگاڑ جو غاغون ساحر کو نیند سے بیدار کرنے کیلئے نمودار ہو سکتی تھی۔

پورے ماحول پر یکفخت عجیب سا سناٹا چھا گیا تھا۔ تب پھر اچانک ایک آہٹ پر میں ٹھٹھک سا گیا۔ مگر یہ آہٹ اس محرابی درپچے سے نہیں ابھری تھی جدھر میری نگاہیں گڑی ہوئی تھیں بلکہ یہ پراسرار آہٹ مجھے زینے کی طرف سے آتی سنائی دی تھی۔ میں نے جیسے ہی چونک کر زینے کی طرف دیکھا تو اسی لمحے مجھے درپچے کی طرف پھڑ پھڑاہٹ کی آواز سنائی دی تھی۔ زینے سے نگاہ ہٹا کر میں نے درپچے کی طرف دیکھا تو یکدم میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ایک چگاڑ زینے سے اندر داخل ہوئی پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مستطیل چبوترے پر غاغون ساحر کے دراز بے سدھ وجود کے سینے سے چٹ گیا۔ میں نے سان سنبھال لی۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا اور جیسے ہی سان سنبھالے اوٹ سے نکلا تو اچانک زینے کی طرف سے میں نے اس جانگی حسینہ کو دیکھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وہ جوش و غصے سے مغلوب الغضب ہو کر چبوترے پر پڑے غاغون ساحر کی طرف دوڑی اور میرے پہنچنے سے قبل ہی اس نے اس کے قریب پہنچ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ چگاڑ یکدم گھبرا کر پھڑ پھڑایا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس جانگی لڑکی کی نادانی سے اگر وہ چگاڑ واپس چلا جاتا تو میرے لئے مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ میں نے چگاڑ کو پھڑ پھڑا..... مار کر غاغون ساحر کے سینے سے الگ ہوتے دیکھا تو جلدی سے میں نے سان پھینک کر تیر کمان پکڑ لیا اور چلے پر تیر لگا کر اڑتے ہوئے چگاڑ کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ تیر لگتے ہی چگاڑ باریک سی چیخ نکال کر فرش پر آ پڑا۔ میں جلدی سے سان سنبھال کر تڑپتے ہوئے چگاڑ کی طرف بڑھا۔ پھر سان مار مار کر اسے چھلٹی کر دیا۔ اس کے مرتے ہی میں نے دیکھا چبوترے پر پڑے غاغون ساحر کا بے سدھ وجود بری طرح تڑپنے لگا اور بلا خرٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے اس

کے ساتھ خود سے الگ کر دیا۔ اس کے بعد اس کا گال تھپتھا کر میں آگے بڑھ گیا۔  
 آغروب کے قبیلے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں وہاں جشن کا سماں تھا۔ ان کے سر  
 اب ان کے دھڑوں پر نظر آنے لگے تھے۔ آغروب کو میں نے اس کے لباس سے پہچانا  
 تھا۔ وہ ایک خوب دھنسن تھا۔ وہ سب میرے شکر گزار تھے۔ پھر میں نے آغروب سے  
 جگہ دش کے بارے میں مدد چاہی۔ اگرچہ اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اس کے  
 بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا البتہ اس نے اس پر اسرار کھنڈر کے بارے میں صرف اتنا  
 بتایا کہ ایسا کھنڈر جنوب کی سمت پر واقع تو ہے مگر یہ علم نہ تھا کہ آیا یہ جگہ دش کی وہی  
 بدگمری ہے جدھر اس نے سوئی کو قید کر رکھا ہے تاہم میں اس کا شکریہ ادا کر کے نکل کھڑا  
 ہوا۔

اس نے مجھے بتایا کہ مجھے راستے میں ایک نیلے پانیوں کا سمندر پار کرنا پڑے  
 گا۔ مذکورہ سمت پر روانہ ہونے کیلئے مجھے ساحلی جنگلات سے کوئی ٹوٹا ہوا شہتیر بھی مل  
 جائے گا نیز سمندر زیادہ طویل نہیں ہوگا۔ بہر طور میں اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

دو دنوں اور ایک رات کی مسافت کے بعد میں بلا آخر اس نیلگوں پانی والے  
 سمندر کے ساحل پر کھڑا تھا۔ میرے عقب میں گھٹا جنگل اور سامنے سرکش موجوں کا  
 سمندر تھا۔ آغروب کا کہا درست ثابت ہوا تھا۔ یہاں متعدد ٹوٹے ہوئے درختوں کے  
 شہتیر جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ میں پہلے ہی سفر کی ٹکان سے نڈھال ہو چکا تھا اور  
 رات بھی ہونے لگی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا تھا کہ پاتال کی اس نادیدہ دنیا میں دن کا  
 سماں بہت تھوڑا اور رات کا عرصہ طویل ہوتا تھا اس لئے اب اندھیرا چار سو پھیلنے لگا۔  
 میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب دن کی روشنی ہوتے ہی کسی شہتیر کو پانی میں رکھنے کے بعد  
 ہی اپنے اگلے سمندری سفر پر روانہ ہونے کی کوشش کروں۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں وہیں  
 ساحلی ریت پر بیٹھ گیا۔ آغروب نے یہ مہربانی کی تھی کہ سفر پر روانہ ہوتے وقت مجھے  
 کھال سے بنی ایک بچی ساتھ کر دی تھی جس میں خشک بنے ہوئے گوشت کے پارچوں  
 کے علاوہ رس دار پھل اور پانی کی چھاگل تھی۔ میں وہ بچی کھول کر کھانے پینے میں  
 مصروف ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کا تاریک سناٹا چار سو پھیل چکا تھا۔ ساحل ویران تھا۔ عقب میں جنگل  
 خوفناک تاثر دے رہا تھا۔ دم بخود ماحول پر آسپی ویرانیوں کا راج تھا۔ ان ہیبت ناک  
 سناٹوں اور ویرانیوں کو دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا اس لئے میں یہی دعا  
 مانگ رہا تھا کہ جلدی سے دن کی روشنی کا آغاز ہو تو میں شہتیر پر سوار ہو کر اپنے سمندری  
 سفر پر جلد از جلد نکل جاؤں۔ میں نے اس مقصد کیلئے ایک بڑے سے شہتیر کا بھی  
 انتخاب کر لیا تھا اور ذرا دیر ستانے کے بعد میں اسے جنگل سے بڑی مشکلوں کے ساتھ  
 گھسیٹتا ہوا ساحل کے قریب لے آیا تھا حالانکہ میں کافی تھک چکا تھا لیکن دل میں  
 ابھرنے والے انجانے خوف کی وجہ سے مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی تاہم میں وہیں ریت  
 پر ہی لیٹ گیا اور سونے کی کوششیں کرنے لگا۔ ماحول پر ویسا ہی رقت انگیز اور ٹھنکا دینے  
 والا سماں طاری تھا۔ پر نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے کہ مصداق جانے کس پہر میری  
 آنکھ لگی اور میں سو گیا۔

اچانک میری آنکھ کھلی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ماحول پر وہی آسپی رات کا تاریک سناٹا چھایا ہوا تھا۔  
 میرا دل جانے کیوں خوف سے بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ مجھے اپنے اس طرح اچانک گہری  
 نیند سے جاگ پڑنے کی بظاہر کوئی وجہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے  
 گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری آنکھ کیوں کھلی تھی؟..... اس کی کوئی وجہ تھی..... کوئی  
 پر اسرار وجہ؟..... کوئی ایسی آہٹ..... کوئی ایسا کھڑکا..... ہوا تھا جو مجھے گہری نیند سے  
 یکدم جگانے کا باعث بنا تھا..... لیکن باوجود کوشش کے مجھے اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ  
 نہ آئی۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر نیند اب میری آنکھوں سے کوسوں دور جا  
 چکی تھی۔ میں نے ساحل پر سر پختی موجوں کی طرف دیکھا۔ پھر سر گھما کر عقب میں  
 تاریک جنگل کی طرف نظریں دوڑائیں۔ پورے جنگل پر پر آسب سکوت طاری تھا۔ پھر  
 اچانک مجھے جنگل کی طرف کچھ دھبے سے نظر آتے محسوس ہوئے اور اس کے ساتھ ہی  
 عجیب و غریب غیر انسانی آواز ابھری۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے فوراً تیر کمان

سنبھال لیا اور ممکنہ خطرے کے پیش نظر اس کے تھے ہوئے چلے پر تیر چڑھا دیا۔ دھبوں کی نقل و حرکت جاری تھی۔ مجھے اپنی بے ترتیب سانسوں کی بازگشت صاف سنائی دے رہی تھی۔ تب پھر اچانک میں نے ..... بیک وقت تین چار دھبوں کو جنگل سے نکل کر اپنی طرف دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔ میں بری طرح ٹھٹھک کر چوکس کھڑا ہو گیا۔ وہ دھبے درحقیقت رچھ کی طرح کے جانور تھے۔ وہ ذرا قریب آئے تو میں نے دیکھا ان کے بدہیت سیاہ تھو تھنوں سے دو لمبے لمبے خیم دار شکاری دانت جھانک رہے تھے۔ ان بھوکے اور خطرناک درندوں کی چندمی چندمی آنکھوں میں گرسنہ چمک رہی تھی۔ میں نے فوراً اپنے جھٹل پڑتے حواسوں کو یکجا کیا اور ایک رچھ نما درندے کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ کمان سے نکلا ہوا تیر سنسناتا تیر ایک درندے کے بدہیت سیاہ تھو تھنوں میں پیوست ہو گیا۔ اس نے دل دہلا دینے والی چٹکھاڑ ماری اور ریت پر گر کر ہانپنے لگا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دوسرا تیر چڑھا لیا اور اگلے جانور کا نشانہ لے کر چھوڑ دیا۔ تیر اس کے بالوں بھرے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ وہ بھی چٹکھاڑ مار کر زمین بوس ہو رہا۔ باقی دو رچھ میرے سر پر پہنچ گئے۔ میرے پاس تیرا تیر چڑھانے کا موقع اب بالکل نہیں بچا تھا۔ میں پریشان ہو گیا مگر میں نے حوصلہ نہیں ہارا کیونکہ حوصلہ ہارنے یا بدحواس ہونے کا مطلب ان بھوکے خطرناک درندوں کی خوراک بننا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے اوسان بحال رکھتے ہوئے فوراً سان سنبھال لیا اور جیسے ہی ایک رچھ نے مجھ پر حملہ کیا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا مگر اس کوشش میں میرا پایاں پاؤں رہٹ گیا اور میں پشت کے بل ریت پر گر گیا۔ ٹھیک اس وقت ایک دوسرا رچھ سیاہ بھدے پہاڑ کی طرح میرے اوپر آ رہا۔ میں نے فوراً سان اوپر اٹھا دی اور اپنی بغل سے گزار کر اس کا پچھلا حصہ ریت پر ٹکا دیا۔ نتیجتاً رچھ کا پہاڑ سا وجود سان کی انی پر گرا اور اس کے بدہیت سیاہ تھو تھنوں سے دل دہلا دینے والی چٹکھاڑ خارج ہو گئی اور وہ پورا کا پورا سان میں پرو گیا۔

میں نے جلدی سے کمان سنبھالی اور اپنی پشت پر بندھے ترکش سے ایک اور تیر نکال کر چلے پر چڑھا دیا اور آخری درندے کا نشانہ لینے لگا تو وہ جنگل کی طرف دوڑ

گیا۔ میں نے اسے جاتا رہنے دیا۔ میرے سانس پھول گئے تھے۔ اس خونی کشاکش نے میرے اعصاب شل کر کے رکھ دیئے تھے۔

میں پھر وہیں ریت پر ہی بیٹھ گیا۔ اب نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی مگر میری ٹھٹھکی ہوئی نظریں تاریک گھٹے جنگل پر جمی ہوئی تھیں کہ کہیں دوبارہ نہ مجھ پر یہ درندے حملہ کر دیں۔ مجھے ان کی طرف سے ابھی تک خطرہ تھا۔ پھر اچانک دوسرے ہی لمحے میں نے جنگل میں مزید بڑے بڑے دھبوں کو متحرک پایا۔ اب تو میرا خون خشک ہونے لگا۔ ان دھبوں کا مطلب تھا کہ یہ رچھ نما خوفناک درندے ابھی تک جنگل کی تاریکیوں سے اپنے شکاری دانت نکو سے مجھے شکم سیر بنانے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ اس تصور سے ہی میں لرز اٹھا کہ اگر ان سب نے مجھ پر حملہ کر دیا تو مجھے آن واحد میں بھنبھوڑ کر رکھ دیں گے۔ گویا میرا اب حریف یہاں تاریک ساحل پر رکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ تب میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے کیونکہ اب تو میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں بچا تھا۔ ترکش خالی ہو چکا تھا، سان بھی خراب ہو چکا تھا لہذا میں نے جلدی سے اپنا شہتیر سمندر کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ ابھی میں سمندر کے ذرا ہی قریب تھا کہ اچانک جنگل کی طرف سے خوفناک غراٹھیں بلند ہونے لگیں۔ میں سر تا پا کانپ اٹھا مگر میں رکنا نہیں اور بدستور اپنے وجود کی ساری طاقت صرف دونوں بازوؤں میں مجتمع کیے شہتیر کو سمندر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ ادھر جنگل میں گھات لگائے بیٹھے مکا درندوں نے شاید میرے فرار ہونے کی بوسنگھ لی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے بھد ..... یں ..... واز سنی۔ میں نے جنگل کی طرف دیکھا اور لرز اٹھا۔ لگ بھگ دس بارہ راتھوں درندے میری طرف غراتے ہوئے دوڑتے آ رہے تھے۔ میں نے بھی ہمت نہ ہاری حالانکہ میں ان کے چار حانہ عزائم دیکھ کر بری طرح بدحواس ہو گیا تھا اور مجھے خوف کے مارے اپنے وجود میں ایک ایک ناطق محسوس ہونے لگی تھی لیکن باوجود اس کے میں جان توڑ کوششیں اور طاقت صرف کیے شہتیر کو بلا خر سمندر میں اتارنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہ درندے بھی اب میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ سمندر کے نیلگوں پانیوں میں بھاری بھر کم شہتیر کے اترتے ہی میں بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا اور پھر میں

اس بحر بیکراں میں بھوکا پیاسا عبرتناک موت کی آغوش میں چلا جاؤں گا۔  
 بہر طور میں اب اللہ سے دل ہی دل میں دعائیں مانگتا آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس شیطان شتونگڑے جگدوش کی بدنگری کے قریب پہنچنے کے ممکنہ اندازے کا احساس کر کے میرے اندر جنگجویانہ سی ہلچل پیدا ہونے لگی تھی۔ میرا اب اس سے فیصلہ کن نکر او بالکل قریب تھا۔ اگرچہ میں اس شیطان ساحر کے مقابلے میں نہتا تھا لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کی طاقت پر کامل بھروسہ تھا۔ پھر اب نیک بزرگ بابا کمال شاہ کا تعویذ بھی تو میرے پاس تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس کی موجودگی سے جگدوش میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سوچ کر میری ہمت سوا ہونے لگی اور میں ایک نئی طاقت اور نئے ولولے و عزم کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ابھی تک مجھے دور دور تک ساحل کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ دن کی روشنی چار سو پچاسی ہوئی تھی اور مجھے رات کے اندھیرے اترنے سے پہلے پہلے ساحل تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ پھر رفتہ رفتہ دن ڈھلنے لگا اور حسب معمول سرشام ہی رات کا گمان ہونے لگا۔ مجھے اب تشویش آمیز بے چینی نے آلیا تھا۔ آغروب کے کہنے کے مطابق مجھے رات کے اندھیرے اترنے سے قبل ہی ساحل تک پہنچ جانا چاہیے تھا مگر یہاں تو دور دور تک کسی خشکی کے آثار تک نظر نہیں آ رہے تھے مجھے۔ تو میں راستہ بھٹک گیا تھا؟ اس روح فرسا خدشے نے مجھے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا۔ پھر میں نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا کہ کیا خبر مجھے خود ہی پہنچنے میں دیر ہو گئی ہو۔ آخر کو اندازے کی غلطی بھی تو ہو سکتی ہے؟ خود کو یہ تسلی دے کر میں نے منزل تک پہنچنے کی کوششیں تیز کر دیں۔

ہاتھوں سے چپوؤں کا کام لے کر شہتیر پر تیرنا کم جفا کشی کا کام نہ تھا۔ میرے دونوں بازو دکھنے لگے تھے اور شہتیر کے ایک ہی حصے میں تک کر بیٹھے رہنے سے میرا پورا جسم بھی شدید تکلیف دہ اکڑن محسوس کرنے لگا تھا اور مجھے بھوک کے ساتھ پیاس کی شدت بھی بلکان کیے دے رہی تھی۔ سمندر کا پانی میں نے ذرا چکھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بے حد درجہ نمکین اور کڑوا لگا تھا بلکہ اب تو مجھے بھوک سے زیادہ پیاس کی شدت تک کرنے لگی تھی کیونکہ میرا حلق پیاس کی شدت سے سوکھ کر کاٹنا ہو رہا تھا۔ اگر میرا بچھ نما

اس پر سوار ہو کر ہاتھوں کی مدد سے چپوؤں کا کام لیتے ہوئے اسے جلد سے جلد ساحل سے دور گہرے سمندر کی طرف بہا لے جانے لگا۔ تمام درندے ساحل کے کنارے کھڑے بری طرح غرا اور چنگھاڑ رہے تھے مگر میں اب ان کی خون آشام پہنچ سے کافی دور جا چکا تھا اور وہ محض دانت نکوستے رہ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

میں اب شہتیر پر بیٹھا تھا۔ شہتیر سبک روی سے گہرے سمندر کی پرسکون سطح پر بلکورے لیتا ہوا بہا چلا جا رہا تھا۔ میں نے آغروب کی ہدایت کے مطابق اپنی منزل کی سمت کا تعین کر لیا تھا۔ ماحول اب بھی تاریک ہی تھا مگر مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ دن کی روشنی پھیلنے ہی والی تھی اس لئے میں آہستہ آہستہ ہاتھوں سے چپوؤں کا کام لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ جب ذرا تھک جاتا تو آرام کرنے بیٹھ جاتا اور شہتیر خود ہی اپنے روپر پہنے لگتا۔

اب میرے چہار اطراف میں بے کراں سمندر تھا اور نجانے کیوں اب مجھ پر عجب سی ہیبت طاری ہونے لگی تھی۔ یہ شاید سمندر کے ماحول کا اثر تھا۔ میرے قرب و جوار میں ہنوز گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر میں دل مضبوط کیے اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ پھر بتدریج ماحول سے تاریکی چھٹنے لگی۔ سمندر پر بھی جھللا ہٹ سی ہونے لگی۔ دن کے ماحول کا اپنا ہی ایک اثر ہوتا ہے۔ پھر جیسے جیسے دن کا اجیلا پھیلنے لگا میرے اندر کی ہیبت ناک بھی کم ہونے لگی۔ پھر میرے دیکھنے ہی دیکھتے فضا بالکل صاف ہو گئی۔ دن کا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ کچھ شیارے اب آگے تیرنے کی روش تیز کر دی۔ لیکن اس طرح میرے بازو شل ہو کر رہ گئے۔ یہ گزے اسکے زیادہ دیر سستانا پڑ رہا تھا چنانچہ میں نے کبھی کم کبھی زیادہ کی پالیسی اختیار کرنا ہی مناسب جانا۔ سوئی کا من موہنا سا تصور ایک لمحے کو بھی میرے دل و دماغ سے محو نہیں ہوا تھا۔ آغروب کے کہنے کے مطابق اگر میں اس رفتار سے بھی بالکل سیدھ میں چلتا رہا تو اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہل جگدوش کی بدنگری کے ساحل پر پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے راستہ بھٹکنے کا بھی خدشہ تھا جو اس تصور سے ہی مجھے لرزادے رہا تھا کہ اگر میں خدا نخواستہ راستہ بھول گیا تو

خاصا گھٹا اور خوش رنگ ریلے پھلوں سے اٹا پڑا تھا۔ ان میں ناریل کے بھی درخت تھے۔ بس پھر کیا تھا ایک درخت پر شاخ در شاخ چڑھ کر میں پھل کھانے لگا۔ ناریل کی آنکھ توڑ کر اس کے سوراخ سے پانی پیا۔ شکم سیری کے بعد مجھے اپنے وجود میں توانائی کے سرچشمے پھوٹنے محسوس ہوئے۔ اچھی طرح کھاپی کر میں نے ایک قدرے بلند ناریل کے درخت پر چڑھ کر اطراف کا جائزہ لینے کا سوچا اور پھر جیسے ہی درخت کے نصف تک پہنچا ایک ”شائیں“ کی سنسنائی ہوئی آواز ابھری اور ساتھ ہی مجھے اپنے چہرے سے چند آنچ کے فاصلے سے ایک ”جھپک“ سی محسوس ہوئی۔ ایک تیر زمانے کے ساتھ میری ناک سے دوا آنچ دور تنے میں پیوست ہو گیا۔ موت سے بال بال بچ جانے کی عجیب سی دہشت کے مارے میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ”دھپ“ سے میں جنگلی پودوں اور گھٹی جھاڑیوں پر گرا اور پھر وہیں دم سادھے دبک گیا کہ کہیں مجھ پر تیروں کی بارش ہی نہ ہو جائے۔

کافی دیر گزر گئی۔ میں ایسے ہی قد آدم گھٹی جھاڑیوں میں دبکا رہا۔ پھر اچھی طرح قرب و جوار کی سن گن لینے کے بعد جھاڑیوں سے سر ذرا ابھار کر دائیں بائیں دیکھا تو کسی کو موجود نہ پا کر بلا خرد ڈرتے ڈرتے سیدھا کھڑا ہوا اور گرد و پیش میں ٹھٹھکی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک میرا پاؤں الجھا میں گرتے گرتے بچا۔ وہ گھاس پھوس اور خشک ٹہنیوں سے بنی ایک رسی تھی۔ دوسرے لمحے مجھے خطرے کا احساس ہوا مگر دیر ہو چکی تھی۔ اچانک وہی رسی کسی قدیم قبائلی تکنیک کے ذریعے یکدم میرے ٹخنوں کے گرد پھندے کی طرح کس گئی۔ پھر ابھی میں سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ یکدم میرے قدموں نے زمین چھوڑی اور میں سر کے بل الٹا فضا میں معلق ہو گیا۔ زمین سے میں تقریباً 6 فٹ اونچا سر کے بل جمول رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے میرے گرد نیزے برادر عجیب الخلق انسان نما مخلوق بھالے ہاتھوں میں لئے آن کھڑے ہوئی۔ انہیں غیر انسانی مخلوق ہی کہا جاسکتا تھا۔ ان کی جسامت یوں تو عام انسانوں جیسی ہی تھی مگر انہیں دیکھ کر ڈھانچوں کا تصور ہی ذہن میں ابھرتا تھا۔ ان کے استخوانی پنجرہوں میں محاورے نہیں حقیقتاً برائے نام بوٹی تھی۔ چہرے لمبو ترے تھے۔ بغیر پونوں کی آنکھوں

درندوں سے ناکرانا ہوتا تو یقیناً میں زادراہ کے طور پر جنگل سے کچھ نہ کچھ پھل وغیرہ ساتھ لے کر ہی اپنے اس سمندری سفر پر روانہ ہوتا۔ رات کے اندھیاروں کو آسانی عفریتوں کی طرح اٹتے دیکھ کر میں بری طرح پریشان بھی ہو رہا تھا اور گھبرا بھی رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ کالی باؤلی راستہ نے آ ہی لیا۔ میں اب دوبارہ آنکھیں پھاڑے تاریکیوں میں چہار اطراف گھورے جا رہا تھا مگر مجھے اندھیروں کے سوا کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا حتیٰ کہ چند گز سے زیادہ تو مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں گہری سانس لے کر بیٹھا رہا۔

میرا سمندری سفر جاری تھا۔ نجانے میں ابھی اپنی منزل سے کتنا دور تھا؟ حالانکہ آغروب کے کہنے کے مطابق اب تک جگہ دوش کی بدنگری کے ساحل تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ بہر طور میں تن بہ تقدیر اللہ کے بھروسے صبر و استقلال اور حوصلے کے ساتھ نامعلوم منزل کی جانب گامزن تھا کہ اچانک مجھے لہروں کا غیر معمولی شور سانسائی دیا۔ میں ٹھٹھک سا گیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ معمولاً ہے مگر پھر فوراً ہی جب آواز کا آہنگ واضح ہوا تو میں نے موجوں کی شور زدہ سمت کی طرف دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ میرے سامنے ایک تاریک ساحل تھا..... ایک جزیرہ..... تاریک جزیرہ..... گھنے اور لالبنے لالبنے درختوں اور قد آدم خوردو جنگلی جھاڑیوں والا جزیرہ۔ خوشی سے میری چیخ نکل گئی اور میرے اندر ٹوٹی ہمت نے جوش پکڑا۔ پھر میں زور زور سے ہاتھوں کے چو چلاتا ہوا ریتیلے ساحل پر آ کر پشت کے بل لیٹ گیا۔ ذرا ٹکان اتارنے کے بعد میں جزیرے کی طرف منہ کر کے اٹھ بیٹھا۔

سامنے جنگل تاریک اور سانس لیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں یہیں بیٹھ کر دن کی روشنی نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر تھکن کی شدت نے نیند کو جنم دیا اور میں وہیں ساحلی ریت پر سو گیا۔

آنکھ کھلی تو میں بھرپور نیند لے چکا تھا جس کا ثبوت میرے بدن میں ایکا ایکی ابھرنے والی فرحت انگیز تازگی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ سامنے جنگل خوش الحان پرندوں سے چھپ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس اپنی جگہ موجود تھی۔ میں اٹھ کر جنگل کی طرف بڑھا۔ جنگل



کی موجودگی میں مجھے اپنے فرار کی ساری راہیں مسدود ہی نظر آ رہی تھیں۔ نجانے یہ لوگ اب میرے ساتھ کیا حشر کرنے والے تھے؟ ذرا دیر گزری مجھے ایک نسبتاً بڑی گھپاہ سے ایک اور ڈھانچہ نما استخوانی شخص نکلتا ہوا دکھائی دیا تھا وہ بھی انہی کی طرح عام جسمانی ساخت کا تھا لیکن اس کے ارد گرد نیزہ بردار محافظ نما چار پانچ افراد کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی شخصیت بستی کے ”معتبروں“ کی سی تھی۔ البتہ اس کی آنکھوں کے ڈیلے دوسروں کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر بڑے بڑے اور باہر کوا بلے ہوئے تھے۔ ان کے پوٹے تک غائب تھے۔ ایسے میں ان کی صورتیں زیادہ کریمہ اور ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں دل مضبوط کیے سر دست چپ چاپ کھڑا تھا۔ ان کے بڑے ڈیلوں والا سردار خاصی دیر تک مجھے اپنے اٹھتے ہوئے بڑے بڑے ڈیلوں سے گھورتا رہا۔ پھر اس کے بعد چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے کپڑوں اور میرے جسم کو اپنے پنجر نما استخوانی ہاتھوں سے چھو کر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر نچے ہوئے ماس کی وجہ سے میں اس کے چہرے پر تاثرات سمجھنے حتیٰ کہ دیکھنے سے بھی قاصر تھا۔ یہی حال اس کے ابھرے ہوئے دیدوں کا تھا۔

تاہم میں نے دیکھا اس نے میرا ”معائنہ“ اور جائزہ لینے کے بعد کچھ انداز میں دھیرے سے اپنی استخوانی کھوپڑی ہلائی جیسے وہ میرے بارے میں کچھ اندازہ قائم کر چکا ہو۔ تب پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے منمنی سی آواز میں کچھ کہا جو بہر حال میں نہ سمجھ سکا کیونکہ ان کی زبان میرے لئے سربہ سراجیبی تھی مگر میں نے دیکھا وہاں موجود وہ سب خوشی سے یکدم پھرا پھلتے کودنے لگے اور پھر چار افراد نیزہ تھامے میرے قریب آئے اور مجھے نیزوں کے زور پر دھکیلتے ہوئے ایک تاریک کھوہ میں لے گئے اور خود باہر آ کر گویا پہرے دار کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اب صحیح معنوں میں تشویش ہونے لگی۔ یہ کھڈنا کھوہ زیادہ طویل نہ تھا مگر کشادہ ضرور تھی۔ اس میں کھڑا تو نہیں ہوا جا سکتا تھا البتہ سکرسمٹ کر بہ آسانی بیٹھا جا سکتا تھا۔ میں اسی طرح ہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ جب اندھیرا پھیل گیا تو مجھے باہر نکالا گیا اور سیدھا ایک نسبتاً

سے بڑے بڑے ڈیلے باہر کوا بلے محسوس ہو رہے تھے۔ میرے وجود میں مارے خوف سے پھریری سی دوڑ گئی۔ مجھے ان خچرے ہوئے گوشت والے استخوانی وجود سے کراہت آنے لگی۔ وہ سب عجیب بے ہنگم انداز میں چیخنے چلانے لگے۔ پھر ایک نے درخت پر چڑھ کر سی کاٹ دی۔ میں نے اگر دونوں ہاتھ آگے نیچے کی طرف نہ پھیلائے ہوتے تو میں سر کے بل زمین پر گرتا اور میری گردن کا منکا ٹوٹ جانا یقینی تھا۔ بہر طور میں نے نیچے گرتے ہی اپنے پیروں سے اس کا پھندہ کھولا اور پھر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سب میرے قریب آگئے اور نیزوں کی انیوں سے مجھے آگے بڑھنے کا ٹھوکا دیا۔ میرا دل بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا۔ مجھے ان سے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جانے یہ عجیب الحلقہ تعلق میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی؟ میں ان کا خاموش حکم ماننے پر مجبور تھا لہذا ان کے اشارے پر ایک طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی وحشت انگیز سرخوشی کے عالم میں چیخنے چلاتے اور نیزے کی آہنی انیوں سے گویا ہنکارتے ہوئے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

”تم لوگ کون ہو..... ہم..... مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ میں نے بلا آخر چلتے چلتے اور ڈرتے ڈرتے قدرے چلا کر ان سے پوچھا مگر جواب نہ ملا..... مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ میری زبان سے نابلد ہوں گے کیونکہ میری داد فریاد کرنے سے ان پر ذرا بھی کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

وہ لوگ انیوں کے بل پر ٹھوکے دیتے دھکیلتے ہوئے ایک بستی میں لے آئے۔ یہاں بھی ان جیسے لوگ موجود تھے مگر ان میں عورت مرد حتیٰ کہ بچوں کی بھی تخصیص ممکن نہیں ہو پا رہی تھی۔ رہائش کے نام پر جا بجا مٹی کے نیلے نظر آ رہے تھے۔ جن میں تاریک گھپائیں بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھے اس عجیب و غریب بستی کے بیچ میں کھڑا کر دیا۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں یہاں سے بھاگ نکلوں کیونکہ مجھے ان کے استخوانی وجود سے کسی طاقت کی توقع نہ تھی لیکن ان کے پاس آہنی بھالوں کے علاوہ بیشتر کے ہاتھوں میں تیرکمان بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ مجھے فرار کی صورت میں چھلنی کر سکتے تھے۔ مجھے کوئی موقع تاک کر ہی یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے تھا لیکن اتنے ساروں

بڑی کھوہ کے اندر لے جایا گیا۔ یہ کھوہ ان کے سردار کی تھی جو اس وقت اندر موجود تھا۔ نجانے کس طرح کی لکڑی کی انہوں نے مشعلیں ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ اندر ان کے سردار کے علاوہ چار نیزہ بردار محافظ بھی موجود تھے۔ اس کھوہ کی چھت اس قدر بلند ضرور تھی کہ اندر بہ آسانی کھڑا ہوا جاسکتا تھا۔ مجھے وسط میں بٹھا دیا گیا۔ پھر سردار نے اپنے محافظوں سے کچھ کہا۔ ان میں سے ایک نے اچانک جانے کہاں رکھا ہوا ایک تلوار نما چھرا یا چھرا نما تلوار اٹھالی جس کا پھل عجیب و غریب مشعلوں کی روشنی میں سفاکی چمک دے رہا تھا۔ میری روح تک لرز اٹھی۔

”کیا یہ مجھے ذبح کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں؟“

میں نے لرزتے دل کے ساتھ سوچا۔ اتنے میں دو محافظوں نے مجھے دبوچ لیا اور زمین پر لٹا دیا۔ چھرا بدست میرے قریب آیا۔ اس کے باہر کو نکلے ہوئے بڑے بڑے خونناک ڈیلوں میں سفاک چمک ہلکورے لے رہی تھی۔ میں سر تاپا کانپ اٹھا۔ پھر جیسے ہی وہ چھرا سونٹے مجھے ذبح کرنے کیلئے آگے بڑھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنی دونوں ٹانگوں کو سکڑا اور پھر ایک لات چھرے اور دوسری محافظ کے پیٹ میں رسید کی اور باقی دونوں کو ہاتھوں سے پرے دھکیلتا ہوا ٹھکڑا ہوا۔ چوتھے نے کریہہ چیخ مار کر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی تو میں نے اسے زور سے اس کے سردار کے اوپر دھکیل دیا اور باہر کو بھاگا اور جیسے ہی میں اس گھٹن زدہ منوں کھوہ سے باہر نکلا عقب سے جیسے ایک استخوانی پنجرے نے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور اپنے دونوں استخوانی بازو میری گردن کے گرد جکڑ لئے۔ اس کے پنجرہ نما بازوؤں میں مجھے فولادی شکنجے جیسی آہنی گرفت محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے حواسوں پر قابو رکھتے ہوئے کہنی کی زوردار ضرب اس کی پسلیوں پر رسید کر ڈالی۔ اس کے حلق سے وحیانشہ کراہ خارج ہو گئی۔ گردن پر اس کے استخوانی شکنجے کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی میں نے اسے ایک جھٹکے سے پرے دھکیل دیا۔ پھر اٹائے راہ گھپا سے اس کے دو نیزہ بردار اور ایک چھرا بدست محافظ نمودار ہوئے۔ پھر ان دونوں نیزہ برداروں نے مجھ پر بیک وقت اپنے نیزے اچھال دیئے۔ میں یکدم ایک طرف ہٹ گیا۔ اپنے دونوں نیزے بردار ساتھیوں کا وار خالی جاتے دیکھ کر چھرا بدست اپنا

چھرا سونٹے لکار آمیز چیخ مار کر میری طرف دوڑا۔ پر اس کے قریب آتے ہی میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکاؤ لیا اور اس کے چھرے والے ہاتھ پر اپنی لات رسید کر دی۔ نتیجتاً چھرا اس کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ یہ لوگ مجھے لڑائی بھڑائی میں بالکل کورے محسوس ہوئے مگر چونکہ میں اس وقت ان کی بستی میں موجود تھا اور ان کے باقی لوگوں کے نکل آنے کے خدشہ کے پیش نظر میں جلد از جلد ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اس لئے میں نے ان سے مزید الجھنا نہیں چاہا اور ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ تاریکی کے باعث مجھے تلاش نہیں کر سکیں گے اس لئے میں کچی مٹی کی ڈھیروں اور ٹیلوں کے درمیان بنی بھول بھلیوں پر دوڑتا ہوا دور قد آدم جھاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ پھر ایک جگہ ذرا ستانے کیلئے بیٹھ گیا۔ میرے چہار سو گھپ تاریکی تھی۔ مجھے ان پنجرہ نما عجیب الخلقہ مخلوق کے نازل ہونے کا خطرہ بھی لگا ہوا تھا اس لئے میں ذرا دیر اپنی سانسیں بحال کرنے کے بعد دوبارہ چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

سے چوما اور پھر کھنڈر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ کھنڈر کے وسط میں پہنچنے کے بعد مجھے بالکل ایسا ہی لگا جیسے اب بھی میں وہی پراسرار خواب دیکھ رہا ہوں ..... وہی پراسرار خواب ..... جب میں اپنی دل آرا محبوبہ سوئی کو بھی دیکھا کرتا تھا ..... مگر ہر خواب ٹوٹ کر رہ جاتا مگر اب میں حقیقت میں وہیں موجود تھا۔ اپنی سوئی کے پاس۔ اچانک مجھے کسی کے رونے کی آواز آئی۔

”وہی آواز .....؟“ میرے اندر کوئی چیخا۔

میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔ یہ میری سوئی کی آواز تھی جو سسکیاں لئے اپنی الم نصیبی پر کسی ویران گوشے میں محبوس آنسو بہا رہی تھی۔ بے اختیار میکا کی انداز میں میرے قدم آواز کی سمت اٹھتے چلے گئے۔ میں ایک ٹوٹی دیوار پھانڈ کر اندر آ گیا۔ سامنے ایک سالخورہ سے نگہ چہترے پر سوئی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ سوئی کو اپنی حقیقت آئینہ نظروں کے سامنے دیکھ کر میرے وجود میں محبت اور جوش کی ایک لہر سی آئی اور بے اختیار میں اس کے قریب آ گیا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے یکدم اپنا سر اٹھایا۔ اس کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دلنشین آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے تاثرات ابھرے۔

”سوئی! میں آ گیا ہوں۔“ بے اختیار میرے لبوں سے وارفتہ نکلا۔  
سوئی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میں فوراً جذبات سے بے اختیار آگے بڑھا اور اسے چومنے لگا۔

”نہیں ..... نہیں ..... مجھے مت چھو نا .....“ اس نے مجھے روکا۔ میں خوشی سے بے قابو ہو کر اس سے بولا۔

”سوئی! یہ خواب نہیں ہے۔ میں سچ مجھ تمہارے قریب ..... تمہارے بالکل پاس پہنچ گیا ہوں۔ یہ دیکھو۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ کی انگلی اپنے دانتوں میں لے کر کاٹا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئی مگر پھر بھی اس کی خوشی میں ایک انجانا سا خوف مدغم ہو گیا تھا۔

”تم یہاں کیسے پہنچے ..... تم تو ..... تم تو۔“ وہ کہتے کہتے رکی۔

پاتال کی ان منحوس گہرائیوں میں میرا دم اب گھٹنے لگا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں دن کے مقابلے میں رات کا سا زیادہ رہتا تھا۔ سورج کی روشنی اور چاند کی ٹھنڈک کے بغیر میرے اعضا مضطرب ہونے لگے تھے۔ مجھے یہ خوف بھی اب پریشان کرنے لگا تھا کہ اگر میں نے جلد و ش کا جلد خاتمہ کر کے یہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کی تو میرا دم گھٹ جائے گا اور میں ..... میں خدا خواستہ پاتال کی ان منحوس گہرائیوں میں مرنے جاؤں۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

بالآخر مجھے ایک روشنی سی دکھائی دی۔ میں ذرا ٹھٹھکا۔ چمکتی ہوئی سی یہ روشنی کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھی ..... صرف دس پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور پھر جب اس روشنی کے ذرا قریب پہنچا تو میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ میرے سامنے ایک ویران کھنڈر کے آثار تھے جو عجیب سی چاندنی میں بے حد پراسرار دکھائی دے رہا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش یلغیت تیز ہو گئی۔ خوشی کے مارے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں اپنی پراسرار منزل پر پہنچ چکا تھا۔

یہ وہی پراسرار کھنڈر تھا۔ جگہ و ش کا ٹھکانہ جہاں اس نے سوئی کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ من موئی سوئی جواب میرے دل کی دھڑکن بن چکی تھی۔ وہ یہاں قید تھی۔ میرے خواب میں جس پراسرار کھنڈر کے مناظر ابھرتے تھے یہ وہی مناظر تھے۔ اب میرا اس مردود شیطان کے شتو ٹکڑے جگہ و ش سے ٹکراؤ یقینی تھا اور کسی وقت بھی وہ میرے مقابل سامنے آ سکتا تھا۔ اس خیال سے ہی میری رگ و پے میں جوش غیظ کی سنساہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے بابا کمال شاہ والے اپنے دائیں بازو میں بندھے تعویذ کو عقیدت

”تم فکر نہ کرو سوئی! وہ میرا کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔ میں ابھی اس سے نمٹتا ہوں۔“ میں نے جوش بھرے لہجے میں اسے تسلی دی پھر پلٹا۔

سامنے ایک چشم جگدوش بھیا تک چوپائے درندے کی صورت میں مجھے اپنی ایک آنکھ سے گھور رہا تھا۔

”تم نے یہاں آ کر اپنی موت کو دعوت دے ہی ڈالی بالکل! اچھا ہوا آج تیرا ٹنٹا بھی رہبر کر ہی لوں گا۔“ اس نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے پچھلے دو پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسی خوفناک درندے کی طرح زور سے دھاڑا۔ پھر اس کی لپپاتی ہوئی سرخ زبان یکدم باہر لپکی اور دراز ہوتے ہوتے ایک خوفناک اور چوڑے پھن والے ناگ کی صورت اختیار کر گئی۔ میں ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ وہ زبان نما ناگ میرے جسم کے گرد تیزی سے لپٹتا چلا گیا۔ سوئی کے حلق سے دہشت زدہ چیخ نکلی تھی۔ وہ سانپ کی بجی سی زبان رسی کی طرح میرے گرد لپٹ گئی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس طاغوتی زبان کے سرے پر بنے سانپ کے چوڑے پھن نے عین میرے چہرے کے سامنے آ کر اپنی چھوٹی چھوٹی مقناطیسی خوفناک آنکھوں سے گھورنا شروع کر دیا۔ اس کی دو شاخہ زبان لپٹا رہی تھی۔ وہ مجھے اب کسی بھی لمحے ڈس کر اپنا زہر میری رگوں میں اتارنے والا تھا۔ میں خود کو ایک ایکی بالکل بے بس محسوس کرنے لگا۔ مجھے اپنی موت بالکل سامنے دکھائی دے ہی تھی۔ سوئی بیچاری مجھے موت کے منہ میں دیکھ کر ایک چشم جگدوش کی روتے ہوئے میری جان بخشی کی فٹیس کر رہی تھی۔ جگدوش نے اپنا خوفناک جبرے نما منہ کھول رکھا تھا۔

اچانک میری سماعتوں میں ایک پر جلال آواز ابھری۔

”شوکت! یہ شیطانی شتو گٹڑا اپنے کالے عمل سے پہلے پہلے تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ میرے دیئے ہوئے تعویذ کا تصور ذہن میں رکھتے ہوئے دل کی گہرائیوں کے ساتھ اللہ سے مدد مانگو۔“ میں اس آواز کو سن کر اپنے اندر میں ایک عجیب سی روحانی طاقت محسوس کرنے لگا۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک چشم جگدوش نے کھلے منہ سے دھاڑ ماری اور پھر میرے گرد لپٹی ہوئی اس کی سانپ نما زبان کی گرفت

”چلو سوئی! میرے ساتھ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“ میں نے بے تابانہ انداز میں کہا اور پھر اسے چومنے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ وہ یکدم پیچھے سرک گئی اور خوفزدہ سے لہجے میں بولی۔

”نن..... نہیں..... ہم..... مجھے مت چھو نا..... ورنہ..... ورنہ.....“ وہ سہم کر اتنا ہی کہہ پائی اور میں بے تابانہ پریشانی سے بولا۔

”کیوں؟ سوئی کیوں.....؟ میں تمہیں کیوں نہیں ہاتھ لگا سکتا۔ اب تو میں خواب نہیں دیکھ رہا۔ میں تو..... میں تو تمہاری خاطر اور تمہیں حاصل کرنے کی خاطر اتنا طویل اور کٹھن سفر طے کر کے اور بڑی مشکل اور اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر تم تک پہنچا ہوں۔“

”ہاں! مجھے اس کا احساس ہے..... شوکت۔“ وہ دل موس کر کے افسردہ لہجے میں بولی۔ اس کے دلنشین لبوں سے اپنا نام سن کر مجھے بہت بھلا لگا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار آتش عشق کا جذبہ سوا ہونے لگا۔

”شوکت! اسے تم میری یا ہم دونوں کی مجبوری سمجھ لو کہ ہم..... ہم ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود بھی دور..... بہت دور ہیں۔“ اس نے کہا اور بے اختیار سسکیاں لے کر رونے لگی۔

میں اس کے مایوسانہ لہجے پر لرز اٹھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو سوئی؟“ میرے لہجے میں حیرت سے زیادہ پریشانی اور تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میری طرف مجبور نگاہوں سے دیکھا پھر دکھی لہجے میں بولی۔

”شوکت! اس شیطان جگدوش نے.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کھنڈر میں کہیں قریب ہی ایک درندے کی دل ہلا دینے والی چٹکھاڑ گونجی جس نے ایک لمحے کیلئے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا۔ سوئی بھی دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ آواز قریب سے ہی آئی تھی۔ میرے دل میں ایک چشم جگدوش کا مکروہ چہرہ ابھرا۔

”ت..... تم..... چلے جاؤ..... وہ..... وہ..... تمہیں مار ڈالے گا..... وہ بہت ظالم ہے۔“ سوئی غم متوحش لہجے میں مجھ سے کہا۔

میرادل دکنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مردود شیطانی شبنو نگڑا جگدوش سوئی کو اپنے جادوئی زور سے لے کر غائب ہو گیا تھا۔ منزل کے قریب پہنچ کر مجھ سے منزل چھن گئی تھی۔ مجھے اپنی اب تک کٹھن مسافت بے معنی اور ناکام محسوس ہونے لگی۔ میں شکست خوردہ انداز میں کھنڈر کے اس ویران گوشے سے باہر نکلا۔ پورے ماحول پر عجیب سی چاندنی نما روشنی پھیلی ہوئی تھی حالانکہ ظلاً بالکل تاریک تھا۔ میں اس پراسرار کھنڈر کے ویران اور شکستہ ماحول میں سوئی کو تلاش کرنے لگا۔ میرے چہار اطراف پر ہیبت سنائے کا راج تھا۔ چاندنی سی روشنی بھی اب تدریج ماند پڑ کر اندھیروں میں مدغم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں تھک ہار کر ایک سالخورہ سی دیوار سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔ میری ہنوز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میں کس طرح اس مردود جگدوش کو کیفر کردار تک پہنچا پاؤں گا اور کب سوئی کو حاصل کر سکوں گا۔ یہاں پہنچ کر پہلے تو مجھے اپنی کامیابی کا بالکل یقین ہو گیا تھا مگر پھر سوئی کو باوجود اس کے بے بس اور آزرده پا کر اور پھر اسے جگدوش کے طاغوتی شکنجے میں دیکھ کر مجھے اس تلخ حقیقت کا اب جا کر اندازہ ہونے لگا تھا کہ سوئی کو جگدوش کے قبضے سے چھڑانا اتنا آسان اور معمولی بھی نہ تھا۔

میں خود کو بری طرح بے بس محسوس کر رہا تھا۔ مجھے کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی تھی۔ چاروں طرف جیسے بھیا نک ناکامیوں کی منحوس تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جب میرادل و دماغ بالکل ہی ناکامیوں اور احساس محرومیوں کے مہیب اندھیروں میں گم ہو گیا تو اچانک ان گھناؤپ اندھیاروں میں امید کا جگنو چمکا۔ پھر میری خواب خور آنکھیں بند ہونے لگیں اور میرا اندر روشن ہونے لگا۔ تب پھر میں نے ایک ہالہ نور کو ابھرتے دیکھا۔ وہ ایک بڑا ہی پر جلال اور پر نور بارش چہرہ تھا۔ کسی برگزیدہ بزرگ کا چہرہ۔ پہلے تو مجھے یوں لگا جیسے یہ بابا کمال شاہ کا چہرہ ہو مگر نہیں یہ کسی اور ہی بڑے اللہ والے فرشتہ صفت کا چہرہ تھا۔ پھر مجھے ان کی نرم آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے ہی مخاطب تھے۔

”بیٹے! یاویسی کفر ہے اور مردود شیطان سب سے پہلے اس راستے ایک نیک انسان کے ایمان پر حملہ کرتا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ جگدوش ایک بہت بڑا ساحر

کھلتی چلی گئی اور پھر جیسے ہی گرفت ڈھیلی ہوئی میں نے لپک کر اس کی سانپ نما زبان کا دونوں ہاتھوں سے پھنس پکڑ لیا۔ مجھے اپنے وجود میں ایکا انگہی ہی بے پناہ قوت کا احساس ہوا۔ یہ شاید پیر کمال شاہ کے تعویذ کا اثر تھا۔ اللہ کے کلام کی تاثیر تھی کہ میرے اندر بے پناہ قوت کے ساتھ جرأت اور ہمت نے بھی یکدم کروٹ لی تھی۔ اس لئے میں اپنے وجود کی جیسے ساری قوت دونوں ہاتھوں میں مجتمع کیے زبان نما سانپ کا پھنس دبوچے ہوئے تھا۔ ادھر جگدوش بھی بری طرح اس تکلیف کو محسوس کر رہا تھا اس لئے اس نے مجھے خوفزدہ کرنے کیلئے یا پھر تکلیف کی شدت سے منہ کھولے کھولے زوردار چنگھاڑ ماری اور اپنی سانپ نما زبان کو زور سے جھٹک کر اپنی جانب کھینچا۔ اس کم بخت کی لمبی سانپ نما زبان میں بھی بلا کی قوت تھی۔ نتیجتاً میرے ہاتھوں کو بھی جھٹکا لگا اور میں لڑکھڑاسا گیا۔ پھن پر میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ میرے ہاتھوں سے نکلتا چلا گیا۔ مجھے اشد افسوس ہو رہا تھا کہ میرے پاس کوئی خنجر یا چاقو نہ تھا۔ جگدوش کی سانپ نما لمبی زبان اب اس کے غار جیسے منہ کے اندر سمٹ گئی تھی اور اب وہ اپنے چاروں پیروں پر کھڑا میری طرف خوفناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں اب تعویذ کی کرامات اور اللہ کے ذکر کی وجہ سے اس سے بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہو رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غرا کر انسانی آواز میں مجھے دھمکاتے ہوئے بولا۔

”اوائے مورکھ! تو نے یہاں پہنچ کر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ یاد رکھ اچھی طرح تو پھر بھی نہ میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ ہی اس ناری (سوئی) کو حاصل کر سکتا ہے۔ بابا بابا..... بابا بابا۔“ یہ کہتے ہی اس نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ مگر نہیں۔ یہ چھلانگ اس نے میرے ذرا قریب ہی چبوترے پر بیٹھی روتی ہوئی سوئی پر لگائی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سوئی کے حلق سے ایک خوفزدہ سی تیز چیخ نکلی اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں جیسے کثیف دھویں میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئے۔ میں پاگلوں کی طرح چبوترے کی طرف اور پھر ارد گرد دیکھنے لگا مگر نہ مجھے جگدوش نظر آیا اور نہ ہی سوئی۔ میں دیوانوں کی طرح سوئی کو آوازیں دینے لگا مگر میری آواز ہی کھنڈر کے ویران شکستہ ماحول میں گونج کر رہ گئی۔ سوئی کے غائب ہوتے ہی ہر سو سو گوار سی ویرانی چھا گئی تھی۔

ہے۔ وہ ناقابل تخیر رہنے اور قیامت تک زندہ رہنے کیلئے ایک شیطانی کالاعمل کرنا چاہتا ہے اور اس عمل کیلئے اسے جس لڑکی کی ضرورت تھی وہ سوئی کی صورت میں اسے مل چکی ہے کیونکہ اس کے شیطانی عمل کے حساب سے سوئی پورن ماہ ہے جو پوری دنیا میں صرف ایک ہی ہے۔ پورن ماہ کی حقیقت کے بارے میں ہمارے ایک مرید کمال شاہ نے تمہیں بخوبی آگاہ کر دیا ہے۔ سوئی کو جگدوش تب ہی حاصل کر سکتا تھا جب وہ مرنے کے قریب ہو اور اس کے لواحقین اسے مردہ تصور کر کے قبر میں دفن دیں۔ جگدوش ایک کوڑھی مسافر کے روپ میں اپنے شیطانی مقصد کی خاطر سوئی کے باپ جمالے کے ہاں آیا اور اس کی بیٹی کو اس قدر بیمار کر ڈالا کہ وہ بیچاری بالکل بے حس و حرکت ہو گئی۔ پھر اسے مردہ تصور کر کے جیسے ہی دفن دیا گیا تو جگدوش نے اسی رات سوئی کی ”زندہ قبر“ کے قریب بیٹھ کر اسے قبر سے نکال لیا اور پھر یہاں پاتال کی منخوس گہرائیوں کے اس پراسرار کھنڈر میں لے آیا۔ اب اسے اپنے ایک آخری شیطانی عمل کیلئے ایک مخصوص پورن ماشی (چودھویں رات) کا انتظار ہے جو بہت قریب ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ اللہ والا بزرگ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”اے اللہ کے نیک بندے! تو میری مدد کر۔ میں سوئی کو نہ صرف اس کے شیطانی پانچے سے آزاد کرانا چاہتا ہوں بلکہ اس شیطان کے مردود و شتو گٹڑے جگدوش کو بھی فنا کر دینا چاہتا ہوں۔“

”ہاں..... ہم اللہ کے حکم سے تمہاری ضرورت مدد کریں گے۔ جب تک ہمارا دیا ہوا تعویذ تمہارے پاس رہے گا۔ وہ مردود و جگدوش تمہارا بال بھی بیکانہ کر سکے گا لیکن یہی سب کچھ کافی نہیں ہے۔ تمہیں جگدوش کو اس کے شیطانی عمل سے پہلے پہل صفحہ ہستی سے مٹانا ہو گا۔ اب میں تمہیں جگدوش کو ہلاک کرنے کا راستہ دکھاتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ نیک بزرگ ذرا تھمے میں بغور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ پھر بولے۔

”جگدوش تم سے بری طرح خائف ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تم ہی اس پوری دنیا میں وہ واحد انسان ہو جو اس کے شیطانی منصوبے سے آگاہ ہو۔ جگدوش نے تمہارے یہاں پاتال میں آتے ہی فوراً یہاں سے فرار کی راہ اختیار کر لی ہے اور وہ سیدھا ہمالیہ کی پراسرار گہرائیوں میں جا پہنچا ہے۔ وہاں کالی دیوی کے ایک بوسیدہ مندر

کا صدیوں پرانا کھنڈر ہے کیونکہ اپنے کالے عمل کیلئے کسی کھنڈر کو ہی کمین گاہ بنانا پڑتا ہے جس کے درود و پوارے قرن ہا قرن کی منوہیت پہنچتی ہو۔“

”مگر میں وہاں تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟“ میں نے قدرے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

”ہم تمہاری وہاں تک رہنمائی کریں گے۔“ بزرگ بولے۔

”جب تم جاگو گے تو ناک کی سیدھ میں آگے بڑھ جانا۔ سامنے سیاہ پہاڑیوں کے سلسلے نظر آئیں گے جس میں جا بجا تاریک سرنگیں بنی ہوں گی۔ تم کسی بھی ایک سرنگ کے اندر داخل ہو جانا۔ جگدوش کو تمہیں اپنے زور بازو سے دوبرو مقابلہ کر کے ہلاک کرنا ہو گا لیکن ہوشیار رہنا۔ وہ تمہیں مختلف حیلوں بہانوں سے ہٹانے کی بھی کوششیں کرے گا۔ جاؤ بچے! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“ اتنا کہہ کر بزرگ کی شبیہ معدوم ہو گئی۔ اچانک میں بھی جیسے عالم خواب کی سی کیفیت سے بیدار ہو گیا۔

اب میں خود کو بالکل ہلاک چھلکا اور ایک سفر کیلئے بالکل چاق و چوبند محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے یہ سن کر یک گونہ خوشی ہوئی تھی کہ جگدوش کو میں اپنے زور بازو سے ہلاک کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ گویا اس سے مقابلہ کرنے کیلئے یہ ضروری تھا کہ میں بھی اس کی طرح پراسرار اور مادرائی طاقت حاصل کروں۔ چنانچہ میں جلدی سے اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے خوشی تھی کہ اب میری جان پاتال کی ان ٹھٹھن زدہ اور منخوس گہرائیوں سے چھوٹنے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس پراسرار اور منخوس کھنڈر کی حدود سے باہر نکلتے ہی مجھے سامنے سیاہ پہاڑی سلسلے نظر آ گئے جو تاریکی کے باوجود اونچے نیچے لائے دھبوں کی صورت دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار بڑھائی۔ قریب پہنچنے پر مجھے واقعی ان سیاہ پہاڑیوں کے دامن میں کئی تاریک سرنگیں دکھائی دیں اور میں اس نیک بزرگ کی ہدایت کے مطابق اللہ کا نام لے کر ایک سرنگ میں داخل ہو گیا۔

وہ تاریک سرنگ چند قدموں تک بل کھاتی محسوس ہوئی مگر پھر فوراً بعد ہی وہ

آکسیجن کی کمی واقع ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے میں پورا سانس بھی نہیں کھینچ پا رہا تھا اس لئے اب میں جلد سے جلد اپنی دنیا کی آزاد اور کھلی فضاؤں میں پہنچ جانا چاہتا تھا مگر یہاں تو لب بام ہی میرے اعصاب شل ہونے لگے تھے۔ سانس بھی اکھڑنے لگی تھیں۔ بالآخر جب میری رہی سہی جسمانی قوت بالکل ہی جواب دے گئی تو میں وہیں بے حال سا ہو کر نک گیا۔ میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ دم بھی گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کو میرے اندر یہ لرزہ خیز خیال ابھرا کہ اگر میری یہی حالت رہی تو میں تو کسی بھی لمحے دوبارہ نیچے لڑکھڑا کر گرتا چلا جاؤں گا اور اتنی بلندی سے میرا گوشت پوست کا وجود نوکیلے پتھروں سے ٹکرا کر چھلنی ہو جائے گا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور چند ثانیے منہ کھولے گہرے گہرے سانس لیے۔ پھر ذرا طاقت بحال ہوتے ہی میں نے دوبارہ تاریکی میں اوپر چڑھنا شروع کیا۔ معا ایک نوکیلے پتھر پر جب میں نے اپنا دایاں پاؤں اٹکا کر اپنے ریختہ و شکستہ وجود کو اوپر کھینچنا تو میرا پاؤں پھسل گیا۔ میرے گھٹنوں اور کہنیوں پر خراشیں ابھر آئیں کیونکہ میں ذرا نیچے تک نوکیلے پتھروں پر گھسٹا چلا گیا تھا اور اس سے میرے چہرے پر بھی زخم کھنڈ آئے تھے۔ میں نے اگر پھرتی کے ساتھ اپنے شکستہ وجود کو منتشر طاقت کو یکجا کر کے خود کو دوبارہ نوکیلے پتھروں پر جما نہ لیا ہوتا تو میں اس سرنگ نما تاریک کنویں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گم ہو جاتا۔

ذرا سستانے کے بعد میں نے پھر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ اب منزل کو قدرے قریب پا کر میں نے جوش آمیز جگت پسندی سے اجتناب برتا تھا اور ذرا رک رک کر سنگلاخ بلندی کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔

بالآخر میں صبر و استقلال اور مستقل مزاجی کے ساتھ سرنگ کے انتہائی سرے پر پہنچ ہی گیا اور میرے زخمی شل ہاتھوں نے اپنی دنیا کی زر خیز زمین کو چھو ہی لیا۔ میں اس اندھی منحوس سرنگ نما کھوہ سے پوری طرح ابھر کر نرم نرم گھاس پر کھلی فضا میں بے سدھ ہو کر کمر کے بل لیٹ گیا اور جلدی جلدی گہرے سانس لینے لگا۔ میری پیاسی نگاہوں نے جب صاف اور شفاف کھلے آسمان پر محو پرواز پرندوں کی حال مست ڈاروں کو دیکھا تو میرے اندر تازگی اور تراوٹ بھرتی چلی گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے میں دنیا و مافیہا

عمودی ہو گئی۔ گویا اب میں جیسے سرنگ کے اندر ہی اندر چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ چند قدم ہی چلا تھا کہ میرا سانس پھول گیا مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ اللہ کے اس نیک بندے کی سیر حاصل ہم کلامی نے میرے اندر عجب سی قوت اور ہمت بھر دی تھی۔ سرنگ کی پتھر ملی دیواروں پر ابھرے ہوئے نوکیلے پتھروں کی وجہ سے مجھے اوپر چڑھنے میں کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا مگر یہ بھی تھا کہ سرنگ بتدریج عمودی ہوتی جا رہی تھیں۔ جیسے میں پہاڑی کی بلندی پر چڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ میں نے پیشقدمی جاری رکھی۔ جب تھک جاتا تو ذرا سستانے کے بعد دوبارہ سفر شروع کر دیتا۔

آخر جب میں ایک مقام پر بالکل ہی تھکن سے چور ہو گیا تو میں نے ایک نصف قد آدم رخنے میں سکڑ سمٹ کر ڈیرہ جمالیا اور چند گھنٹے یہاں آرام کا قصد کیا۔ میرے ارد گرد کالی بھٹ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سناٹا اس قدر تھا کہ مجھے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کی بازگشت بھی سرنگ کے اس سنگی ماحول میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ خاصی دیر تک یہاں سستا لینے کے بعد میں نے ایک بار پھر سرنگ کے اندر ہی اندر چڑھائی کا سفر شروع کر دیا اور اس وقت تک اپنی ”عمودی“ پیش قدمی جاری رکھی جب تک مجھے بلندی پر روشنی کی چمک نہ نظر آ گئی۔ میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ یہ روشنی سرنگ کا یقیناً اختتام تھی۔ گویا میں پاتال کی منحوس گہرائیوں سے نجات پانے والا تھا۔ منزل قریب پا کر میرے اندر ایک نئے دلوں اور طاقت نے جنم لیا۔ پھر میں نے اپنی پیش قدمی پہلے سے بھی تیز کر دیں۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔ نوکیلے ابھرواں پتھروں اور سنگی رخنوں کی وجہ سے مجھے بلندی پر چڑھنے پر آسانی ہو رہی تھی مگر باوجود اس کے یہ ایک تھکا دینے والا بڑا ہی محنت طلب کام تھا۔ بہر طور اب تو منزل قریب تھی اور سرنگ کا روشن سرا بھی دکھائی دینے لگا تھا اس لئے میں اب بغیر رکے باقی ماندہ اندھیرے فاصلوں کو بھی جلد سے جلد پائنا چاہتا تھا لہذا میں پہلے سے زیادہ ہمت و حوصلے سے بلندی پر چڑھنے لگا۔ سرنگ کا مدور نما روشن سرا لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا۔

معمول سے زیادہ جفا کشی اور محنت سے جلد ہی میرا دم پھولنے لگا۔ ایک تو پہلے ہی پاتال کی منحوس گہرائیوں میں چند دن گزارنے کی وجہ سے میرے پیچھے پتھروں میں

سے بے نیاز ہو گیا۔ میں بیہوش ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں خود ہی ہوش میں آیا تھا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میں نیند سے ہی جیسے بیدار ہوا تھا۔ میں نے خود کو ایک جھلکا سی چار پائی پر پڑے پایا تھا۔ وہ ایک جھلکی نما جھونپڑی تھی۔ نیند کا تذکرہ میں نے اس لئے کیا تھا کہ میں بیدار ہو کر ہی خود کو تازہ دم پایا تھا۔ میں نے ایک سانولی سی تیکھ نقوش والی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے ماتھے پر تلک اور مانگ میں سندور تھا۔ اس کے دبلے پتلے جسم پر پرانی مکر صاف ستھری سوتی سردوئی رنگ کی ساڑھی تھی جس کا بلاؤز گہرو رنگ کا اور سر پر سلیقے سے رکھا پیلا آفچل تھا۔ وہ ایک تانبے کا بڑا سا گلاس لئے میری چار پائی کے پاس ہی کھڑی تھی۔

میں یکدم اٹھ بیٹھا اور حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
”م.....میں کہاں ہوں؟“

وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ ”بھیا! یہ دودھ پی لو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ میرا حلق پیاس کی شدت سے سوکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے دودھ کا گلاس لیا اور پانی مانگا۔ اس نے ایک جست کے میڑھے میڑھے کورے میں قریب ایک کونے میں گھرے سے پانی انڈیل کر مجھے تھمایا اور میں ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ پھر دودھ کا گلاس بھی غنا غٹ چڑھا گیا۔ اس کے بعد آستین سے منہ صاف کر کے اس سے بولا۔

”تم کون ہو؟ اور..... اور یہ کون سی جگہ ہے؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”بھیا! جتنا نہ کرو۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ یہ سرحدی پوروائی (گاؤں) ہے۔ میرے پتی اور میں ادھر چائے کی پیتیاں چن رہے تھے۔ تمہیں ہم نے وہاں ایک سوئی کھوہ کے قریب بیہوش پایا تو یہاں اٹھالائے۔“

”تمہارا پتی کہاں ہے اس کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میں اس وقت پڑوسی ملک بھارت کے کسی سرحدی گاؤں میں تھا اور یہ عورت اپنی وضع قطع اور لب و لہجے سے مجھے ہندو ہی لگ رہی تھی۔ عموماً یہ عورتیں اپنے خاوند کا نام نہیں

لینتیں مگر اس نے دھیرے سے اپنے شوہر کا نام گورون داس بتایا اور کہا کہ وہ ذرا باہر گیا ہے۔ ابھی آتا ہی ہوگا پھر کچھ سوچ کر بولی۔

”بھیا! تم ادھر آرام سے بیٹھو۔ میں ابھی اسے بلا کر لاتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر باہر چلی گئی۔ میں حیران و پریشان سا چار پائی پر بیٹھا رہ گیا۔ اچانک میری نظر ایک طرف جھولتے ہوئے ٹاٹ پر پڑی۔ وہ شاید جھونپڑی کا کوئی اندرونی گوشہ تھا۔ میں آہستگی سے اٹھا اور دوسری کونٹھڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پھر بوسیدہ سے جھولتے ہوئے ٹاٹ کے پردے کو ایک طرف ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ اس کی چھت زیادہ بلند نہ تھی۔ یہ ایک جھونٹا سا کونٹھڑی نما کمرہ تھا جس کی ایک دیوار سے چار بائی چار کا روشن دان بھی نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے دن کی روشنی اندر صوفشاں ہو رہی تھی۔ میں نے فرش پر دیکھا تو بری طرح ٹھٹھکا۔ فرش پر ایک میلی چیکٹ سی پھٹی پرانی درمی پکھی ہوئی تھی اور وہاں جانے کیا کیا الا بلا بکھرا ہوا تھا۔ ان میں ایک انگیٹھی بھی رکھی ہوئی تھی جسو در تھی۔ پاس ہی کچھ ٹوٹی ہوئی مالائیں ایک انسانی ڈھانچے کی کھوپڑی اور چند مٹی کے مادھو (گڈے وغیرہ) بھی پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کا بازو غائب تھا تو کسی کی دو ٹانگیں دو ایک کے تو سر بھی نہیں تھے۔ ایک مٹی کے چھوٹے سے پتلے کے سینے پر بوری سینے والا سوا بھی پیوست تھا۔ یہ ساری خرافات مجھے کالے علم میں مستعمل ہونے والی ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

”تو گویا گورون داس کم بخت جادو ٹونے کیا کرتا تھا۔“ میں نے ہونٹ بھیج کر سوچا اور تب اچانک درمی پر پڑی انسانی ڈھانچے والی وہ کھوپڑی ذرا ہلتی محسوس ہوئی۔ میں ڈر سا گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ کہیں یہ میرا وہم تو نہ تھا۔ پھر بھی میں نے زمین پر بکھرے ہوئے مٹی کے پانچ چھ کے انچ کے پتلوں کو بھی حرکت کرتے دیکھا۔ میرا دل یکبارگی سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اچانک جھونپڑی کے باہر سے کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

ادھر اچانک وہ کھوپڑی اور مٹی کے پتلے بھی ساکت ہو گئے۔ میں جلدی سے واپس پہلی والی کونٹھڑی میں آ گیا۔ بیرونی چوکھٹ پر جھولتا ہوا ٹاٹ کا پردہ ہٹا اور پھر میں



سے بولا۔

”تیرا نام کیا ہے؟“

”میرا نام وقار احمد ہے۔“ میں نے بلا خوف اپنا نام بتایا۔

”میری بدھی میں پہلے ہی تھا کہ تو مسلمان ہے۔ اس پوروائی (گاؤں) میں

بھی ہندو مسلم مل جل کر اور بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔“ وہ بولا۔ اس نے جیسے مجھے تسلی دی۔

میں خاموش رہا۔ اتنے میں اس کی بیوی شالی روٹی کے برتن لے آئی۔ دال دہی لگی تھی سے پکی ہوئی پھلکا نما روٹیاں اور پودینے کی چٹنی تھی۔ مجھے بھوک تو لگی ہوئی تھی۔ پھر انکار کرنا بھی خلاف آداب تھا۔ پھر اس خیال سے بھی کہ کہیں یہ دونوں ہندو میاں بیوی برا نہ سمجھیں اور پھر یہ لوگ بھی مجھے اپنے ساتھ کھلانے پلانے میں کوئی عار نہیں سمجھ رہے تھے اس لئے میں خاموشی سے کھانے میں مشغول ہو گیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد گوروں نے ایک ڈکار لی پھر پانی کے جستی کٹورے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں بھی فارغ ہو کر بیٹھ گیا۔

پھر وہ مجھے عجیب پر اسرار نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ میں نے بھی جبراً مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

”کیا بات ہے تم ہنس رہے ہو؟“

”میں تیرے جیسے متر (دوست) کو پا کر بہت خوش ہوں۔“ وہ عجیب سے

گہرے لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب..... میں سمجھا نہیں؟“ میں نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں

پوچھا تو اس کی اسرار بھری مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

میں..... ہونٹوں کی طرح گوروں داس کا چہرہ تکتے لگا۔

”دھیرج..... پتر..... دھیرج سب سمجھا دوں گا۔ تو نے تو میرے پوہ بارہ کر

دیئے۔“ گوروں نے لڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ دوسرے لمحے میں یونہی ہنس کر بولا

”تمہاری دوستی کا شکریہ گوروں بھائی! اب مجھے جانے دو۔“ وہ حیرت سے بھنویں اچکا

نے اس سانولی ہندو عورت کے ہمراہ ایک پستہ قد سیاہ روخص کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب پر اسرار سی چمک تھی۔ چہرہ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا۔ اس نے اوپر شلوکا نما قمیض اور نیچے گھیر دار نیپے والی شلوار پہن رکھی تھی۔ میں سمجھ گیا یہی اس عورت کا شوہر گوروں داس تھا۔ میری طرف دیکھ کر اس کے باریک سیاہ روہونوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ خنکی سی آواز میں بولا۔

”کیسے ہو بھیا؟“ یہ کہہ کر اس نے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے خاموش نظروں سے اس کی طرف تکتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے مختصراً کہا۔

”بیٹھو..... بیٹھو۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے مہمان نوازی والے انداز میں بولا پھر

اپنی بیوی سے بولا۔

”شالی! اسے کچھ بھوجن بھی کرایا ہے یا بیچارا ابھی تک بھوکا ہے۔“ گویا اس

کی بیوی کا نام شالی تھا۔ میں نے سوچا۔ پھر بولا۔

”ہاں! دودھ پی لیا تھا میں نے بڑی مہربانی میں چلوں گا۔“ میں نے جانے

کی اجازت چاہی۔ میں یہاں نہ جانے کیوں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ گوروں بھونچکی نظروں سے مجھے تکتے لگا۔ پھر بولا۔

”ارے بھیا! اتنی جلدی..... ابھی تو تمہارے شریر کی تکان بھی نہیں اتری ہو

گی۔ بیٹھو..... بیٹھو میں نے بھی ابھی تک بھوجن نہیں کیا ہے۔ ساتھ ہی بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اور یہ تم گھبرا کیوں رہے ہو اتنے۔ مجھے اپنا متر (دوست) سمجھو۔“

”نہیں..... میں گھبرا تو نہیں رہا۔ پر مجھے آگے جانا ہے۔ میں زیادہ دیر نہیں

ٹھہر سکتا۔“ میں نے کہا۔

اثناے راہ شالی ایک کونے میں بنی رسوئی نما کھڈی میں گھس گئی۔

گوروں نے مسکراتے ہوئے میرے کاندھے پر دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ

دھرا..... پھر ہم دونوں چار پائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھ گئے۔ گوروں پہلے تو چند ٹاپے

میرے چہرے کی طرف عجیب پر اسرار نظروں سے تکتا رہا پھر اپنی مخصوص گہری مسکراہٹ

نے اپنے شوہر گوردن سے کہا۔ ”اے سنتے ہو ذرا مجھے جانے سے پہلے راجو بھیا کی مڑھی سے ذرا نرسنگا لاؤ، کنیش دیوتا کے مندر جا کر بجاؤ گی۔“

”ارے چھوڑ، واپسی میں لا دوں گا۔“

”نہیں ابھی لاؤ، آ کیا پتہ کب لوٹو۔ پاس ہی تو ہے گھر راجو بھیا کا“ شالی نے اصرار کیا۔ گوردن مجھے وہاں رکے رہنے کا کہہ کر چلا گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کی بیوی شالی نے جان بوجھ کر اسے وہاں سے نکالا ہے اور وہی ہوا۔

چنانچہ گوردن کے جھگی سے نکلتے ہی شالی جلدی سے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر پریشان کن اور متوحش لہجے میں بولی ”بھیا! بھگوان کیلئے تم اس وقت چلے جاؤ۔ اس چکر میں نہ پڑو۔“

میں اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا اور اس سے یہ پوچھا۔

”کیسا چکر؟ اگر میری وجہ سے کسی کو شفا مل جاتی ہے تو کیا برا ہے۔“

”نہیں، ہم سب مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے، تم چلے جاؤ۔“ وہ منت سماجت کرنے لگی۔ اسے اپنے شوہر گوردن کے لوٹ آنے کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ شاید کسی خوف کے باعث اس کے سامنے تو بات مجھ سے نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم میرے دل کو کچھ کھد بد لگ گئی مگر میں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اس دوران گوردن بڑبڑاتا ہوا جھگی میں داخل ہوا اور بیوی کی طرف گھور کر بولا ”خوامخواہ مجھے چکر لگوا یا۔ راجو تھا ہی نہیں گھر پر چل اے بھو! چلیں ہم آگے ہی دیر ہوئی جا رہی ہے۔“ وہ آخر میں مجھ سے بولا۔ ہم دونوں شالی کو حیران و پریشان کھڑا چھوڑ کر جھگی سے نکل گئے۔

”یار گوردن ایک بات تو بتا۔“ میں نے اس کے ساتھ چائے کے کھیتوں کے درمیان چلتے ہوئے کہا۔

”ہاں، بھو! پوچھو، وہ بولا۔“

”یہ ٹھا کر دیال سنگھ کی بہورانی شکنتلا کب سے بیمار ہے؟“

”بہت دن ہووے ہیں، پر آج تک کوئی علاج نہ کر سکا۔“

”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ بھلا میں کیسے اس کا علاج کر سکتا ہوں۔“

کر بولا ”ایں! یہ کیا بات ہوئی، کیا سترام سنگھ کی پتن شکنتلا کے پاس نہیں چلے گا؟“ میں نے اٹھ کر اس کی طرف دیکھا وہ ہنس کر بولا۔

”چلو بتائے دیتا ہوں، دیکھ پتر! میرا ایک کام ہے تو وہ کر دے میرا مقدر بن جائے گا۔ ہم گریب پر پتن کا نصیب سنور جائے گا۔ وہ لجاجت سے بولا۔

”کونسا کام؟“ میں نے بھنویں سیڑھیں کر اس سے پوچھا۔

”چھوٹا سا کام، لوسنو“

”یہ ساری جاگیر کھڑا کر دیال سنگھ کی ہے۔ اس کی بہورانی..... یعنی اس کے اکلوتے بیٹے سترام سنگھ کی پتن شکنتلا دیوی کو ایک بڑی ہی خطرناک بیماری نے آ لیا ہے جس کا توڑ کوئی حکیم وید بھی نہ کر سکا مگر میرے مہا گرو چیلارام نے مجھے بتایا ہے کہ سونا کھوہ سے ایک بڑا کانترک بھوی نکلے گا۔ بس اسے لے کر ٹھا کر کی حویلی پہنچ جانا پھر شکنتلا دیوی کے سر پر جو بھی جن جھپٹ ہو گا وہ اتر جاوے گا۔ تب سے میں انتظار کر رہا تھا۔ تجھے دیکھا تو جیسے میری آشا پوری ہو گئی۔“

وہ صراحت بھرے انداز میں بتا کر خاموش ہوا تو میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مگر میں تو کوئی بڑا کانترک نہیں ہوں، بلکہ ایک سیدھا سادہ انسان ہوں؟“

میں اتنا جان گیا تھا کہ میں پاتال سے باہر جس سرنگ کی کھوہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوا تھا گوردن اسے ہی ”سونا کھوہ“ کے نام سے پکار رہا تھا۔ پرنتو میری بات پر گوردن داس پر امید لہجے میں مجھ سے بولا۔

”ارے بھو! تم کیا جانو اپنی شکتی یہ تو شکتی والے ہی جانیں۔ بس آ اس سے میرے ساتھ چل، تیرے کارن اگر کسی کا بھلا ہو جاوے تو کیا برا ہے۔ چل اٹھ،“ وہ بصد اصرار بولا۔ میں بھی انسانی بھلائی کی خاطر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کن انھیوں سے گوردن کی بیوی کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔ اس کے سلونے چہرے پر عجیب سی پریشانی کے آثار ہویدا تھے جسے میں کوئی معنی پہنانے سے قاصر ہی رہا۔ پھر عین اس وقت جب میں اور گوردن ٹھا کر دیال سنگھ کی حویلی کی طرف جانے لگے تو اچانک اس کی بیوی شالی

طاری کئے ہوئے ہے۔

گوردن نے بتایا۔ ”یہ ٹھا کر دیال سنگھ کی حویلی اور ہاں اس کی جنم بھومی بھی ہے۔ ایک پگڈنڈی نما بل کھاتا کچا راستہ بتدریج بلند ہوتا ہوا حویلی کی طرف چلا جا رہا تھا جانے کیوں میں اب ایک عجیب سی بے کلی محسوس کرنے لگا۔ جانے یہ کم بخت گوردن داس مجھے کس چکر میں پھنسانا چاہتا ہے۔ ایک بار تو میرے دل میں آئی اس پر لعنت بھیج کر بھاگ جاؤں..... مگر..... پھر گوردن کا احسان یاد کر کے اپنا ارادہ بدل لیتا ہوں۔ ویسے بھی میں نے سوچا ہو سکتا ہے، گوردن سے مجھے کسی قسم کی مدد ہی مل جائے کہ یہ سارا علاقہ اس کا دیکھا بھالا ہے۔ یقیناً ہمالیائی ریاستوں سے واقف ہے، بہر طور میں نے اللہ کا نام لیا اور تن بہ تقدیر ہو گیا۔ گوردن داس جیسے ہی حویلی رام ہیون کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچا۔ چوب داروں نے اسے دیکھ کر اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اور ہمیں ایک بلند چھت والے ہال کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یاں منقش پایوں والی کرسیاں اور صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ہال کمرے کی تزئین و آرائش دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ یہاں قدیم و جدید اشیائے تزئین کا حسین امتزاج تھا۔ چھت کے وسط میں بڑا سا فانوس جھول رہا تھا۔ دیواروں پر تلواریں اور سنانیں چسپاں تھیں۔ مختلف درندوں کے حنوط شدہ سر اور خانوادے کے پرکھوں کی رعونت آمیز شبیہوں والی تصویروں کے فریم بڑے قریب کے ساتھ دیواروں پر آویزاں تھے۔ ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ذرا دیر بعد ٹھا کر دیال سنگھ کو ہماری آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ کیونکہ ہمارے وہاں فروکش ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے بھاری بھر کم جتنے اور شاہانہ لباس کے ساتھ نمودار ہوئے۔ انہوں نے خالصتاً ٹھا کر دیال سنگھ کی قیمت لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے ہمراہ خاندان کے دیگر افراد بھی تھے۔ مجھے گوردن کی حیثیت و اہمیت کا اندازہ ہونے لگا۔ ٹھا کر دیال سنگھ کے ساتھ ان کی ٹھا کرانی بیوی اور بیٹا شرام سنگھ بھی تھا۔ جس کی عمر بائیس، تیس کے لگ بھگ تھی۔ ان تینوں کے چہروں پر پریشانی، نفرت اور سوگواری کا گھجک احساس نمایاں تھا۔ گوردن اور میں ازراہ احترام اٹھ کھڑے ہوئے۔

”گوردن یہ تمہاری آمد، کیا ہمارے لئے خوشخبری کا پیام ہے؟“ ٹھا کر دیال

”تو کر لے گا۔ اس کو جن کا سایہ ہے اور میرے مہاگر و گرنتھ کے چیلارا نے مجھے یقین دلایا ہے کہ سونا کھوہ سے برآمد ہونے والا کاترک ہی اس کا جن اتار کا ہے۔“

”کیا ضروری ہے کہ سونا کھوہ سے برآمد ہونے والا کاترک میں ہی ہوں۔“

”ہاں اور کوئی آج تک نہیں نکلا۔“ وہ پر یقین لہجے سے بولا۔

”دیکھو بھو! میرے پتر! میرا کام کر دے۔ میری حویلی والوں کے آگے۔“

جے کار ہو جائیگی۔ پرتو انہیں یہی کہنا کہ تو خود بھی ایک جن ہے۔ جسے میں نے سونا کھ میں جا کر تلاش کیا ہے اور اب تجھ پر کالا علم کر کے بہورانی کا علاج کرانے لایا ہوں۔“

میں نے مسکرا کر حامی بھری۔ وہ مجھے پاگل نظر آ رہا تھا۔ میرے ذریعے حویلی والوں سے سستی شہرت لینا چاہتا تھا مگر بات محض اتنی ہی تھی۔ اس کے لہجے میں کوئی گہری چال، سازش یا کوئی پراسرار چکر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید شالی کے منت بھرے الفاظ تھے جو اب بھی میرے دل و دماغ میں گونج رہے تھے اور میں متذبذب ہو کر سوچنے لگا کہ آخر اس نے مجھے چلے جانے کا کیوں کہا تھا؟ اور وہ کم مصیبت کا شکار ہونے کا کہہ رہی تھی۔ غرض میرا دل و دماغ گوگو اور عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

یہاں کی زمین خاصی زرخیز نظر آ رہی تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا کچے کچے پختہ و نیم پختہ گھروں میں عالیشان مکان بھی تھے۔ دور دور کھیتوں سے پا غریبوں کی جھوپڑیوں، جھگیوں اور مڑھیوں پر مشتمل بستی بھی تھی۔ لوگ بہت مختی نظر رہے تھے اور اپنے کاموں میں جتے ہوئے تھے۔ دور مغربی افق ڈوبتے سورج کی نارنجی روشنی سے گوگوں ہو رہے تھے اور آشیانوں کی طرف لونٹے حال مست پنچھیوں کی ڈا میں ترتیب وار محو پرواز تھی۔

لگ بھگ کوئی کلومیٹر پیدل چلے ہوں گے کہ سامنے شام کے اترے ر اندھیارے خاکوں میں جیسے ایک نسبتاً بلند قطعہ زمین پر بڑی قدیم طرز تعمیر کی حامل عمارت نظر آئی۔ دور سے ہی حویلی کی یہ عمارت دلوں میں ہیبت اور عجیب سا رعب

تکرار کر رہی ہے۔

شکنتلا عام شکل و صورت کی ایک جوان عورت تھی۔ رنگت اس کی دہلی ہوئی، شاید یہ اس کی پراسرار بیماری کی وجہ سے تھی ورنہ تو میں سمجھا تھا کہ اتنے بڑے ٹھاکر خانوادے کی بہو ضرور کوئی حسین و جمیل عورت ہوگی۔ معا گوردن داس نے حکمانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

”دیکھ..... یہ ہے وہ..... جس پر تمہارا گندا سایہ ہے۔ اب تم اس سے کہو کہ اس کے سندر شریر کو چھوڑنا چاہتے ہو کہ میں گوردن کے اس بدلے ہوئے انداز خطاب پر بری طرح ٹھکا تو وہ ہولے سے سرگوشی کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

”میری مجبوری سمجھ اور جو میں نے کہا ہے وہ کرو..... ورنہ میرے ساتھ تم بھی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ میں نے اس کی بات پر دانت بھینچ لئے۔ پتہ نہیں یہ مردود کیا چکر چلا رہا تھا جو اپنے ساتھ مجھے بھی پھنسانے کے درپے تھا۔ بہر حال میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا اور آگے بڑھ کر میں نے وہی کیا جو گوردن نے مجھ سے کہا تھا۔ میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ شکنتلا نے فوراً اپنی آنکھیں کھول دیں اور ساتھ ہی ایک دم اٹھ بیٹھی۔ سب کے چہروں کو باری باری دیکھا پھر اپنے شوہر شرام سنگھ کو جیسے پہچانتے ہوئے خوشی سے چلا کر بولی۔

”شرام..... یہ تم ہو۔“

سب کے چہروں پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔ شرام فوراً اپنی تپتی کے سر ہانے بیٹھ گیا اور خوشی سے اپنی بیوی شکنتلا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا ”شکنتلا..... تم نے آخر مجھے پہچان لیا۔“ پھر شکنتلا نے ٹھا کر اور ٹھاکرائن کی طرف دیکھا۔ ”ہتاجی..... ماتاجی“ اس نے خوشی سے لرزتی آواز میں کہا۔ دونوں بے پناہ خوشی کے ساتھ اس کے قریب بیٹھ گئے۔ تب پھر اچانک شکنتلا نے میری طرف دیکھا اور پھر یکدم اس کے چہرے کے تاثرات گز گئے وہ میری طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے ہڈیانی آواز میں چلائی۔ یہی ہے..... یہی ہے وہ مورکھ جو میرے شریر سے چٹا ہوا تھا۔ اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میں بری طرح پریشان ہو گیا اور گوردن کی طرف

سنگھ نے برعرب اور بھاری گونجدار آواز میں گوردن سے کہا اور پھر وہ تینوں اپنی اپنی شاہانہ نشستوں پر بڑے ”کر“ کے ساتھ براجمان ہو گئے۔ ان تینوں کی پرامید نظریں اس وقت گوردن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ چند مسلح مصاحب خاص اور خدمت گار بھی وہاں آن موجود ہوئے تھے اور احترام سے سر جھکائے کھڑے تھے کہ ہال کمرے میں دوبار سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

گوردن جلدی سے ہاتھ باندھ کر مودبانہ بولا۔

جی ہاں سرکار! میں نے کہا تھا ناں کہ میں اپنے مہاگر وکی کرپا سے جلد اپنے علم سے اسے قابو کر لوں گا۔ پرتو ہمیں اب دیر نہ کرنی چاہئے۔ اس کی بات پر ٹھاکر دیال سنگھ سمیت اس کی ٹھاکرائن تپتی اور بیٹا میری طرف عجیب نظروں سے گھورنے لگے۔ پھر ٹھاکر دیال سنگھ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو پھر.....“ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے پیچھے چل دیئے۔ میں بری طرح گھبرا رہا تھا کہ گوردن داس کے اس جملے نے مجھے عجیب اندیشے میں مبتلا کر دیا تھا کہ آخر اس نے ٹھا کر سے کسے قابو کرنے کیلئے کہا تھا؟ ان تینوں نے میری طرف عجیب نظروں سے گھورا تھا۔ کیا اس کم بخت..... گوردن نے مجھے قابو کرنے کو تو نہیں کہا تھا۔ بہر طور..... میں دل میں انجانے وسوسوں اور اندیشوں کے ساتھ ان کے عقب میں گوردن کے ہمراہ چلتا ہوا ایک شاہانہ اور پرتزئین کمرے میں پہنچا تو..... وسط میں بچے ہوئے خوبصورت اور آرام دہ مسہری پر کسی کو لینے پایا۔ یہ کوئی عورت تھی۔ میں سمجھ گیا کہ بقول گوردن کے یہ جوان عورت ٹھا کر دیال سنگھ کی بہو یعنی ان کے بیٹے..... شرام سنگھ کی بیوی شکنتلا ہے۔

ہم سب مسہری کے ذرا قریب پہنچے تو میں نے بغور مسہری پر بے سدھ لیٹی ہوئی شکنتلا کے چہرے کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنے حلق سے عجیب و غریب کراہ آمیز آوازیں نکال رہی تھی۔

”..... مورکھ!..... مو..... ہے..... چھوڑ دے۔ میرا شریر چھوڑ دے.....“ یہ سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس پر کسی جن جھیٹ کا سایہ تھا۔ جس سے وہ چھٹکارا پانے کی

طرح اس بات کا پچھتاوا ہوانے لگا کہ..... کاش میں اس مردود فریبی گوردن داس کی نیک نفس بیوی شالی کا کہا مان لیتا..... گوردن کی باتوں میں آ کر اس پر اے پھڑے میں اپنی ٹانگ نہ اڑاتا، مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ چڑیاں کھیت چک چکی تھیں۔ مگر میں بھی اتنی آسانی سے بے موت مرنے والا نہ تھا۔ میرے اندر جیسے جینے اور اپنی بقاء کی امنگ بیدار ہوئی تو میں نے اپنے اندر عجیب سی قوت کا احساس پایا اور پھر ایک جھٹکے سے خود کو خدمت گاروں کے ٹولے سے چھڑا کر باہر بھاگا..... ”پکڑو..... پکڑو..... مورکھ جانے نہ پائے“ کی آوازیں میرے عقب میں بلند ہونے لگیں۔ مگر میری ٹانگیں تو جیسے ہوا سے باتیں کرنے لگیں..... میں بے تحاشہ دوڑے چلا جا رہا تھا۔ پوری بستی میں میرے خلاف اعلان کر دیا گیا کہ مجھے کوئی اپنے پاس پناہ نہ دے۔ بلکہ بستی کے کبھی لوگ میری جان کے درپے ہو گئے۔ یہ بہت مشکل ترین صورتحال تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ اس وقت رات کا سہ تھا..... اس لئے میں جنگلوں کھیتوں میں چھپتا چھپاتا پھر رہا تھا۔ اچانک مجھے شالی کی جھگی کا خیال آیا۔ میں نے سوچا..... اس نازک صورت حال میں وہ نیک دل عورت مجھے عارضی طور پر سہی، مگر پناہ دے سکتی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی خطرہ تھا کیونکہ گوردن کسی وقت بھی وہاں پہنچ سکتا تھا مگر بہر حال یہ کسی کے خیال و خواب میں بھی نہ ہوگا کہ میں وہاں چھپا ہوا ہو سکتا ہوں۔ اور پھر گوردن کو بھی تو اس کی دھوکہ بازی کا مزہ چکھانا ہے۔ چنانچہ یہ تہیہ کر کے میں کسی طرح چھپتا چھپاتا..... شالی کی جھگی کے قریب پہنچا اور موقع تاڑ کر اندر گھس گیا۔ حسب توقع شالی جھگی میں تھا تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔ بہن میں نے تمہاری بات نہ مانی اور اس مصیبت کا شکار ہو گیا..... کیا مجھے یہاں پناہ دے سکتی ہو.....؟ میں نے جتنی لہجے میں اس سے کہا کہ وہ مزید پریشان ہو گئی۔ تب اس نے میرے سامنے مزید انکشافات کئے اور بتایا کہ

..... درحقیقت سارا ڈھونگ تھا..... جو..... اس کے شوہر گوردن نے رچایا تھا اور اس ڈرامے میں ٹھا کر دیال سنگھ کی بہو..... شکنتلا نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس نے مجھے مزید روح فرسا انکشاف کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ..... شکنتلا درحقیقت..... ایک گوردن داس کے مہا گرو چیلہ رام کی داسی کنڈلی ہے..... جو شکنتلا کی

دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کردہ مسکراہٹ تھی۔ میں واپس جانے کیلئے پلٹا تو..... حرامی گوردن نے مجھے پکڑ لیا۔

”جاتا کدھر ہے تو..... سزا تو اپنی بھگت لے۔ میں نے غصے بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ اب میں اس کی سازش بھانپ گیا تھا، بلکہ مجھے تو شکنتلا بھی اس ڈرامے اور سازش کا حصہ لگ رہی تھی۔

میں نے نفرت اور غیظ جوش سے گوردن کو دھمکا دیا۔ اس کے..... ٹھا کر اور اس کے بیٹے شرام سنگھ نے اپنی جیبوں سے پستول نکال کر مجھ پر تان لئے۔ ”گوردن چلا کر ان سے بولا۔

”یہ مورکھ جانے نہ پائے سرکار.....! اس کا جادو اب ختم ہو چکا ہے..... اسے پکڑ لو..... یہ ہمارا اب کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

”خبردار.....! حرکت مت کرنا، ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔ گوردن داس کے حوصلہ اور ہلہ شیری پر ٹھا کر دیال سنگھ نے شعلہ بار لہجے میں مجھ سے کہا اور میں اپنی جگہ حیران و پریشان کھڑا ہو گیا۔ مکار اور فریبی گوردن داس..... خبیثانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گھورے جا رہا تھا۔ تب پھر آنا فنا حویلی کے خدمت گاروں نے مجھے قابو کر لیا اور دوبارہ ہال کمرے میں مجھے بیدردی سے کھینچتے ہوئے لے آئے۔

”م..... میرا..... قصور کیا ہے آخر..... میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے احتجاج کیا تو ٹھا کر دیال سنگھ کا بیٹا شرام سنگھ غیظ و غضب کے عالم میں میری طرف بڑھا اور زور سے میرے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر ڈالا۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑاسا گیا۔ حویلی کے خدمت گار مجھے دبوچے ہوئے تھے۔ میں نے غصہ بھری نظروں سے دھوکہ باز گوردن کی طرف دیکھا..... اور پھر ٹھا کر دیال سنگھ اور اس کے بیٹے شرام سنگھ کو ساری بات سے آگاہ کر دیا، مگر دونوں باپ بیٹے بھلا کب میری کسی بات پر اعتبار کرنے والے تھے۔ تب پھر ٹھا کر دیال سنگھ نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔

”اس مورکھ مردود کو تہہ خانے میں لے جا کر بند کر دو..... اسے ہم خود کل موت کی سزا دیں گے۔“ ٹھا کر دیال سنگھ کا سفاکانہ فیصلہ سن کر میں تھرا اٹھا اور مجھے بری

ہم شکل ہے اور اصل شکستلا کو گوردن نے اپنے گرو گھنٹال چیلہ رام کے کہنے پر اغوا کر کے..... اس کے قبضے میں پہنچا دیا تھا..... اس کی جگہ چیلہ رام نے اپنی عیاش داسی کنڈلی کو اس کی جگہ حویلی میں چھوڑ دیا تھا، کیونکہ اتفاق سے کنڈلی شکستلا کی ہم شکل تھی۔ کنڈلی کو اس کی جگہ پر لانے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ..... ٹھا کر خاندان اصل شکستلا کی تلاش یا اس کی کھوجنا کرنے کی کوششیں نہ کرتا..... چیلہ رام دراصل اپنے ایک دیرینہ حریف..... جگدوش کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ (جگدوش کے نام پر میں بری طرح چونکا تھا مگر میں نے اس بارے میں شالی سے۔۔۔ نہیں کہا تھا کہ بدستور اس کی بات غور سے سنتا رہا تھا)

چیلہ رام دراصل ناقابل تسخیر قوت حاصل کرنا چاہتا تھا..... اور اس کی رکاوٹ میں جگدوش حائل تھا۔ ”آمر سادھنا.....“ کی ناقابل تسخیر قوت کو جگدوش بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کیلئے دونوں کو ایک ایسی لڑکیاں درکار تھیں جو ان دونوں کے حساب سے ”پورن ماہ“ ہوں۔ چنانچہ جگدوش..... چیلہ رام نے اپنے کالے علم کے زور سے..... اس حقیقت کا پتہ لگالیا تھا کہ..... اس پورے سنسار میں صرف دو ہی ناریاں (لڑکیاں) ”پورن ماہ“ ہیں..... ایک پڑوس ملک کی سرحدی پور والی (گھاؤں) ”بیج گرایٹ“ میں رہتی ہے اور مرادے نام کی ایک غریب مزارع کی اکلوتی بیٹی ہے..... جس کا نام سوئی ہے۔ (”سوئی“ کے نام پر بھی میں چونکا تھا) اور دوسری ”پورن ماہ“ ناری (لڑکی) اس دیش کے ٹھا کر دیال سنگھ کی بہو یعنی اس کے لاڈلے بیٹے..... شرام سنگھ کی بیوی شکستلا ہے۔ چنانچہ اب..... جگدوش اور چیلہ رام کا یہ ”آمر سادھنا“ والا ”پاٹ“ تب ہی مکمل ہو سکتا تھا جب تک کہ دونوں ”پورن ماہ“ ناریاں (لڑکیاں) ان دونوں شیطان ساحروں جگدوش اور چیلہ رام کو حاصل نہ ہو جائیں۔ چونکہ اب ان دونوں شیطانی ساحروں کے قبضے میں ایک ایک ناری (لڑکی) آچکی تھی۔ اس لئے اب یہ دونوں ایک دوسرے سے نہر دآزما ہوئے..... تاکہ کسی ایک سے دوسری پورن ماہ ناری بھی چھین کر اپنے قبضے میں کر لیں۔ شکستلا کے بھیس میں کنڈلی نے جو ڈرامہ رچایا تھا وہ بھی دراصل چیلہ رام ہی کی جے بنانے کی ایک گھناؤنی سازش تھی۔ کیونکہ جگدوش کی

طرح چیلہ رام کو بھی اس حقیقت کا علم تھا..... ان کی بدی کی قوتوں کو نیست و نابود کرنے والا ایک درویش مسلم لڑکا..... شوکت حسین ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”شالی کی زبانی یہ ساری تفصیلات سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ گویا اب مجھے جگدوش کے ساتھ ساتھ ملعون چیلہ رام کو بھی صفحہ ہستی سے مٹانا تھا۔ شالی نے مجھے یہ سب بتایا تھا کہ..... جگدوش اور چیلہ رام نے اپنے کالے علم کے ذریعے اس بات کا بھی پتہ چلا لیا ہے کہ اس روئے زمین پر صرف میں ہی ان دونوں کو ہلاک کرنے کی قوت رکھتا ہوں، جسے اللہ کی دی ہوئی طاقت حاصل تھی۔

میں یہ سن کر مسرور بھی ہوا اور میرا دل جذبہ ایمانی سے سرشار ہو گیا۔ اچانک باہر آہٹ ابھری، شالی پریشان ہو گئی۔ میں نے اسے اپنے سلسلے میں خاموش رہنے کی تاکید کی اور پھر جھگی کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں..... گوردن داس بیٹھا کرتا تھا، میں چوکھٹ کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک میں نے گوردن کی ہانپتی ہوئی آواز سنی وہ اپنی بیوی شالی سے پوچھ رہا تھا۔

”شش..... شالی..... وہ مسئلہ ادھر تو نہیں آیا نا؟“

”نن..... نہیں تو..... بھلا وہ یہاں کیسے آ سکتا تھا۔ وہ تو تمہارے ساتھ گیا تھا..... کہاں گیا وہ؟ شالی نے بات بنا کر چالاکی سے الٹا اس سے سوال کر ڈالا..... وہ ایک جن تھا جس نے شکستلا دیوی کو قابو کر رکھا تھا۔ گوردن نے اس سے جھوٹ بولا۔..... تم ہوشیار رہنا۔ میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں.....“

پھر بھی..... میرے ساتھ پڑے مٹی کے چھ پانچ بڑے گڈے..... حرکت کرنے لگے انسانی ڈھانچے والی کھوپڑی بھی فضاء میں بلند ہو کر شور مچانے لگی۔ میں بوکھلا گیا۔ گوردن اپنے ان عجیب اخلقت جیلوں کا شور سن کر ادھر آ گیا۔ پھر مجھ پہ نگاہ پڑتے ہی وہ ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ ٹھیک اس وقت مٹی کے مادھو..... فضاء میں بلند ہو کر میرے ساتھ چمٹ گئے اور مجھے یوں لگا جیسے..... مٹی کے مادھو نہ ہوں بلکہ سلگتے ہوئے انگارے ہوں۔ میں تکلیف کی شدت سے کراہا اور پھر گوردن کی گردن چھوڑ کر..... اپنے جسم سے چمٹے مٹی کے مادھوؤں کو نوچنے لگا۔ اس

تھیں..... مگر..... شاید اللہ کے اس نیک بزرگ کی روح نے مجھے ان کے خونی شر سے محفوظ رکھا تھا۔

گوردن جھنجھلاہٹ آمیز غصے سے میرے قریب آیا اور میرے سینے پر ہاتھ پھیرا شاید یہ محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا جیسے میں نے کوئی آہنی خلعت نہ پہن رکھی ہو..... پھر دوسرے ہی لمحے اس خبیث نے میری قمیض کا گریبان پکڑ کر پوری قمیض پھاڑ ڈالی۔ اگلے ہی لمحے میرا اوپری بدن بالکل برہنہ ہو چکا تھا۔ میرے دائیں بازو پر ہنوز..... بابا کمال شاہ کا دیا ہوا تعویذ بندھا ہوا تھا۔ گوردن نے پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی خبیث مسکراہٹ کے ساتھ اپنا سر ہلایا پھر میرے بازو سے وہ تعویذ نوچنے کیلئے اس نے اپنا دائیہاں ہاتھ بڑھایا۔ میں رسن بستہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا تھا..... مگر میں اس خبیث کی تعویذ نوچنے کی نیت بھانپ کر پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن ادھر جیسے ہی اس خبیث نے میرے تعویذ کو ذرا چھوا ہی تھا کہ اچانک تیز سلگتی وئی چنگاریوں نے اس خبیث کا ہاتھ جھلس کر رکھ دیا..... وہ چیخ مار کر کئی قدم پیچھے لڑھک گیا اور اپنے جھلسے ہوئے ہاتھ کو جھٹکنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ تعویذ کی کرامات تھی کہ وہ چیلارام بھی پریشان ہو گیا۔

”اس مورکھ کو ٹھاکر کے آدمیوں کے حوالے کر دو۔ گرو! گوردن ہونٹ بھنج کر چیلارام سے بولا وہ بہ غور مجھے گھور رہا تھا۔ اللہ کی طاقت کے آگے وہ خبیث پنڈت بالکل بے بس تھا۔ وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ دونوں شیطان جانتے تھے کہ اپنے گرو کو سوسچتا ہوا پا کر گوردن دوبارہ چلا کر اس سے بولا۔ ”گرو! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مگر اسے دوسرے عام دشمنوں میں پھنسا تو سکتے ہیں ناں۔“ مکار گوردن کی یہ بات اس بار اس کے دل کو لگی۔ اب گویا ہم تینوں کو یہ یقین ہو گیا تھا۔ میں ان کے جادوگر شعبدوں اور کالے علم کے شیطان جھٹکنڈوں سے زیر ہونے والا نہیں ہوں۔ وہ بھی شاید اس صورت میں جبکہ میرے بازو میں بندھا ہوا وہ بابا کمال شاہ کا تعویذ تھا۔ البتہ دوسرے طریقے سے مجھے زیر کیا جاسکتا تھا۔ جس طرح انہوں نے مجھے ٹھاکر کے آدمیوں کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تھا اور ان دونوں نے

لمحے وہ کھوپڑی بھی میری پیشانی سے ٹکرائی اور میرے حلق سے تیز چیخ نکل گئی، پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو رسی کی جکڑ بندیوں میں بندھے ہوئے پایا۔ مجھے ایک سنگی ستون کے ساتھ رسیوں سمیت باندھا ہوا تھا۔ یہ ایک مخروطی چھت والا درمیانہ کمرہ تھا۔ سامنے میں نے ایک تنگ دھڑنگ سادھو کو دیکھا بلکہ سادھو کیا وہ پروہت پجاری نظر آ رہا تھا۔

موٹا تازہ سیاہ رو..... سرائے کے چھلکے کی طرح صاف..... ماتھے پر ترشول کا تلک اور نیچے گروے رنگ کی دھوتی۔ گلے میں مالا سیٹ اور ایک نقیش کنٹھ۔ نقشہ بھی کھینچ رکھا تھا۔ اس کی ناک موٹی تھی اور بڑی بڑی آنکھوں میں الاؤ جلتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بلا کی شیطانیت آمیز مقناطیسیت ٹپک رہی تھی۔ اس کے برابر میں خبیث گوردن بھی موجود تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے ٹھاکر کے آدمیوں کے حوالے کرنے کے بجائے یہ ذلیل گوردن سیدھا یہیں اپنے مہارگو گھنٹال چیلارام کے پاس ہی لے آیا تھا۔ مگر میں نے دیکھا ان دونوں کے بشروں پر الجھن آمیز پریشانی ٹپک رہی تھی۔ گوردن نے مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر اپنے گرو سے دانت پیس کر کہا۔

”گرو! یہ ہوش میں آ چکا ہے..... آپ اسے نشٹ (ختم) کرنے کی کوشش کرو۔“

چیلارام نے آگیا میں سر ہلایا اور پھر اپنے قریب ایک خوفناک صورت والی استادہ مورتی کے ہاتھ سے ترشول لیا اور پھر زیر لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے ترشول میری طرف اچھال دیا۔ مجھے اپنی موت یقینی محسوس ہوئی مگر..... دوسرے ہی لمحے مجھے بابا کمال شاہ کی نصیحت یاد آ گئی۔ میں نے دل ہی دل میں نے اپنے اللہ کے کلام پاک کا ورد کیا فضاء میں تیرتا ہوا میری طرف بڑھتا ترشول عین میرے سینے کے قریب پہنچ کر..... یوں گرا جیسے کسی ٹھوس آہنی چادر سے ٹکرا گیا ہو..... دوسرے ہی لمحے ترشول..... فرش پر گر گیا۔ دونوں کے خبیث چہروں پر پریشانی کے آثار مزید گہرے ہو گئے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ ان دونوں خبیثوں نے مجھے حالت بے ہوشی میں قتل کر ڈالنے کی مذموم کوششیں کی

دو ہاتھ دراز ہوئے اور دوسرے ہی لمحے اس کے سیاہ پنجوں کی خاکستری انگلیوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ میں نے دیکھا چیلرا رام کے گرد چھایا ہوا دھواں یکدم سرخ ہو گیا پھر ایک دل جلا دینے والی چنگاڑ ابھری۔ میں بری طرح دہل گیا کیونکہ میں اس چنگاڑ کو اچھی طرح پہچانتا تھا جو جگدوش کی تھی۔ دھواں سرخ سرخ ہو کے آگ کی شکل اختیار کر گیا پھر دوسرے ہی لمحے وہ شعلہ فشاں دھواں ایک عجیب الخلقہ شمشیر میں بدلنے لگا۔ میری پھٹی پھٹی نظروں نے یک چشم جگدوش کو دیکھا۔ وہ ایک سیاہ افریقی گوریلے کی مانند کھڑا تھا اور اس کی پیشانی پر بڑی سی لال انگارہ آنکھ کالی کی موتی کو گھور رہی تھی۔ ادھر چیلرا رام فرش پر گر ابری طرح ہانپ رہا تھا۔

اچانک موتی کے سیاہ خونناک چہرے کے تاثرات طیش میں بدلنے لگے۔ وہ اس کے کالے ہونٹوں سے سرخ رنگ کی دو شاخہ زبان باہر کولپ لپانے لگی۔ پھر جگدوش کو گھورتے ہوئے غرا کر بولی۔

”اوئے مورکھ! تجھے میرے مندر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی۔ چلا جا یہیں سے ورنہ ابھی تجھے جلا کر بھسم کر ڈالوں گی۔“

”تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کالی؟“ اچانک جگدوش نے غراہٹ آمیز لہجے میں ترکی بہ ترکی اس سے کہا۔

”مجھے عنقریب آمر سادھنا کی شکتی ملنے والی ہے۔ شرافت سے اس ناری شکتیلا کو میرے حوالے کر دے۔ ورنہ تیرا حال بھی چیلرا رام جیسا کر دوں گا۔“ اس کی دھمکی پر کالی کی موتی کے چہرے پر قہر و غضب کے تاثرات ابرے۔ میں ڈرنے لگا کہ کہیں خبیث شیطانوں کے درمیان میں نہ پس جاؤں۔

”چیلرا رام اٹھ جا اور اس گستاخ کو نکال باہر کز میری کالی شکتی تیرے ساتھ ہے۔“

کالی کی موتی نے فرش پر بے سدھ پڑے چیلرا رام سے کہا اور میں نے دیکھا کہ چیلرا رام کے بے سدھ شریر میں حرکت پیدا ہوئی اور دوسرے ہی لمحے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے شکتیلا کا ”جن“ بنانے کی سازش تیار کی۔

ٹھیک ہے تو اس وقت ٹھا کر دیال سنگھ کی حویل چلا جا اور انہیں خبر کر دے۔ اس سو کو تو گرفتار کر کے لے جائیے۔“ بلاآخر چیلرا رام نے اپنے چیلے گوردن سے تحکمانہ کہا۔ گوردن یہ حکم پاتے ہی چلا گیا۔ پہلے تو میں پریشان ہوا کہ اب ٹھا کر کے آدمی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر دوسرے ہی لمحے اچانک میرے ذہن میں نیا خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا میں نے سوچا۔

یہ دونوں چونکہ نہیں جانتے تھے کہ میں کنڈلی اور شکتیلا کے بارے میں حقیقت گوردن داس کی بیوی شالی کی زبانی جان چکا ہوں۔ چنانچہ میں نے یہی سوچا کہ جب ٹھا کر دیال سنگھ کے آدمی مجھے پکڑ کر اس کے سامنے پیش کریں گے تو میں انہیں ساری حقیقت بتا دوں گا کہ جس شکتیلا کو انہوں نے اپنی بہو سمجھا ہوا ہے وہ درحقیقت چیلرا رام کی داسی کنڈلی ہے جو شکتیلا کی ہم شکل ہے جبکہ اصلی شکتیلا چیلرا رام کے قبضے میں ہے جس پر وہ اپنا کالا علم کرنا چاہتا ہے۔

لہذا میں اب اس بات کا منتظر تھا کہ کب ٹھا کر کے آدمی کمرے میں آتے ہیں اور مجھے پکڑ کر اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور میں کب انہیں اس ساری حقیقت کی تفصیل سناتا ہوں۔

گوردن داس کو گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا چیلرا رام بھی میری طرح اس دھوئیں کو دیکھ کر بری طرح چونکا میں نے دیکھا وہ ہونٹوں میں کچھ بدباندی لگا اور اس نے دھوئیں پر پھونک مار دی۔ ایک گڑگڑاہٹ سی کمرے میں گونجی اور دھوئیں نے آنا فانا چیلرا رام کو گھیرے میں لے لیا۔ اگلے ہی لمحے چیلرا رام چیخنے چلانے لگا میرا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔ پھر اس کی کرب میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”کالی دیوی مجھے بچالے مجھ کو جگدوش سے بچا۔“

میں بری طرح دہل گیا کہ کیا یہ جگدوش تھا۔ میں بے چین ہو گیا ادھر اچانک وہاں فرش کے وسط میں کالی کی موتی کو حرکت کرتے دیکھا اس کے چہ ہاتھوں میں سے



اب دونوں شیطانی و خبیث ساحر ایک دوسرے کے روبرو خوفناک نظروں سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ تب چیلارام نے غرا کر اپنے دیرینہ دشمن سے کہا۔

”جگدوش! تو نے یہاں آ کر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ اب اگر تو اپنی جیون کی آشا چاہتا ہے تو وہ ”پورن ما“ ناری میرے حوالے کر دو۔ ورنہ میں تمہیں نپٹ کر کے خود ہی اسے اپنے قبضے میں کر لوں گا۔“ میں نے دیکھا گوریلا نما جگدوش کی خوفناک اکلوتی آنکھ کی سرخی مزید گہری ہو گئی اور پھر اس نے چیلارام کی بات مانے کی بجائے اناس سے بھی وہی سوال کر دیا جو چیلارام نے اس سے کیا تھا بس پھر کیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پچھاڑنا شروع کر دیا۔ چیلارام نے اپنی بھینسے جیسی موٹی گرن سے ایک جینواتار کر اس پر جلدی سے کچھ پڑھ کر پھونک مار کر جگدوش کی طرف اچھال دیا۔ گرے رنگ کا یہ جینو فضاء میں اڑتا ہوا آن واحد میں یک چشم جگدوش کی گردن کے گرد لپٹ گیا اور اگلے ہی لمحے جگدوش نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چیلارام کے پیچھے ہوئے اس جینو کو توڑنے کی کوشش کی مگر جینو اب شاید کسی پھانسی کے پھندے کی مانند جگدوش کی گردن کے گرد اپنا گھیرا تنک کرتا جا رہا تھا۔ کیونکہ جگدوش کے حلق سے اب تکلیف کے باعث خرخراتی آوازیں برآمد ہونے لگی تھی اور دم گھٹنے کی وجہ سے اس کی پیشانی پر ثبت اکلوتی آنکھ کا بڑا سا خوفناک سرخ سرخ ڈیلا باہر کواٹلنے لگا تھا۔ میں سنگی ستون سے رسن بستہ ان کی جادو بھری جنگ کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے جگدوش کی موت صاف نظر آرہی تھی اور میں دل ہی دل میں اللہ سے یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ یہ دونوں ہی خبیث شیطان ساحر آپس میں لڑ کر ختم ہو جائیں۔

ادھر جگدوش شدید جانکنی کے عالم میں زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہی جا رہا تھا مگر چیلارام اور کالی کی مورتی اسے شاید اپنے بچاؤ کا کوئی کالا منتر پورا کرنے نہیں دیتا چاہتے تھے۔ اس لئے کیونکہ اگلے ہی لمحے کالی کی دیوی نے ایک خوفناک چیخ بلند کی اور پھر اس کا پیٹ شق ہو گیا۔ میں نے پھیلی آگ آنکھوں سے دیکھ کر خوفناک منظر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا کیکڑا پھدک کر اس کے شق زدہ پتھریلے پیٹ سے نکلا۔

تیزی سے رینگتا ہوا اپنے دونوں بلیڈ نما بازوؤں کو کچلچلاتا ہوا جگدوش پر اچھل کر جھپٹا اور اس کے بالوں بھرے پیٹ سے چا چکا۔

جگدوش اب دوہری اذیت کا شکار ہو گیا۔ بے اختیار اس کے حلق سے وحشیانہ غراٹیں ابلنے لگیں۔ کالی کی دیوی کے چیلارام کی کامیابی پر نٹے میں چور قہقہے گونجنے لگے۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا۔ جگدوش کا قوی الجشہ وجود دھوئیں میں تحلیل ہونے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”کیا یہ نپٹ (ختم) ہو گیا۔ کالی دیوی۔ گر؟ جگدوش کے غائب ہوتے ہی خوشی سے چلا کر پوچھا۔

”نہیں۔ یہ مورکھ بھاگ گیا ہے۔ کالی دیوی کا لہجہ فتح سے چور تھا۔ مگر چیلارام کے چہرے پر از حد مایوسی امنڈ آئی۔

”مگر۔“ تجھے اب چتا کرنے کی ضرورت نہیں چیلارام! ”اچانک کالی دیوی نے اسے تسلی دینے کی غرض سے گونجدار لہجے میں کہا۔ ”یہ اب کبھی ہمارا راستہ کھونا کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔“

”مم..... مگر دیوی.....! اس مورکھ کا مرجانا ضروری تھا، ورنہ میں کس طرح۔ اس قبضے سے وہ ”پورن ماہ“ کنیا (لڑکی) کو حاصل کر سکوں گا۔ جس کے بغیر مجھے ”امر سادھنا“ کا پاتھ کرنا ناممکن ہوگا۔“ چیلارام نے پریشان کن تفکر سے کہا۔

”..... چیلارام! اس کنیا کو تو نے خود حاصل کرنا ہوگا.....“ کالی دیوی! بارعب لہجے میں اس سے کہا۔

”جگدوش نے اسے..... یہاں سے دو سو کوس دور ایک ہمالیائی پر بت کے ”مپت“ میں قید کر رکھا ہے۔ تو فوراً وہاں پہنچ جا..... میری کالی شکلیاں تیرے ساتھ ہیں۔ یہ کہہ کر..... کالی دیوی دوبارہ ساکت ہو کر پتھر کی بے جان مورتی میں بدل گئی..... اب ہال میں سناٹا چھا گیا تھا۔ کالی دیوی کی ”کنیا“ والی بات پر میری سمجھ میں آیا..... یقیناً وہ کنیا..... سوہنی ہوگی۔ میری جان جاناں حسین سوہنی..... جسے پانے اور جسے حاصل کرنے کیلئے..... میں اب تک کس قدر کھٹائیوں سے گزرا تھا اور اب بھی نجانے مزید

نے ایسا کوئی بھی شیطانی کام نہیں کیا ہے..... بلکہ..... آپ..... آپ..... جس لڑکی کو اپنی بہو شکنتلا سمجھ رہے ہیں۔..... وہ..... دراصل شکنتلا نہیں..... بلکہ اس کی ہم شکل..... کنڈلی نامی ایک عورت ہے۔ جو ایک خبیث پنڈت..... چیلارام کی داسی ہے۔ میری بات سن کر..... ٹھاکر دیال سنگھ ہی نہیں بلکہ اس کا لاڈلا بیٹا شرام سنگھ بھی بری طرح چونک پڑا۔

”البتہ..... شکنتلا (کنڈلی) ضرور پریشان نظر آنے لگی تھی۔ اس کے شاید سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ..... اس کی اصلیت سے واقف ہوں۔ اس وقت گوردن بھی وہیں موجود تھا۔ اس کا بھی منہ کھل گیا تھا۔

”یہ..... یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو.....؟ اچانک ٹھاکر شرام سنگھ نے جھنجھلاہٹ آمیز غصے سے کہا۔ ”میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں..... ٹھاکر صاحب! میری بات کا یقین کرو..... میں نے پرزور لہجے میں کہا۔

”کیا ثبوت ہے اس بات کا تمہارے پاس؟“ ٹھاکر دیال سنگھ نے مجھ سے کافی درشت لہجے میں پوچھا، اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا..... ٹھاکر شرام سنگھ کے ساتھ لگی لڑکی شکنتلا (کنڈلی) نے ایک دم اپنے شوہر کا بازو تھام لیا اور مگر مجھ کے آنسو بہاتی ہوئی اس سے بولی۔

”..... یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔ آپ اسے فوراً قید خانے میں ڈال دو..... یہ مورکھ ہم پتی پتی کے بیچ دراڑ ڈالنا چاہتا ہے۔“ اس کی مکاری پر مجھے غصہ آ گیا۔ مگر گوردن نے بھی فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ٹھاکر سے کہا۔ ”سرکار! اس مورکھ کی باتوں میں نہ آؤ..... یہ اپنی کمتی کی خاطر ایسا سنگین جھوٹ بول رہا ہے۔ اس میں جرات کیسے ہوئی..... اتنے بڑے خاندان کی عزت اچھالنے کی..... اسے فوراً داخل زندان کر دیا جائے۔“

بڑے ٹھاکر دیال سنگھ نے فوراً حکم صادر کیا۔ میں چیخنے چلانے لگا۔ کہ اچانک چھوٹے ٹھاکر شرام سنگھ نے بہ آواز بلند ”ٹھہرو“ یہ کہہ کر اپنے آدمیوں کو مجھے لے جانے سے روکا۔ گوردن اور شکنتلا (کنڈلی) کی حالت پتی ہو گئی۔ چھوٹے ٹھاکر شرام سنگھ چند

کتنی تکلیفیں میرے حصے میں آنا تھیں۔ مگر میں نے بھی دل میں عزم مصمم کر رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے..... میں اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہوں گا۔

میرے لئے اب..... یک نہ شد..... دوشد والی بات ہو گئی ہے۔ مجھے اب بیک وقت ان دونوں شیطانوں یعنی..... جلدوش اور چیلارام سے برسر پیکار ہونا تھا، مگر مجھے اس خبیث گوردن داس نے دوسرے ہی چکر میں پھنسا دیا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تو..... ہال میں دس بارہ مسلح افراد داخل ہوئے۔ میرا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ میں سمجھ گیا یہ ٹھاکر دیال سنگھ کے آدمی ہیں۔ پھر مجھے ان کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ مجھے بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے ٹھاکر دیال سنگھ کی حویلی میں لے آئے اور مجھے اس کے قدموں میں پھینک دیا۔

اس وقت ٹھاکر دیال سنگھ کے ساتھ اس کا لاڈلا بیٹا..... ٹھاکر شرام سنگھ بھی وہاں موجود تھا۔ اس کی پتی..... یعنی شکنتلا کی ہم شکل کنڈلی بھی کھڑی تھی۔ وہ سب مجھے قہر بار نظروں سے گھورے جا رہے تھے، پھر ٹھاکر دیال سنگھ نے اپنے گماشتوں کو گرجدار آواز میں حکم دیا۔

”اس مورکھ کو لے جا کر اس کی آنکھیں نکال دو..... اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے کنوئیں میں پھینک دو۔“

میں اس کا حکم سن کر دھل گیا اور پھر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا تو فوراً ہی دو چار گماشتوں نے پکڑ لیا۔ میں نے چلا کر..... ٹھاکر دیال سنگھ سے کہا۔

”ٹھاکر صاحب.....! میری بات سنو..... میں جن نہیں ہوں..... میں تو..... ایک مسلمان شخص ہوں اور ایک عام آدمی ہوں.....“ یہ کہہ کر میں نے زیر لب کلمہ بھی پڑھ ڈالا۔ ٹھاکر دیال سنگھ کچھ پر..... رنگ سا آ کر گزر گیا مگر اس کی طیش ناک میں پھر بھی کمی واقع نہ ہوئی۔ پھر وہ گھورتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”تو نے ہماری بھولی سی بہو شکنتلا دیوی کو ستانے کا جرم کیا ہے..... ایک مسلمان کو یہ گندی اور شیطانی حرکت زیب دیتی ہے۔“

”ٹھاکر صاحب! میں اپنے اللہ اور رسولؐ کی قسم کھا کر کہتا ہوں..... کہ میں

گا اس نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی مگر..... ٹھا کر دیال سنگھ کے آدمیوں نے اسے مرغی کی طرح دیوچ لیا۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ٹھکٹلا (کنڈلی) کی چیخ سنائی دی..... ہم سب نے دیکھا کہ چھوٹا ٹھا کر شرام سنگھ..... ٹھکٹلا (کنڈلی) کو بالوں سے پکڑے کھینچتا ہوا لارہا تھا..... اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ ورنہ جانے یہ دونوں غصہ در باپ بیٹے میرا کیا حشر کرتے؟ ٹھا کر دیال سنگھ نے پہلی بار جیسے ملاحت آمیزی سے دیکھا..... میرا کاغذ ہاتھ پھپھاتے ہوئے بولے۔

”..... شاباش! آپ واقعی ایک سچے مسلمان ہو..... ہم تمہیں اپنا دوست سمجھتے ہیں اور تمہارے احسان مند ہیں..... مگر ہمیں اب اپنی پھول سی پیاری بہو ٹھکٹلا کس طرح ملے گی؟

”ٹھا کر صاحب!..... ٹھکٹلا دیوی..... اس حرام خور خبیث پنڈت چیلارام کی قید میں ہے..... مگر کیا آپ کے آدمی..... اس شیطان ساحر..... چیلارام کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟“

”شاید نہیں.....“ ٹھا کر نے مایوسانہ بے بسی سے کہا۔ ”تو ان کا بیٹا ٹھا کر شرام سنگھ مجھ سے ملتی لہجے میں بولا۔..... دوست! تمہارا نام کیا ہے.....“

”میرا نام شوکت حسین ہے۔“

”تم اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہو..... ہم تم سے درخواست کریں گے.....“

”جی..... میں کوشش کروں گا.....“ میں نے تہہ دل سے سر ہلایا۔ پھر گوردن کی طرف دیکھ کر غصیلے لہجے میں بولا۔

”..... چیلارام کے تم کتے ہو۔ بتاؤ اس نے ٹھکٹلا دیوی کو..... کدھر رکھا ہے؟“

پہلے تو اس کی آنکھوں میں میرے لئے معاندانہ چمک ابھری..... پھر دوسرے ہی لمحے منمناتے ہوئے بولا۔

قدم میرے قریب بڑھا..... پھر بغور میری آنکھوں میں گھورتا ہوا بولا۔

”..... تم اتنی بڑی بات اتنے دشواری (یقین) کے ساتھ کیسے کہہ رہے ہو..... کوئی ثبوت بھی ہے اس کا تمہارے پاس.....؟ اس کی بات سن کر میرے اندر امید کی ٹھکٹلا گونج اٹھی۔

میں نے کہا۔ ”چھوٹے ٹھا کر صاحب! میں آپ کو ساری کھانا سنا ہوں..... یہ کہہ کر میں نے انہیں..... جگدوش اور سوئی سے لے کر..... چیلارام اور کالی دیوی کے جادوئی شعبدوں اور لڑائی کے متعلق نیز پورن ماہ کی حقیقت کے بارے میں سب کچھ بتا ڈالا..... میری ساری رام کھانا سننے کے بعد، سب دم بخود رہ گئے..... پورن ماہ والی بات پر چھوٹے ٹھا کر شرام سنگھ نے مجھ سے کہا۔

”..... یہ نشان واقعی ہم نے اپنی جتنی ٹھکٹلا کے دائیں کاغذ پر دیکھا ہے..... جو ابھی تک موجود ہے۔ اگر..... یہ اصل ٹھکٹلا نہیں تو پھر اس کے کاغذ پر پورن ماہ کا نشان نہیں ہونا چاہئے تھا۔“

”ٹھا کر صاحب! مجھے پورا یقین ہے کہ..... یہ نشان نقل ہوگا..... میں آپ سے درخواست کروں گا کہ..... آپ خود جا کر اس نشان کو صاف کر ڈالیں۔ یہ دھل جائے گا.....“

اب تو ٹھکٹلا اور گوردن دونوں کی حالت غیر ہو گئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ..... کنڈلی کو اصل ٹھکٹلا بنانے کیلئے ان مکاروں کے ٹولوں یعنی چیلارام، کنڈلی اور گوردن داس نے ایک ایسا ہی نقلی نشان کنڈلی کے کاغذ پر بھی کندہ کر دیا ہوگا..... کیونکہ بہر حال یہ نشان پہلے بھی ٹھا کر شرام سنگھ نے اپنی اصل جتنی ٹھکٹلا کے کاغذ پر دیکھا ہوگا۔ کنڈلی کے کاغذ پر اس کی غیر موجودگی..... یقیناً اسے شک میں مبتلا کر سکتی ہے۔ اس لئے انہوں نے نقلی نشان بنا دیا ہوگا۔

بہر طور..... ٹھا کر شرام سنگھ ٹھکٹلا (کنڈلی) کو اپنے ساتھ لے گیا۔

ادھر جب مکار گوردن داس نے بھاڑہ پھونٹے دیکھا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ..... کنڈلی کے کاغذ پر کاغذ کا نشان نقلی ہونے کا باعث..... مٹ جانے میں دیر نہیں لگائے

کے ساتھ ساتھ چیلرا رام بھی تمہیں جلا کر خاکستر کر دے گا۔ میں نے بغور، اپنی بات کی اثر پذیری بھانپتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے خاطر خواہ امید بندھنے لگی کیونکہ..... اس کے مضطرب الحال چہرے کے تاثرات ایک پرسوج سی خاموشی میں بدلنے لگے..... اٹائے راہ..... چھوٹے ٹھا کر شرام سنگھ نے پھر غصہ دکھانے کی کوشش کی مگر میں نے ہاتھ کے خفیف اشارے سے اسے روک دیا۔

”..... چیلرا رام کو ہلاک کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے.....“ بلا آخر..... گوردن نے مری مری آواز میں کہا۔

”کون سا جلدی بتاؤ۔“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”..... کالی دیوی کے مندر کے چاروں طرف اگر الگ لگادی جائے..... آتش

تیروں سے مندر میں حملہ کیا جائے کہ بدی کی کالی دیوی کے ساتھ ساتھ چیلرا رام بھی نچٹ ہو جائے گا۔“ اس نے بتایا۔

”مگر..... اس طرح تو میری سندرسمان جتنی شکنتلا بھی ہلاک ہو جائے گی۔“

چھوٹے ٹھا کر شرام سنگھ نے پریشان ہو کر کہا تو گوردن جلدی سے بولا۔

”نہیں چھوٹے ٹھا کر.....! وہ..... بالکل محفوظ رہے گی..... کیونکہ مندر کا تہہ

خانہ..... گنیش دیوتا پر آستان کی وجہ سے اگنی سے محفوظ رہے گا.....“

میں کچھ سوچ کر..... بڑے ٹھا کر دیال سنگھ سے احتراماً بولا۔

”..... میرے خیال سے ٹھا کر صاحب! ہمیں یہی کرنا چاہئے.....“ میں نے

دل ہی دل میں سوچا کہ اس طرح کم بخت ایک شیطان سے تو جان چھوٹے گی..... بس

پھر کیا تھا..... ٹھا کر دیال سنگھ نے اسی وقت اپنی فوج کے سالار..... رتن کمار کو طلب کیا

اور اسے فوراً حکم دیا کہ اس وقت مندر کو نذر آتش کرنے کیلئے دوسو آتشیں تیروں کا

بندوبست کیا جائے۔ سالار رتن کمار یہ حکم سن کر پریشان ہو گیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

”..... سرکار.....! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں.....! اس طرح تو فساد کھڑا ہو

جائے گا۔ یہ تو پاپ ہے۔“

اس کی بات پر دونوں باپ بیٹوں کے چہروں پر ذرا ٹھکر کے آثار نمودار

”م..... میں کیا جانوں..... مجھے علم نہیں۔“

”جھوٹ مت بولو.....“ میں چیخا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”اچھی طرح جانتے ہو کہ..... چیلرا رام نے سندرسمان شکنتلا دیوی کو کہاں قید

کر رکھا ہے، کیونکہ تمہاری مدد سے ہی..... شکنتلا دیوی..... اس کے قبضے تک پہنچی ہے۔“

میری بات پر گوردن لا جواب سا ہونے لگا۔ تب پھر چھوٹے ٹھا کر شرام سنگھ

نے غصے سے دانت بھینچتے ہوئے آگے بڑھ کر..... گوردن کے چہرے پر زور دار تھپڑ رسید

کر دیا اور اپنے آدمیوں سے بولا۔

”..... اس خبیث کو تہہ خانے میں لے جا کر اس کی دونوں آنکھوں نکال

دو..... اگر یہ پھر بھی سچ نہ بولے تو اس کی گردن اڑا دیتا۔“ چھوٹے ٹھا کر..... شرام سنگھ کا

حکم سن کر..... گوردن داس کے چہرے پر خوف کی پیلاہٹ پھیلتی چلی گئی اور اس نے

اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے..... لرزیدہ آواز میں بولا۔

”میں..... بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔“

ہم سب اس کے بولنے کے منتظر تھے، پھر وہ بتانے لگا۔

”..... شکنتلا دیوی..... کو..... سچ..... چیلرا رام نے اپنے پاس ہی..... یعنی

کالی کے مندر کے تہہ خانے میں قید کر رکھا ہے۔“

”چیلرا رام پر اسرار تو توں کا مالک ہے..... اس کا توڑ بتاؤ..... میں.....؟ میں

نے درشت لہجے میں اس سے پوچھا تو وہ بوکھلا کر بولا..... بھلا میں کیا اس کا توڑ بتا سکتا

ہوں..... تم..... تم اس کا مقابلہ خود کر سکتے ہو.....؟ مجھے اس کے لہجے سے پھر مکاری

کی بو آتی محسوس ہوئی..... میں نے زہر خند لہجے میں اس سے کہا..... دیکھو گوردن

داس.....! تم نے بہر حال اس ٹھا کر خانوادے کے ساتھ..... کھلوڑ کر کے..... نہ صرف

بہت بڑا اور سنگین جرم کیا ہے..... بلکہ مجھے بھی اس جرم میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔

اگر تم..... مجھے چیلرا رام کو نیست و نابود کرنے کی کوئی راہ دکھا دو تو اس میں تمہارا ہی بھلا

ہے..... کیونکہ تم اس کے بہت قریبی چیلے رہ چکے ہو..... اس طرح میں ٹھا کر صاحب

سے تمہاری جان بخشی کی سفارش کر دوں گا، ورنہ ہم تو نہیں چھوڑیں گے تمہیں..... اس

ہو گئے۔ میں خود بھی خاموش رہا تو گوردن داس جلدی سے اپنے نمبر بڑھاتے ہوئے بولا۔

”..... مندر کو کچھ بھی نہ ہوگا..... کیونکہ..... اس مندر میں ایک شیطان نے قبضہ جما رکھا ہے..... جب چیلارام اس آگ میں جل کر جسم ہو جائے گا تو مندر اپنی جگہ ویسے کا ویسے رہے گا۔“

اس کی بات پر سب نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔

بس پھر کیا تھا..... اس وقت فوج تیار کی گئی..... ہم سب..... یعنی ٹھا کر دیال سنگھ اور ان کا بیٹا شرام سنگھ ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس فوج کے ساتھ مندر کی طرف چل دیے۔

مندر کے قریب پہنچتے ہی پہلے..... یہ پتہ کیا گیا کہ..... آیا..... چیلارام اندر موجود بھی ہے یا نہیں..... اس کی اندر موجودگی کی تسلی ہوتے ہی..... ٹھا کر کے اشارے پر مندر کو چاروں طرف سے پہلے گھیر لیا گیا اور پھر آتشیں تیروں کی بارش کر ڈالی۔ بل بھر میں پورے مندر کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ خبیث شیطان چیلارام اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا..... پھر دیکھتے ہی دیکھتے..... آگ سرد پڑتی چلی گئی..... ہم نے دیکھا کہ..... مندر بالکل ویسی ہی حالت میں تھا..... آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے اسے جلایا تھا نہ اس کی دیواریں کالی ہوئی تھیں۔ جب ہم سب سالار رتن کمار اور چند سپاہیوں کے ساتھ اندر پہنچے تو..... ہمیں وہاں راکھ کے ڈھیر نظر آئے..... پھر سالار رتن کمار نے اپنے سپاہیوں کو تہہ خانہ تلاش کرنے کو کہا..... سپاہیوں نے آنا فانا پورا مندر کھال ڈالا..... میں اور ٹھا کر دیال سنگھ اور اس کا بیٹا شرام سنگھ بھی مندر کے اندر داخل ہو گئے..... میں نے خاص طور سے اندر آتے ہی گرد و پیش کا جائزہ لیا..... مجھے ایک طرف کالی کابوت بھی جلی ہوئی مٹی کے ڈھیر کی صورت نظر آیا..... اس کے قریب ہی راکھ کی مختصر ڈھیری بھی بکھری ہوئی نظر آئی..... میں نے اپنی تسلی کی غرض سے اس خبیث..... گوردن داس سے پوچھا۔

”کیا..... چیلارام کا خاتمہ ہو گیا ہے..... یاد رکھو..... اگر تم نے ذرا بھی

جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو میں ٹھا کر صاحب سے تمہیں سخت سزا دلاؤں گا۔ کیونکہ تم اب اس کی قید میں رہو گے۔ میری بات پر گوردن داس نے کینہ پرور نظروں سے مجھے گھورا..... مگر ٹھا کر دیال سنگھ اور..... شرام سنگھ کی موجودگی میں اسے مجھ سے کوئی سخت بات کہنے کی جرات نہ ہو سکی ورنہ تو وہ مجھ پر بری طرح خار کھائے بیٹھا تھا۔

”ہاں..... یہ سب نچٹ ہو چکے ہیں۔“ وہ مختصر اُ بولا۔

اتنے میں سپاہیوں نے زمین دوز تہہ خانے کا سراغ بھی لگالیا اور اصلی شکستلا کو بھی اس کے اندر سے نکال لائے..... شکستلا بلاشبہ حسین تھی مگر اس سے اس کا گلاب سا چہرہ قید و بند کی صعوبتوں سے بالکل کلا کر رہ گیا تھا..... اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ بالکل، اس خبیث ساحر چیلارام کی داسی کنڈلی کی ہم شکل تھی۔ شکستلا نے اپنے پتی، شرام سنگھ کو دیکھا تو ایک مجبوری کراہ آمیز چیخ کے ساتھ اس کی طرف بڑھی، دونوں پچھڑے ہوئے میاں بیوی ملے اور ٹھا کر دیال سنگھ انہیں خوش دیکھ کر نہال ہو گیا۔ اس وقت ٹھا کر نے اپنے سینہ پتی رتن کمار کو حکم دیا کہ فوراً اس مندر کی تعمیر نئے سرے سے شروع کرادی جائے۔ اس کے بعد ہم سب حویلی آ گئے..... اس واقعہ کے بعد سے حویلی میں میری خوب آؤ بھگت ہونے لگی تھی، مگر میری منزل آگے تھی۔ میں نے وہاں سے جانے کی اجازت چاہی اور ٹھا کر دیال سنگھ اور شرام سنگھ سے شکستلا کے بارے میں خاص طور پر محتاط رہنے کو کہا..... کیونکہ..... میں نے انہیں جہنم واصل چیلارام اور جگدوش کے کالے کرتوتوں کے بارے میں آگاہ کیا کہ..... اب انہیں جگدوش سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ..... چیلارام کے مرنے کے بعد جگدوش..... کی یہی کوشش ہوگی کہ..... اب وہ..... شکستلا کو ”امر سادھنا“ کی شکتی حاصل کرنے کیلئے اغوا کر سکتا ہے۔ کیونکہ شکستلا اس کے کالے علم کے حساب سے ”پورن ماہ“ ہے..... جبکہ ایک ایسی ہی دوسری پورن ماہ لڑکی..... سوئی، جس سے میں از حد محبت کرتا ہوں وہ بد قسمتی سے جگدوش کے قبضے میں ہے جس نے اسے ہمالیہ کی برف پوش گہرائیوں میں کہیں قید کر رکھا ہے.....“ میری رام کتھا سننے کے بعد ٹھا کر دیال سنگھ اور شرام سنگھ..... مبہوت سے رہ گئے..... تب پھر جیسے ٹھا کر دیال سنگھ میرا ممنون و احسان

جیسا کہ جہنم واصل چلا رام اور اس کے شتو نگڑے گوردن داس سے نبرد آزمائی کے دوران ہی مجھے اس بارے میں علم ہو چکا تھا کہ وہ بد بخت صد مردود..... جگدوش..... ایک ”دشوا نگ“ نامی ہمالیائی ریاست کی برف پوش بلند یوں میں کسی پرانے معبد میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا اور سوئی کو بھی اس مردود نے وہیں اپنے پاس قید کر رکھا تھا۔ میں اب جان گیا تھا کہ اس یک چشم شیطان جگدوش نے پاتال کے بعد یہاں کیوں ڈیرہ ڈال رکھا تھا اس کا مقصد یقیناً چلا رام کے قبضے سے ٹھاکر دیال سنگھ کی بہو..... شکنتلا کو بھی اپنی قیدی بنانا تھا تا کہ سوئی کے ساتھ شکنتلا کو بھی اپنی قید میں رکھنے ہوئے ان پر اپنے ”امر سادھنا“ والے کالے مंत्रوں کا جاپ مکمل کر سکے اور ہمیشہ کی پراسرار شیطانی طاقتوں والی زندگی حاصل کر لے۔

ٹھاکر دیال سنگھ نے مجھ پر ایک مہربانی کی تھی کہ اپنے چار سپاہیوں کے ذریعے دو گھوڑوں والے تانگے پر مجھے ہمالیہ کی ریاست ”دشوا نگ“ پہنچانے کا بندوبست کر دیا تھا جو مجھے وہاں اتار کر واپس لوٹ گئے تھے۔ اس وقت دن کا سماں تھا۔ میرے سامنے ہمالیہ کے بلند و بالا برف پوش پہاڑ تھے۔ یہاں سبزہ کی بھی بہتات تھی اور گھنے درختوں کی بھی۔ میرے سامنے کا منظر بڑا ہی دل فریب تھا جیسا کہ کسی خوبصورت لینڈ اسکیپ پینٹنگ کا ہو سکتا تھا۔ گہرے نیلے آکاش پر دودھیا بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں تیرتی..... سر بفلک برف پوش چوٹیوں سے اٹھکیلیاں کرتی نظر آ رہی تھیں۔ سرخ سرخ کلفیوں والے راج سنہو لے اور سرخ و کالے جل کوے خوشی المانی بکھیر رہے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس کھینچی اور تازہ اور کھلی ہوا سے پیچھڑوں کو بھرا اس کے بعد آگے چل پڑا۔

ایک بر فیلے درے کو بار کرنے کے بعد سامنے وادی میں بکھرے کچے کچے

مند ہوتے ہوئے بولا..... اے نیک اور ہمدرد نو جوان..... جس طرح تو نے ہماری مدد کی ہے..... ہم بھی تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے..... تمہارے ساتھ..... ہمالیہ کے سفر پر ہم اپنے سپاہی روانہ کریں گے.....“ میں اس کی بات پر مسکرایا اور بولا ”ٹھاکر صاحب! آپ کا بہت شکریہ..... مگر..... میں اس خبیث جگدوش کو اچھی طرح جانتا ہوں اور اسے قابو کرنا بھی۔ وہ ایک زبردست ساحر ہے..... آپ کی فوج اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

”مگر دوست! تم اکیلے کس طاقت کے بل بوتے پر اتنے بڑے ساحر کا مقابلہ کرو گے؟

ٹھاکر کا بیٹا..... شرام سنگھ مجھ سے بولا۔ تو میں نے طمانیت بھری مسکراہٹ سے کہا۔

”..... میرے پاس اللہ کی طاقت ہے..... جو سب سے بڑا ہے اور لازوال طاقتوں کا مالک ہے۔ اس کے بعد میں ان سب کو حیران و پریشان چھوڑ کر حویلی سے نکل گیا۔

اب میری منزل ہمالیہ کے برف پوش پہاڑ تھے سرد ٹھنھرتی ہوئی وادیاں۔ میں اللہ کا نام لے کر آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

اپنے چہرے پر گرم گرم بھکاریوں کا احساس ہوا میں تڑپ کر اٹھا تو ایک پہاڑی بکرے کو، جو اپنی تھوٹھی میرے چہرے کے قریب کئے ہوئے تھا، یک دم بدک کر بھاگتے دیکھا۔ میں نے اطراف میں دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میرے چاروں طرف جنگلی ہوئی طلسماتی سی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ میرا دل جانے کیوں بے تحاشا دھک دھک کرنے لگا۔ یہ نہیں یہ ویران برف زار کا اثر تھا یا کوئی اور بات تھی..... بہر حال میں اپنی چادر سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ماحول پر ٹھنڈ کا اثر غالب تھا مگر یہ سردی قابل برداشت تھی۔ حد نگاہ برف پوش پہاڑیاں مغرور ہمالیائی شہزادیوں کی طرح چاندی کے بریلے تاج سجائے ایستادہ تھیں۔ چہار سو پر ہول سناٹا اور گہرا دم بخود سکوت چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر اگرچہ تارے ٹٹمارہے تھے اور دور طباق چاند بھی نکا ہوا تھا مگر بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں جب کبھی چاند کے رخ روشن کو ڈھانپ لیتیں تو گھور تاریکی سی چھا جاتی۔ مگر اس وقت مجھے سامنے درہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور آگے بڑھ گیا..... تھوڑا بہت کھاپی کر نیند لینے کے بعد اب میری ساری تھکاوٹ دور ہو چکی تھی اور میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ لگ بھگ کوئی پون گھنٹہ پیدل چلتے رہنے کے بعد میں بلا آخر درے کے قریب پہنچ ہی گیا۔ درے کے پار سامنے مجھے وہ پہاڑی نظر آنے لگی جس کے عقب میں جگدوش کا معبد خانہ تھا۔ آگے جھاڑی دار ڈھلوان تھی میں سنبھل کے نیچے اترنے لگا..... یہاں کہیں برف کی وجہ سے پھسلن بھی تھی۔ یہی سبب تھا کہ اچانک ایک مقام پر میرا پاؤں پھسلا اور میں لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا شکر تھا کہ یہ بریلی ڈھلوان زیادہ گہری نہ تھی اس لئے جلد ہی میں ایک مسطح قطع پر آ پڑا۔ میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے کھدر کی موٹی گرم چادر کو درست کر کے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور پہاڑی کی طرف چل دیا۔ مذکورہ پہاڑی خاصی بلند تھی مگر مجھے لگ بھگ کوئی ستر اسی گز کے فاصلے پر ایک اندھیری دراڑ نظر آ رہی تھی۔ دور سے تو مجھے دراڑ ہی نظر آ رہی تھی اب اللہ معلوم وہ..... کوئی کھوہ تھی یا دراڑ..... بہر طور..... میں نے اب پہاڑی کے قریب پہنچ کر اپنی مقدور بھر کوشش سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی ذرا ہی بلندی طے کی ہوگی کہ میرا دم بری طرح پھول گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ عموداً چلنا کتنا دشوار تھا، مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ نامساعد

سرکنڈوں کے ڈھلوان چھتوں والے گھر نظر آرہے تھے۔ جس کے چہار اطراف گندم اور مکئی کے کھیت بھی پھیلے ہوئے تھے۔ میرا ارادہ آبادی کے اندر داخل ہونے کا نہیں تھا۔ خیال یہی تھا کہ..... پاس قریب میں کوئی طے تو میں اس سے کچھ پوچھ سکوں۔ میں اب بلندی سے ترائی میں اترنے لگا۔ یہ ڈھلوان گہرے سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں ایک بل کھاتی ڈھلوانی پگڈنڈی سے نیچے اتر رہا تھا۔ حسب منشا مجھے سامنے ایک جوان عورت اور اس کے ہمراہ ایک بوڑھا شخص دکھائی دیا جو ساٹھا پاٹھا تھا۔ میں نے ان کے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ وہ حیران کن نظروں سے مجھے تنکے لگے۔ انہوں نے مقامی طرز کے شلو کے نما لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ عورت کی رنگت سرخ و سفید تھی اور آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں ان سے ایک پرانے معبد کے بارے میں پوچھا وہ سمجھے میں کسی دلائی لاما سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کسی مقدس ”سترپا“ کا نام لینے لگے تو میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا..... وہ معبد کسی کاھن کا تھا جواب خاصے طویل عرصے سے ویران پڑا ہوا ہے۔ میرا مخاطب..... بوڑھا تھا۔ میری صراحت پر ذرا چونکا پھر چند ثانیوں کی پرسوج خاموشی کے بعد اس نے دائیں جانب نسبتاً بلند بریلی پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اس طرف دو آٹھ سانسے بریلے دروں کے پار ایک پہاڑی کے عقب میں ”گوپا“ نما معبد خانہ ہے۔

میں خوش ہو گیا اور اس بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ دیکھنے میں دونوں درے مجھے محض چند کوس کے فاصلے پر ہی نظر آرہے تھے مگر جب میں بدستور چلتا رہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ جس طرح طویل لبق ووق صحرا میں سراب کا دھوکہ ہوتا ہے اس طرح ان سر بفلک پہاڑی سلسلوں میں بھی نزدیکی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ذرا ہی دیر بعد میرا دم پھول گیا۔ میں ذرا ستانے کیلئے رکا ایک قریبی تالاب سے میں نے اوک میں بھر کر پانی پیا۔ اس کے ایک پھل دار درخت سے کچھ رسیلے پھل توڑ کر کھائے..... دم سادھ کر وہیں بیٹھ رہا..... شکر تھا کہ مجھے ٹھاکر دیال سنگھ نے حویلی سے روانہ ہوتے وقت گرم لباس اور ایک کھدر کی موٹی چادر دے دی تھی۔ میں لینا تو میری لینے ہی آنکھ لگ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔ نجانے کتنی دیر بعد میری آنکھ کھلی تو مجھے

حالات کی کمین گاہ میں میرے گزرنے والے روز و شب نے مجھے سفر کی ان کھنائیوں سے نبرد آزما ہونے کا عادی بنا ڈالا تھا۔ بہر حال میں نے ذرا سستانے کے بعد پھر بلندی پر چڑھنا شروع کر دیا اور آخر کار کبھی سستانے اور کبھی چلتے ہوئے اس دراڑ کے قریب پہنچ ہی گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ..... جسے میں دراڑ سمجھے ہوئے تھا وہ ایک کھوہ تھی جس کا دھانہ بادی النظر میں دور سے دراڑ ہی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ بہر طور..... میں جب کھوہ کے ذرا نزدیک پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میں ذرا ہمت کر کے اندر داخل ہوا تھا میرے سامنے ایک بالکل ہی عجیب منظر تھا جسے دیکھ کر میں بری طرح چونکا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک دبلا پتلا جوگی ٹائپ شخص سر کے بل کھڑا تھا۔ اتنی سخت سردی کے باوجود اس کا اوپری خاکستری جسم برہنہ تھا اور نیچے صرف گیسوے رنگ کی دھوٹی بندھی ہوئی تھی۔ بس مختصر سے جانگے کی طرح..... یعنی گھٹنوں سے اوپر..... اس کی منحنی سی گردن پر جھولتی ہوئی ان گنت مالائیں بھی زمین سے لگی جھول رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مگر پھر بھی جوں کا توں سر کے بل کھڑا رہا..... کونے میں ایک لالٹین رکھی تھی اور بس جانے کیا کیا الابلابکھری ہوا تھا۔ میں آہستگی سے ذرا سر نیچا کیے خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا اور اس کے ”سیدھے“ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر گزری تو وہ فوراً سیدھا ہو گیا۔ میں نے سوچا وہ مجھے دخل در نامعقولات پر ڈانٹنے کا مگر میں نے دیکھا وہ بڑی دلچسپی سے میرے چہرے کی طرف نکتے جا رہا تھا۔

”کون ہے رے تو.....؟“ اچانک اس نے گہری اور منحنی سی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

”مسافر ہوں..... رات گزارنا چاہتا ہوں..... تم ناراض ہوئے ہو تو واپس چلا جاتا ہوں..... میں نے دانستہ کس نفسی سے کہا۔

”.....نہیں..... بیٹھو.....“ اس کے لہجے میں عجیب سا تحکم تھا۔ وہ چند ثانیے گہری اور پرسوج نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کی چندی چندی آنکھوں میں عجیب سی مقناطیسیت تھی۔

”کیا نام ہے رے تیرا.....؟“

”میرا نام.....؟ میرا نام واشو ہے.....“ میں نے جھوٹ بولا۔

”.....ہوں.....“ اس نے اسرار بھری ہمکاری بھری۔ ٹھیک اس وقت باہر بادلوں کی خوفناک گڑگڑاہٹ گونجی..... میں نے دھانے سے باہر وادی میں جھانکا..... اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی..... بجلی بھی چمک رہی تھی۔ ”معا جیسے اس پر اسرار جوگی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

”..... آج میرا جاپ پورا ہوا..... اور گنیش نے تجھے یہاں بھیج دیا۔“

میں چونک کر اس کا منہ ٹکٹنے لگا۔ ”تم نے مجھ سے کچھ کہا.....؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں..... ایسا ہی سمجھو.....“ وہ پر اسرار لہجے میں بولا۔ اس کے پتلے پتلے خاکستری ہونٹوں پہ عجیب سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ”تم کون ہو.....؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا.....؟ میں نے بنور اس کے منحنی چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔“ ہم کوئی بھی ہوں..... پر تجھے یہ ضرور بتائیں گے..... کہ ہم تم سے چاہتے کیا ہیں.....؟“

وہ پر اسرار مسکراہٹ سے بولا۔ ”تم خود سے نہیں آئے ہو۔ یہاں..... گنیش دیوتا نے تمہیں ہمارے پاس بھیجا ہے۔ آج ہمارے جاپ کا تیسرا دن جو تھا۔“ اس کی بات پر میں اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

پھر پوچھا ”تم کون ہو.....؟“

”کیا کرو گے جان کر۔“ وہ پر اسرار سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ چلو بتائے دیتے ہیں..... ہم نارائن ہیں..... نارائن..... پرساد..... عرف نارو جوگی۔“ میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی..... کم بخت نجانے مجھ سے کیا چاہتا تھا مگر میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا..... اگر اس مردود نے مجھ سے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں اسے اچھی



طرح مزہ چکھاؤں گا۔“ تم کیا چاہتے ہو.....؟ میں تو یہاں صرف رات گزارنے آیا ہوں.....“ میں نے دوبارہ کہا۔

”.....ہاں چلے جانا..... پر اس سے پہلے ہمارا ایک کام کرنا ہوگا تمہیں.....“ وہ یک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

”کیا کام؟ میں نے اس کے خاکستری چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔

”بس چھوٹا سا کام ہے..... اور آج کی رات میں اس وقت کرنا ہوگا تمہیں.....“ وہ بولا اور پھر قریب دھری ایک میلی چیکٹ بچتی سے اس نے ایک لمبے پھل والا خنجر نکال لیا۔ میں بری طرح ٹھنک گیا اور محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ میرا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ باہر وادی میں بارش کا شور جاری تھا۔ وقفے وقفے سے بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ بادلوں کی خوفناک گڑگڑاہٹ گونج رہی تھی۔ نارو جوگی کے استخوانی سے ہاتھ میں لمبے پھل والا خنجر چمک رہا تھا اور میری ٹھٹھکی ہوئی نظریں نارو جوگی کے خنجر پر جم کر رہ گئی تھیں..... میرے دل میں خدشہ ابھرا کہیں یہ جوگی خنجر سے میرا کام تمام کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا؟ اچانک میں ٹھٹھکا، اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر آہستگی سے میری طرف اچھال دیا۔ خنجر میرے قریب آ کر پڑا تو نارو جوگی عجیب سی آواز میں بولا۔

”.....واشو..... اس خنجر کو اٹھاؤ.....“ اس کی مخنی سی آواز میں ایک کھر دراسا تحکم تھا۔ میں حیران ہوا۔ میں کبھی اس کے چہرے کی طرف تو کبھی اپنے سامنے پڑے خنجر کو دیکھنے لگا۔ مجھے گولو پا کر وہ ذرا تیز اور بلند آواز میں دوبارہ بولا۔ میں کہتا ہوں..... خنجر اٹھاؤ..... میں چونکا۔ اس کی آواز میں جانے کیا اسرار تھا کہ میں نے لپک کر وہ خنجر اٹھا لیا۔ پھر کیا دیکھتا ہوں وہ جوگی پشت کے بل کھوہ کی پتھریلی فرش پر لیٹ گیا اور چھت کی طرف تکتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”واشو.....! اب یہ خنجر میرے سینے میں عین دل کے مقام پر اتار دو.....“

اچانک باہر بجلی کا زور دار کڑکا ہوا اور میرا خنجر والا ہاتھ بے اختیار کپکپا گیا۔ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ اس کی بات سن کر میں دھل گیا۔ ”میں..... میں.....“ یہ..... تم کیا کہہ رہے ہو۔“

میں نے لکنت زدہ لہجے میں اس سے کہا تو وہ دانت پیس کر غصیلے لہجے میں بولا۔

”او بے وقوف! میری بات مان لے..... اٹھا یہ خنجر اور میرے سینے میں اتار دے۔“

”نن..... نہیں..... ہرگز نہیں..... میں یہ قتل نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا، میں اس کی عجیب و غریب مگر سنگین خواہش پر کانپ گیا تھا۔ مجھے یہ مردود بھی کالے منتروں کا پجاری ہی لگا..... میں نے فی الفور وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ یک دم کسی لاش کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک ماردی۔ میرے قدم وہیں گڑھ کر رہ گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے زمین نے میرے پاؤں پکڑ لئے تھے وہ خبیثانہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

”.....بالکے.....! میری بات مانے بغیر تو یہاں سے نہیں نکل سکتا.....“ میں پریشان ہو گیا۔ انجانے خوف کے زیر اثر میرا دل کانپنے لگا۔ پھر مجھے اپنے دائیں بازو پر بندھے بابا کمال شاہ کے دیئے ہوئے تعویذ کا خیال آیا۔ میں نے ابھی اس پر ہاتھ رکھ کر اللہ سے مدد مانگنی چاہی تھی کہ وہ بولا۔

”.....تم یہ مت سمجھو کہ میں مرجاؤں گا..... یا میرے جیون کا ہمیشہ کیلئے انت ہو جائے گا..... بلکہ میں..... میری آتما میرے شریر سے الگ ہوتے ہی ایک نیا جنم لے گی..... اور پھر..... میں اس مورکھ جگدوش کو ہمیشہ کیلئے نچوٹ (ختم) کرنے کی غلٹی حاصل کر لوں گا۔“ اس کے منہ سے جگدوش کا سن کر میں بری طرح چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ”تت..... تم..... جگدوش کو جانتے ہو؟“

”ہاں.....! بہت اچھی طرح..... وہ میرے لئے اس دھرتی کا سب سے بڑا خطرہ ہے.....“ وہ بولا۔

”دشمن تو میں بھی اس کا ہوں۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور نارو جوگی چونک کر میری سمت دیکھنے لگا۔ پھر تب اس نے ایک بار پھر زیر لب بڑبڑا کر مجھ پر پھونک ماری تو مجھے یوں لگا جیسے زمین نے میرے پاؤں چھوڑ دیئے ہوں..... مجھے اپنے

بیروں کی طاقت لوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”اگر جلدوش..... تیرا بھی بیری (دشمن) ہے تو پھر تو اسے کیوں زندہ چھوڑتا چاہتا ہے۔ نارو جوگی مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا..... مگر یاد رکھ..... تو اسے نچٹ کرنے کی شکتی نہیں رکھتا..... مجھے گنیش دیوتا کی شکتی حاصل ہے۔ اس مورکھ جلدوش کو نچٹ کرنے کا کیول طریقہ یہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں..... یعنی تو مجھے قتل کر ڈال..... میں نے تین دنوں کا اپنا جاپ مکمل کر لیا ہے مجھے آتما شکتی حاصل ہو جائے گی..... لے خنجر..... آ..... اتار دے اسے میرے سینے میں..... اس نے خنجر والا ہاتھ میری طرف بڑھایا میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ سمجھ گیا میں اس کی بات کسی قیمت پر بھی نہیں مانوں گا تب وہ خنجر کے دسے پر اپنی گرفت مضبوط کر کے خونخوار سفاکی سے بولا۔“

”ٹھیک ہے پھر..... میں اب تجھے مار کر تیری آتما میں اپنا جاپ مکمل کر لوں گا.....“ یہ کہہ کر وہ غراتا ہوا خنجر تو لے میری طرف لپکا میں نے جھکائی دی..... وہ بھی کانیاں نکلا فوراً ایک بازو میری گردن کے گرد حمال کر کے جکڑ لیا۔ میں اس کے استخوانی پنجر نما لاغر وجود کی بے پناہ طاقت کا آج بھی معترف ہوں..... یہاں تو میں سمجھا تھا کہ اس سوکھے سڑے جوگی کو ایک ہی پنن دوں گا تو اس کی ہڈیاں چیخ جائیں گی مگر..... میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ اب جیسے ہی اس نے وہ خنجر میرے پیٹ میں گھونپنا چاہا میں نے پھرتی سے اس کی کلائی دبوچ لی۔ اس زور آزمائی میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا۔ خنجر کا مہیب پھل لحوہ بہ لحوہ اب میرے سینے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کم بخت کے منحنی سے وجود میں بلا کی طاقت تھی۔ جب میں نے دیکھا وہ میری جان کا میری بن چکا ہے تو میں نے بھی بالآخر اس سے مقابلے کی ٹھان لی..... اپنے گھٹنے کی ایک زوردار ضرب اس کے پیٹ پر رسید کر ڈالی اس کے حلق سے وحشیانہ چیخ بلند ہوئی، گردن پر میری اس کے استخوانی ہاتھ کے شکنجے کی گرفت ذرا کمزور پڑی تو میں نے اسے پرے دھکیل دیا..... خنجر کا دستہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھسکوا ہوا تھا..... ایک بار پھر خنجر تولنے ہوئے غرا کر مجھ پر بھپٹا اس بار میں نے لات چلا دی، جو اس کے لمبو ترے چہرے پر پڑی، مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اور اچھل کر اپنی دونوں ٹانگیں

میرے سینے پر دے ماریں میرے قدم اکھڑ گئے اور میں عقب میں لڑکھڑاتا ہوا کھوکھ کی پتھریلی دیوار سے جا ٹکرایا۔ آسبی چمکا ڈر کی طرح پھر مجھ پر جھپٹا اور مجھے چاروں شانے چت زمین پر گرادیا۔ اب وہ کم بخت میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ میں نے پلٹی کھائی اور وہ میرے نیچے آ گیا۔ اس اثناء میں میں نے اس کے خنجر والے ہاتھ کو مروڑ ڈالا۔ نتیجتاً خنجر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر تر ازو ہو گیا۔ اس کے حلق سے دلدوز چیخ برآمد ہوئی اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ خنجر دسے تک اس کے سینے میں اتر چکا تھا اور اب وہاں سے بھل..... بھل..... خون بہنے لگا۔ میں دہشت زدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا..... چند قدم پیچھے جا کھڑا ہوا..... اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے خون میں نہائے ہوئے وجود کو دیکھنے لگا۔ باہر وادی میں طوفان باد و باراں کا شور اب تھم گیا تھا۔ ہر سو گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ البتہ باہر چلنے والی ہوائیں بدروحوں کی طرح چیخ رہی تھیں۔ مجھے ہول سا آنے لگا۔

میری دم بخود نظریں ہنوز..... نارو جوگی کے خون آلود وجود پر جمی ہوئی تھیں..... وہ پھر بھی مرا نہیں تھا۔ جس کی غمازی اس کے بار بار جان کنی کے عالم میں جھٹکتے لیتے وجود سے عیاں ہو رہی تھی۔ پھر معا ہی نارو جوگی کے لب کپکپائے..... بے وقوف..... مجھے..... مار ڈال..... مار ڈال..... جلدی کر..... میں دھل کر رہ گیا۔ وہ کپکپاتے لہجے میں مجھ سے فریاد کر رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیا تماشہ تھا..... اور کیا گورکھ دھندہ تھا..... میں نے وہاں سے فوراً بھاگ جانے کی ٹھانی لہذا جیسے ہی میں..... ادھ موئے نارو جوگی کے قریب سے گزرنے لگا اس نے نجانے کس طرح لیٹے لیٹے میری پنڈلی پکڑ لی..... میں پہلے ہی خوف آمیز پریشانی میں مبتلا تھا..... لہذا منہ کے مل گرا اور بے اختیار میرے حلق سے خوف زدہ چیخ نکل گئی۔ شکر تھا کہ چہرے پر چوٹ نہ آئی۔

”ناجا..... ناجا..... مجھے اس طرح ادھ موا کر کے نہ جارے مورکھ!“ وہ التجا کرنے لگا۔

”اوئے..... مجھے مار ڈال..... میری بنتی مان لے..... میں بہت سخت تکلیف میں ہوں۔ مجھے مار میری آتما کو اس کشت بھرے شریر سے مکتی دلا دے رے..... مکتی

میں نے اپنے محل پر تے حواسوں کو یکجا کیا اور پرہمت جھٹکے سے اپنی ٹانگ نارو جوگی کی استخوانی گرفت سے چھڑائی اور..... پھر دہشت زدہ سا ہو کر..... کھوہ کی پتھریلی دیوار سے جا لگا۔ ادھر..... زمین پر پڑے..... اینڈ تے ہوئے..... نارو جوگی کی بھی اس خون آشام چڑیل پر نظر پڑی تو ایک لمحے کیلئے وہ بھی وحشت زدہ سا نظر آنے لگا اور پہلے سے زیادہ گریہ وزاری کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

”..... اوئے..... مورکھ! اب بھی وقت ہے..... مجھے مار ڈال..... مار ڈال مجھے..... ورنہ یہ میرا کلیجہ کھا جائے گی..... اور میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا..... اس مورکھ..... جگدوش کی جیجی ہوئی ایک چیلی داسی ہے..... یہ..... یہ..... تجھے بھی مار ڈالے گی..... جلدی کر..... میں مرنے کے بعد آتما شکتی حاصل کر لوں گا تو..... پھر یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی..... ورنہ اگر یہ میرا..... کلیجہ کھا گئی تو میں بے بسی کی موت مارا جاؤں گا..... میرا سب کچھ نچٹ (ختم) ہو جائے گا.....“

ادھر چڑیل نے ایک کریہہ انگیز چیخ ماری..... زمین پر پڑے نارو جوگی کی طرف لپکی..... مجھ پر اس چڑیل کی دہشت بری طرح سوار تھی۔ میں اپنی جگہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ تب پھر میں نے دیکھا اس چڑیل نے اپنے لمبے ناخنوں والا پنجہ نارو جوگی کے سینے میں گاڑا..... اس کے سینے کا پنجرہ توڑ کر..... سرخ، سرخ دل نکال لیا۔ نارو جوگی کے حلق سے ایک بھیا تک دل ہلا دینے والی چیخ ابھری..... اور اس کے بے سدھ وجود نے ایک زوردار تشنجی جھٹکا کھایا اور بالکل ساکت ہو گیا۔ چڑیل بڑے آرام سے اس کا دل چبانے لگی۔ اس کی ہاتھوں سے جھانکتے خون آلود نوکیلے دانت بڑے خوفناک نظر آرہے تھے۔ وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بدنصیب نارو جوگی کا سارا دل چبا کر کھا گئی اور پھر حقارت سے بڑبڑائی۔

”بڑا آیا تھا..... جوگی..... جگدوش کو مارنے والا..... ہا..... ہا..... ہا..... اس نے ایک ڈراؤنا قہقہہ اگلا اور پھر اچانک اس نے بڑی خوفناک نظروں سے مجھے گھورا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وہ دیرے دیرے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے قریب آئی۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ وہ خرخراتی آواز میں مجھ سے بولی۔

دلا دے۔ وہ بدستور لرزہ خیز انداز میں گڑگڑانے لگا۔ میرا دل کپکپا رہا تھا میں نے زور لگا کر اپنا پاؤں اس کے استخوانی پنجے سے آزاد کروانے کی کوشش کی مگر اس کی زخمی حالت میں بھی طاقت قائم تھی۔

اچانک ایک آواز پر میں ٹھٹک گیا.....

”چھن..... چھن..... چھن..... چھن..... چھن..... چھن..... چھن.....“

رات پہر اور دم بخود سناٹے میں پراسرار آواز بڑی وحشتیں بکھیر رہی تھی۔ یہ آوازیں کھوہ کے باہر سے آرہی تھیں..... پتہ نہیں اس آواز میں کیسا ظلم تھا کہ میں یکدم بے حس و حرکت زمین پر پڑا رہا۔ میں نے محسوس کیا..... نارو جوگی بھی اس آواز کو سن کر ساکت ہو گیا تھا..... میرا دل بری طرح دھک..... دھک کرنے لگا۔

”چھن..... چھن..... چھن..... چھن..... چھن..... چھن..... چھن.....“

یہ اسرار بھری اور جادو آمیز آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میری ٹھٹکی ہوئی نظریں کھوہ کے دھانے پر جمی ہوئی تھیں۔ باہر وادی میں طوفان باد و باراں کے تھم جانے کے بعد سناٹا مزید گہرا ہو گیا تھا اور آسمان بھی شاید صاف اور روشن ہو گیا تھا۔ چاند کی سحر آگیں چاندنی پھیل چکی تھی اور پھر میں نے اس روشنی میں ایک عجیب و غریب سایہ کھوہ کے دھانے پر ابھرتے دیکھا وہ جو کوئی بھی تھا کھوہ کے دھانے کے قریب آ گیا تھا۔ تب میری پھٹی پھٹی نظروں نے ایک جگر پاش منظر دیکھا..... ایک بکھرے ہوئے کچڑی اور جھاڑوں دار بالوں والی سیاہ چہرے کی عورت کھوہ کے دھانے پر نمودار ہوئی اور اس کا چہرہ..... اف خدایا..... ایسا ڈراؤنا اور وحشت خوں رنگ چہرہ میں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ کوئی ڈائن تھی۔ انتہائی کریہہ صورت اس کا چہرہ نکون تھا۔ آنکھیں لال انگارہ تھیں، چہرے پر ان گنت دراڑیں..... ہاتھوں کے ناخن لمبے اور گدھ کی چونچ کی طرح خم دار، ناک لمبی تھی اور آگے کو مڑی ہوئی۔ ٹھوڑی بھی لمبوتری تھی۔ ہاتھوں سے خون کی لکیریں بہہ بہہ کر جم سی گئی تھیں۔

میں نے جب اس کے پیروں کی طرف دیکھا تو سانس لینا بھول گیا۔ اس کے پاؤں الٹے تھے..... وہ ایک منحوس کچھلپائی چڑیل تھی۔ ایک خون آشام چڑیل.....

مجھے اب ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ..... اب شاید میرا اور جگدوش کا فیصلہ کن ٹکراؤ ہونے والا تھا۔ میرے اندر اب ایک بار پھر جگدوش سے جنگ کرنے کا جوش سوا ہونے لگا تھا۔ ٹھٹھرتی ہوئی رات، اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ میں چڑیل کے تعاقب میں محتاط روی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس طرح کہ اسے ذرا بھی اپنے تعاقب کا شبہ تک نہ ہو۔ بالآخر میں اس کا تعاقب کرتا ہوا..... ایک پہاڑی کے نسبتاً تنگ کنواں میں داخل ہوا تو سامنے مجھے ایک پرانی وضع کا پستہ قامت مینار والا معبد خانہ نظر آ گیا۔ وہ خون آشام چڑیل اس کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ جگدوش سے فیصلہ کن جنگ اور سوئی کے دیدار محبوبانہ کے تصور سے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سوئی کے محبوبانہ تصور نے میرے اندر ایک عجیب سی پرجوش طاقت بھردی تھی۔ میں آگے بڑھا..... معبد کا دروازہ نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ سنگی کھلی چوکت تھی۔ میں اللہ کا نام لے کر اندر داخل ہو گیا تو سامنے ہی بلند چھت والے ہال کمرے میں جگدوش موجود تھا، اور خون آشام چڑیل اسے نارو جوگی کے بارے میں اس کی ہلاکت کی خوش خبری سن رہی تھی۔ دائیں جانب الم نصیب سوئی..... سوگوار بیٹھی تھی۔ اسے ایک سلاخ دار سنگی کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ ان سب کی نگاہ بیک وقت مجھ پر پڑی تھی۔ سوئی نے تو ہلکی سی پرمسرت چیخ بھی ماری تھی..... البتہ جگدوش کی پیشانی پر چپاں اکلوتی آنکھ میں جیسے..... آتش فشاں ابل پڑا تھا۔ وہ اس وقت اپنے اصل شیطانی روپ میں موجود تھا اور ایک سنگی چبوترے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا سارا جسم سیاہ تھا..... اور کسی افریقی سائڈ کی طرح موٹا تازہ بھی، اس کی پیشانی پر اکلوتی آنکھ اس وقت بھی بڑا خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔

وہ کسی طرح بھی اجنبی مخلوق سے کم دکھائی نہیں دیتا پڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنے معبد خانے میں دیکھ کر ایک زوردار وحشیانہ چٹکھاڑ ماری اور اکلوتی آنکھ سے میری طرف گھورتے ہوئے غرا کر بولا۔

”..... اوئے مورکھ! تو یہاں بھی آ گیا۔ لگتا ہے..... تجھے اپنی زندگی پیاری

نہیں۔“

”کیوں رے..... میرے جیوٹ..... جگدوش کو ختم کرنے آیا تھا..... تو..... بول بول..... اب تیرا جگر پہلے کھاؤں یا..... دل..... ویسے تیرا دل بڑا مزے دار ہوگا..... ہا..... ہا..... وہ بے ہنگم انداز میں ہنسنے لگی۔ اس کے دانتوں کی قطار بڑی ہموار تھی جو خون آلود ہو رہے تھے۔ نارو جوگی تو ختم ہو چکا تھا۔ اب یہ خون آشام چڑیل میرے درپے ہو گئی تھی..... میں نے سوچا اگر میں اس طرح خوفزدہ ہوتا رہا تو..... یہ چڑیل میرا بھی نارو جوگی والا حشر کرے گی..... مگر اچانک میں حیران رہ گیا۔ وہ چڑیل ذرا دیر تک مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورتی رہی اس کے بعد خاموشی کے ساتھ کھوہ سے باہر نکل گئی۔ مجھے اب اس سارے گورکھ دھندے کا بتدریج ادراک ہوا تھا۔ نارو جوگی..... جگدوش کو ہلاک کرنے کیلئے تین دنوں سے اس برفانی دیرانے میں جا پ کر رہا تھا اور اتفاق سے تیسرے دن اس کا جا پ مکمل ہوا تو میں بھی یہاں آن پہنچا تھا۔ جا پ مکمل ہونے کے بعد نارو جوگی نے غالباً اپنے پراسرار علم کے ذریعے اس بات کا پتہ چلا لیا تھا کہ..... وہ جگدوش جیسے بڑے ساحر کا مقابلہ تب ہی کر سکتا تھا جب اس کی روح (آتما) اس کے شریر سے الگ ہو جاتی اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ..... وہ کسی کے ہاتھوں قتل ہوتا۔ اس کیلئے نارو جوگی نے میرا انتخاب کیا اور میرے انکار پر اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کر ڈالا، مقصد یہی تھا کہ میں اپنی جان بچانے کیلئے خوف سے اسے قتل کر ڈالوں۔ اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا مگر جگدوش بھی شاید اپنے ہم عصر دشمنوں سے غافل نہ تھا۔ اس نے نارو جوگی کو اپنی ایک چیلی (خون آشام چڑیل) کو ختم کرنے کیلئے یہاں بھیج دیا۔ مجھے پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ کاش میں نارو جوگی کی بات مان لیتا تو..... جگدوش کو اس کے دشمن کے ذریعے ہلاک کرنے میں، میں کامیاب ہو جاتا، مگر میں یوں بلاوجہ اپنے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون سے رنگنا بھی تو نہیں چاہتا تھا۔ اچانک ایک خیال سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں آیا۔ میں جلدی سے باہر نکلا دائیں جانب میں نے چاندنی میں اس خون آشام چڑیل کو جاتے ہوئے دیکھا..... مجھے پورا یقین تھا کہ وہ جگدوش کے مسکن کی طرف ہی جا رہی ہوگی۔ لہذا یہ سوچ کر میں اس کے تعاقب میں چل پڑا۔

”زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اے شیطان مردود..... تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہے.....“

میں نے اس کی اگھوتی آنکھ میں گھور کر بے جگری سے اسے لکارا، ایک اکی وہ پریشان نظر آنے لگا۔

اس کی شتو گمزی..... خون آشام چڑیل ایک بھیا نک چیخ مار کر میری طرف لپکی۔ میں فوراً اپنے دائیں بازو پر بندھے..... بابا کمال شاہ کے تعویذ پر ہاتھ رکھ کر کلام پاک کا ورد کرنے لگا۔ ادھر جیسے ہی وہ خون آشام چڑیل میرے ذرا قریب آئی تو اچانک وہ ہوا میں اچھلی اور پھر جیسے کسی نادیدہ مخلوق نے اسے اٹھا کر..... پتھر کی دیوار سے دے مارا۔ چڑیل کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا تھا اور کچھ دیر ترپنے کے بعد وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ میں جگدوش کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ زیر لب کچھ بد بدار ہاتھا۔ میں نے اب بابا کمال شاہ والا تعویذ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا..... سوئی پھٹی پھٹی غیر یقینی نگاہوں سے میری طرف دیکھے جارہی تھی۔ اس کے چہرے پر بیک وقت خوشی اور پریشانی کے بھی آثار تھے۔ میں نے اشارے سے سوئی کو تسلی دی اور جگدوش کے بدھیت سیاہ رو چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور جوش سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”..... مردود جگدوش! تیرا اب آخری دن آن پہنچا ہے.....“

مگر وہ بدستور زیر لب کچھ بد بدائے چلا جا رہا تھا۔ اس کی اگھوتی آنکھ مجھے گھور رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی بڑے منتر کی تیاری کر رہا تھا۔ کوئی بڑا داؤ مجھ پر آزمانے کے لئے پرتول رہا تھا۔ اچانک سوئی کی کپکپاتی آواز ابھری..... وہ کوٹھڑی کے سلاح دار دروازے سے لگی کھڑی تھی۔

”..... شش..... شوکت حسین! ت..... تم بھاگ جاؤ..... نہیں تو..... نہیں

تو..... یہ شیطان۔

”سوئی.....! تم بالکل فکر مت کرو..... یہ شیطان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تمہیں آج اس مردود کی قید سے چھڑا کر ہی دم لوں گا۔ میں نے پر عزم لہجے میں کہا۔

ادھر اچانک جگدوش نے اپنا منتر پورا کیا اور بلند آواز میں مجھ سے غرا کر بولا..... مورکھ.....! آج میں بھی تیرا صفایا کر کے ہی چھوڑوں گا۔ تو نے لگتا ہے چیلارام اور ناروجگی کے عبرت ناک انجام سے سبق نہیں سیکھا۔ اب بھگتو۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر لئے۔ اجنبی زبان میں کسی کو پکارا..... اچانک میرے دائیں بائیں کی زمین شق ہوئی..... دو عجیب المثلت مخلوق نمودار ہوئیں..... اگر چہ ان کے قد و قامت تو عام انسانوں کی طرح کے تھے مگر..... ان کے چہ ہاتھ تھے۔ اضافی چار ہاتھوں سے دو ہاتھ سینے کی طرف اور دو پشت کی جانب تھے۔ ہر ہاتھ میں مختلف ہتھیار تھے کسی نے تلوار دبا رکھی تھی تو کسی نے سان اور خنجر تھام رکھے تھے جبکہ دوسرے چہ ہاتھ والی مخلوق کے ہر ہاتھ میں آہنی نوکیلے کانٹوں والا گرز تھا۔

”نچٹ کر دو..... اس مورکھ کو.....“ جگدوش نے بہ آواز بلند اپنے ان دونوں چیلوں کو حکم دیا۔

میں ذرا پریشان سا ہو گیا۔

اچانک مجھے اپنی ساعتوں میں ایک شاسا آواز سنائی دی۔

”شوکت حسین.....! ان مردود شیطانوں سے ذرا بھی نہ ڈرنا..... یہ تیرا کچھ

بھی نہیں بگاڑ سکتے..... جب تک جگدوش ”امر سادھنا“ کی طاقت حاصل نہیں کر لیتا وہ تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا..... تم کسی طرح ان کے ہاتھ سے گرز چھین لو اور جگدوش پر ٹوٹ پڑو۔“ اس آواز نے میری ہمت سوا کر دی اور میں مقابلے کیلئے تیار ہو گیا۔ پھر جیسے ہی ایک چہ ہاتھوں والی مخلوق نے لاکارتی ہوئی چیخ مار کر مجھ پر حملہ کیا..... میں نے پھرتی سے خود کو اس کے حملے سے بچایا..... مگر اس کے چہ ہاتھوں کے حملے سے میرا بچ ٹکٹا ناممکن ہی تھا..... نتیجتاً..... سان اور خنجر والے ہاتھوں نے مجھے جالیا۔ مگر جیسے ہی سان اور خنجر میرے وجود کے ذرا قریب آئے..... معا ہی دونوں ہتھیار اس کے ہاتھ سے خود بخود چھوٹ کر فرش پر گر گئے۔ میں نے پھرتی سے دونوں ہتھیار اٹھائے..... اور سان کو تول کر اس کے سینے کا نشانہ لیا اور زور سے اچھال دیا۔ وہ ابھی تک حیرت میں گم تھا کہ اس کے ہاتھوں سے سان اور خنجر کیوں کر چھوٹ کر گرے تھے۔ اور یہی حیرت

بولی۔

”.....نن..... نہیں..... شوکت.....! ابھی مجھے نہ چھوٹا..... جب تک یہ موزی شیطان دفع نہ ہو جائے..... اور یہ کہہ کر مجھ سے چند قدم دور جا کھڑی ہوئی..... جگدوش چگاڑ کی صورت فضا میں گھیریاں بھرتے ہوئے زخمی آواز میں بولا..... مورکھ! تو نے آج مجھے شکست دے دی۔ مگر یاد رکھنا..... میں تجھے چھوڑوں گا نہیں..... اور تیری اس محبوبہ کو ضرور تجھ سے چھین کر اتنی دور لے جاؤں گا کہ..... تو ساری عمر ہمیں نہیں ڈھونڈ پائے گا۔ یہ دھمکی دینے کے بعد وہ پھڑپھڑاتا ہوا معبد کی کھلی سگی چوکھٹ سے باہر تاریکی میں پرواز کر گیا۔

”شوکت.....“ جگدوش کے معبد سے نکلتے ہی سوئی خوشی سے چلا کر میری طرف دوڑی..... اور میں نے اپنی دونوں پیاسی بانیں پھیلا دیں۔ وہ اس میں ساگئی۔ خاصی دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے میں کھو کر اپنے پیاسے دل کے صحران کو محبت کی بارش سے سیراب کرتے رہے..... سوئی کو پا کر جیسے میرے دل کی ازلی تمنا پوری ہوگئی۔ وہ بھی مجھے پا کر خوشی سے رو پڑی تھی۔ مہجور جذبات کا یہ طوفان ذرا تھما تو..... میں نے بہ آہستگی اسے خود سے ذرا علیحدہ کیا اور اس کی گھنیری زلفوں کو سنوارتے ہوئے محبت بھری حلاوت سے بولا ”سوئی! اب تیرے سارے دکھ دور ہو گئے ہیں..... آؤ..... اب واپس چلتے ہیں۔ اس کے بعد ہم معبد خانے سے باہر آ گئے۔ دور مشرقی برف پوش چوٹیوں سے پوہ پھٹ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسے لے ڈوبی..... میرا پھینکا ہوا شان اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے حلق سے ایک بھیا نک چیخ ابھری اور وہ لڑکھانے لگا۔ ادھر دوسری چھ ہاتھوں والی مخلوق اپنی گرز لہراتی ہوئی مجھ پر جھپٹی..... میں نے سگی چبوترے کی طرف دوڑ لگا دی..... جس پر جگدوش براجمان تھا۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھے۔ جگدوش اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں..... ادھر چھ ہاتھوں والی مخلوق اپنی گرز لہراتی میرے پیچھے لپکی..... یہ میری چال تھی..... میں یکدم زمین پر بیٹھ گیا اور جیسے ہی وہ مخلوق میرے ذرا قریب پہنچی میں نے اپنی ایک ٹانگ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان میں اڑادی..... وہ منہ کے بل نیچے آ رہی..... میں پھرتی سے اٹھا..... اس کے ایک ہاتھ سے گرز چھوٹ کر پرے جا گرا تھا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھالیا۔ وہ ایک چار فٹ کی زنجیر سے بندھا ہوا لوہے کا بڑا سا کانٹے دار گرز تھا اور خاصا وزنی بھی..... مگر میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی زنجیر کی مدد سے اسے فضاء میں گھما کر اس مخلوق کے سر پر رسید کر دیا۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ وہ آواز تک نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ جگدوش نے اپنے دونوں چیلوں کا عبرتناک حشر دیکھا تو اس نے دوبارہ اپنے دونوں بازو فضاء میں بلند کر دیئے..... اچانک اس کے دائیں بائیں پہلو سے دو ببر شیر نمودار ہوئے..... دونوں نے خوفناک دھاڑ ماری اور مجھ پر چھلانگیں مار دیں۔ میں دہشت زدہ سا رہ گیا مگر..... میرے ذرا ہی قریب پہنچ کر وہ مٹی کے ڈھیر بن کر فرش پر بکھر گئے۔ جگدوش فوراً اٹھ کر قید خانے کی طرف بھاگا..... سگی کوٹھڑی کا سلاخ دار دروازہ کھول کر سوئی کو باہر نکالا..... میں دھک سے رہ گیا..... وہ سوئی کو لیکر فرار ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی گرز لہرایا اور تاک کر اس کی ٹانگوں پر مارا..... نوکیلے کانٹوں والا گرز اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرایا اور جگدوش ایک بھیا نک چیخ مار کر گر گیا۔ سوئی میری طرف دوڑی میں نے گرز کی زنجیر کو ایک بار پھر فضا میں لہرایا اور چاہتا تھا کہ اسے جگدوش کے سر پر دے ماروں مگر دوسرے ہی لمحے جگدوش کی جسمانی ہیئت بدلی اور وہ ایک بڑی سی چگاڑ بن کر پھڑپھڑاتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا اور معبد کی مخروطی چھت تلے گھیریاں بھرنے لگا۔ اس کا پورا جسم تو چگاڑ کا تھا مگر سراسی کا تھا..... اس کے جسم سے خون قطروں کی صورت ٹپک رہا تھا۔ میں نے سوئی کو چھوٹا چاہا تو وہ چلا کر

کر دیا تھا۔ جب وہ مجھے دفن کر چلے گئے تو..... بعد میں جگہ دوش نے مجھے قبر سے نکالا اور دوبارہ کالے منتر پڑھ کر ہوش میں لایا کہ میں اس کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔“

بہر طور..... دونوں باپ بیٹی خوش تھے۔ میں بھی سوئی کو پا کر خوش تھا۔ بلکہ اپنی اکلوتی اولاد سوئی کو زندہ پا کر مرادے کی بوڑھی آنکھوں کا جیسے نور دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ میں سوئی کو اب ایک پل کیلئے بھی خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جب مرادے کو ساری کٹھا سنائی تو وہ حیران رہ گیا۔ پھر جب میں نے اسے جگہ دوش کی دھمکی کے بارے میں بتایا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اسے فوراً اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ..... جب تک جگہ دوش زندہ تھا اس کی لاڈلی بیٹی سوئی کے سر پر خطرہ منڈلاتا رہے گا۔ تاہم میں نے دونوں باپ بیٹی کو محتاط رہنے کی سختی سے تاکید کر دی تھی۔

”شو کے پت! تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ..... میری سوئی دھی سے بیاہ کر لے۔“ اس نے اچانک مجھ سے کہا، سوئی اس وقت وہاں موجود تھی۔ میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے..... مگر میں نے ملامت سے کہا

”..... چاچا.....! خواہش تو میری دل کی بھی یہی ہے..... پر..... میں چاہتا ہوں پہلے اس مردود شیطان کے شوگرڈے جگہ دوش کو فنا کر ڈالوں..... کیونکہ ابھی میں نے اس پر آدمی فتح حاصل کی ہے جو خدا نخواستہ کسی بھی وقت میری شکست میں بدل سکتی ہے۔ جگہ دوش جب تک زندہ ہے مجھے سکون نہیں ملے گا۔ وہ ایک بہت بڑا ساحر ہے..... اور وہ زخم کھایا ہوا ہے پہلے سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے وہ ہمارے لئے..... بالخصوص سوئی کیلئے.....“

”..... مگر..... شو کے پت! ایک بات تو بتا۔ وہ الجھن آمیز پریشانی سے بولا۔

”..... اب اس مردود شیطان کو تو کدھر ڈھونڈتا پھرے گا؟“ اس کی بات سن کر میرے لیوں پہ اسرار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”چاچا..... اب مجھے اس شیطان کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے.....“ میں جواباً بولا..... وہ اب مجھے تلاش کرتا ہوا کسی بھی وقت میرے سامنے آ سکتا ہے..... پھر..... تجھے سوئی کا خیال رکھنا ہوگا.....“ وہ بے چارہ میری بات سن کر پریشان سا ہو گیا مگر فوراً ہی اپنا دل مضبوط کر کے بولا..... تو

میں سوئی کو لیکر سیدھا ٹھا کر دیال سنگھ کی حویلی پہنچا۔ وہ اور اس کا بیٹا شرام سنگھ اور اس کی چچی ٹھنٹلا میری بہادری کی تعریف کرنے لگے۔ میں نے انہیں جگہ دوش کے بارے میں بتایا اور ان کو ایک بار پھر تاکید کی کہ..... وہ اس مردود شیطان سے محتاط رہیں..... کیونکہ ہو سکتا ہے..... اب وہ پہلے..... ٹھنٹلا کو اغوا کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس کے بعد میں نے ان سے مدد چاہی کہ وہ مجھے اور سوئی کو سرحد پار اپنے گاؤں ”بچ گرائیں“ پہنچانے کا بندوبست کریں۔ ٹھا کر دیال سنگھ نے فوراً حامی بھری اور ایک دن بہ صد اسرار ہمیں اپنی حویلی میں بطور مہمان رکھا اور اگلے دن صبح سویرے تانگے میں اپنے چار مسلح سپاہیوں کے ساتھ ہمیں ہمارے گاؤں کی طرف روانہ کر دیا۔ بلاآخر ایک دن کی طویل مسافت کے بعد ہم اپنے گاؤں پہنچ گئے۔ وہ شام کا وقت تھا..... ٹھا کر دیال سنگھ کے سپاہی ہمیں اپنے گاؤں کی سرحد پر چھوڑ کر واپس لوٹ گئے تھے۔ میں سوئی کو لیکر سب سے پہلے اس کے باپ مرادے کے گھر پہنچا..... اور پھر میرے ساتھ اکر نے اپنی بیٹی سوئی کو..... زندہ سلامت دیکھا تو پہلے اس کی بوڑھی آنکھوں میں حیرت اور غیر یقینی کے تاثرات ابھرے..... پھر جب سوئی بے اختیار ”بابا“ کہہ کر اس سے لپٹ کر رونے لگی تو..... مرادے نے اسے بھیج لیا۔

”میری بچی.....! ام..... مجھے یقین نہیں آ رہا..... تت..... تو..... زندہ کیسے ہو گئی..... ام..... میں نے تو خود تجھے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا تھا..... سوئی.....“

سکتے ہوئے اسے بتایا کہ..... یہ ساری شیطان گری اس مردود جگہ دوش کی تھی جس نے مجھے اپنے قبضے میں کرنے کیلئے مجھ پر کالا جادو کر ڈالا تھا۔ میرے وجود کو بالکل ساکت

”ہاں شو کے پتر.....! مراد اغمناک لہجے میں بولا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ رانی کو اغوا کیا گیا ہے..... اور یہ بھی کہ اسے غائب کرنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں..... لیکن..... کسی میں بھی ہمت نہیں کہ وہ چودھری نیاز اور چودھری پرویز کا نام اس سلسلے میں اپنی زبان تک لائیں۔“

”..... مگر تاپا نے تھانے کیوں نہ رپٹ لکھوائی.....؟ میں نے تفکر آمیز پریشانی سے پوچھا۔ ”کردائی تھی رپٹ..... وہ بڑا غرور آدمی ہے..... مگر حوالدار کریم داد کا تو تجھے پتہ ہی ہے..... وہ خود ان دونوں چودھری بھائیوں سے ڈرتا ہے۔“

”کب کی بات ہے یہ.....؟“

”..... بس..... تیرے گاؤں سے اچانک غائب ہونے کے کوئی چار پانچ روز بعد کا ذکر ہے یہ.....“

”..... تو کیا بعد میں رانی کا کچھ پتہ چلا..... میرا مطلب ہے وہ بازیاب ہوئی.....؟“

”نہیں۔“ اس نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا اور میں رانی کی طرف سے متفکر ہو گیا۔ ساتھ ہی مجھے ان دونوں نخت اور انا کے مارے چودھری بھائیوں پر بھی طیش آنے لگا۔ مجھے بھی پورا یقین تھا کہ..... رانی کو اغوا کرنے کی ذیل حرکت انہی دونوں بھائیوں نے کی ہوگی۔ نیز یہ کہ اب وہ دونوں میرے دوارے ہو گئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ انہوں نے مجھے بھی یرغمال بنایا تھا مگر میں ان کی قید سے نکل بھاگا تھا اور کالی باؤلی کے سفر در سفر ایسا الجھا رہا کہ آج یہاں واپس اپنے گاؤں آنا نصیب ہوا تھا۔

”چاچا! اب تو میرا تاپا اکبر خان سے ملتا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔“ میں اس سے بولا۔

”تو فکر نہ کر..... میں آتا رہوں گا یہاں..... اور ہاں..... سوئی کا خیال رکھنا.....“ یہ کہہ کر میں قریب کھڑی سوئی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”سوئی! تو اپنا خیال رکھنا اور جب تک وہ مردود جگہ و شتابود نہ ہو جائے باہر مت نکلتا.....“

اس کی فکر نہ کر شو کے پتر! گھر میں اللہ کا کلام پاک موجود ہے..... شیطان کے ناپاک قدم یہاں نہیں آ سکتے۔“

”ٹھیک چاچا..... میں اب چلتا ہوں.....؟“ میں نے اجازت چاہی تو وہ پریشان سا نظر آنے لگا پھر اسی لہجے میں مجھ سے بولا..... کدھر چلا تو پتر.....“

”میں ذرا تاپا اور تائی سے ملنے جا رہا ہوں..... پتہ نہیں اب وہ مجھے قبول کرتے بھی ہیں کہ نہیں۔“

میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ میرے جانے کی بات سوئی نے بھی شاید سن لی تھی۔ وہ اندر کوٹھڑی نما کمرے سے یکدم باہر مکن میں آ گئی۔ مراد بولا۔ ”شو کے پتر..... ابھی تیرا باہر نکلتا صحیح نہیں ہوگا۔“

میں اس کی بات پر چونک کر بولا..... کیوں چاچا.....! خیریت.....؟ میں نے کیا جرم کیا ہے.....؟

میری بات پر مراد نے عجیب سی نظروں کے ساتھ میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر ایک پرتفکیر ہنکاری بھرتے ہوئے بولا۔

”پتر! تو چودھری عالم خان کے بیٹوں چودھری نیاز اور چودھری پرویز کو بھول گیا ہے..... وہ دونوں تو تیرے خون کے پیاسے رہے ہیں۔ تجھے اور تیرے تائے اکبر خان کی بیٹی رانی کو ابھی تک اپنے باپ چودھری عالم خان کا قاتل سمجھے ہوئے ہیں.....“

پھر وہ صراحت بیانی کرتے ہوئے مزید بتانے لگا۔

”..... جب تو گاؤں میں اچانک غائب ہو گیا تھا تو چودھری نیاز اور چودھری پرویز کے آدمیوں نے تیرے تائے اکبر خان کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ..... اکبر خان نے اپنے بھتیجے کو کہیں فرار کروا دیا ہے..... پھر اکبر خان نے آ کر قسمیں کھائیں..... ار یہاں تک بھی کہہ دیا ان سے کہ..... اس نے تجھے اپنے گھر سے ہی نکال دیا ہے مگر دونوں چودھری بھائی نہیں مانے..... تب پھر ایک روز رانی پر اسرار طور پر غائب ہو گئی.....“

”کیا.....؟ میں بری طرح چونکا۔“



کیوں بری لگے گی..... بلکہ آپ کو حق ہے مجھ پر حکم چلانے کا..... میں تو..... اس کا لے شیطان کو نابود کرنے نکلا تھا جس کی وجہ سے آج ہمیں یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں.....“

”پتر!..... میں تو برباد ہو گیا..... میں تو کسی کو منہ دکھانے جو گا بھی نہ رہا۔“ وہ زخمی آواز میں بولے..... میں نے دھیرے سے انہیں دوبارہ لٹا دیا اور خود ان کی پاکستی بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام کر تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

”ابا.....! تو فکر نہ کر..... مجھے معلوم ہو چکا ہے..... میں آ گیا ہوں ناں۔ رانی کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا میں.....“

”ہاں پتر! اب تو رب کا آ سرا ہے اور تیرا.....“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے..... مجھے دیکھ کر اس کے ضعیف چہرے پر بشارت لوٹ آئی تھی۔ وہ کسی خیال سے دوبارہ بولے۔

”پتر! میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں..... اب تو تو ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا.....“

”نہیں..... نہیں ابا.....! میں آپ کی اولاد جیسا ہوں..... اب آپ تسلی رکھیں..... اور ہاں..... دکان کی چابی کدھر ہے.....؟“

”پتر!..... چابی تیری تانی اماں کے پاس ہے..... پرتو..... ابھی دکان پر نہ جا.....“

”نہیں ابا.....! میں نے کہا ناں..... تو فکر نہ کر..... اچھا..... میں ابھی آتا ہوں.....“ میں نے انہیں تسلی دی اور پھر گھر سے نکل آیا.....؟ اب میرا رخ متعلقہ تھانے کی طرف تھا۔

تھانے پہنچا تو حوالدار کریم داد اپنے کمرے میں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ بھونچکا سا رہ گیا پھر خشکیوں نظروں سے مجھے گھور کر بولا۔ ”..... اوئے تو کدھر فرار تھا اب تک.....؟“

میں نے جواباً خشک لہجے میں کہا ”کیوں حوالدار جی۔ کیا پھر مجھ پر کوئی نیا الزام لگایا ہے کسی کے حکم پر.....“ میرے طنز کی کاٹ نے اسے تھلا دیا اور وہ اپنی کرسی

اس کے بعد میں مرادے کے گھر سے نکل آیا اور تانیا کے گھر کی طرف چل دیا۔

صبح کا وقت تھا۔ مجھے گاؤں میں دیکھتے ہی جنگل کی آگ کی طرح چار دانگ خبر پھیل گئی۔ میں سب سے پہلے تانیا کی دکان پر گیا تو دکان بند تھی۔ پتہ چلا کہ رانی کے پر اسرار اغوا کے بعد سے تانیا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہنے لگی تھی وہ کبھی کبھار ہی دکان کھولتا تھا۔ میں وہاں سے سیدھا گھر پہنچا تو تانی نے مجھے دیکھتے ہی آسمان سر پر اٹھالیا اور لگی مجھے دو ہائیاں دینے۔ تو نمک حرام..... میری معصوم دھی کو کھا گیا۔ منخوس..... اب کیا یہاں لینے آیا ہے تو..... ہمیں برباد کر دیا تو نے..... وہ شدید غم سے پاگل ہو کر میرا گریبان جھنجھوڑنے لگی..... میرے منہ پر مارے طیش کے دو تین تھپڑ بھی جڑ دیئے۔ وہ میری ماں کے برابر تھی بھلا اسے کیا کہتا..... مگر مجھے اس بات کا غصہ ضرور تھا کہ وہ شروع ہی سے میری طرف سے زبردست غلط فہمی کا شکار تھی۔ اچانک ہی اندر کمرے سے تانیا کی نحیف سی آواز سنائی دی۔

”کس سے لڑ رہی ہے..... کون ہے؟ میں نے تانی کے ہاتھوں سے بہ آہستگی اپنا گریبان چھڑایا اور اندر کمرے میں آ گیا۔ سامنے کھات پر تانیا نیم دراز تھا۔ پہلی نظر میں تو میں اسے پہچان ہی نہ سکا تھا وہ برسوں کے بیمار نظر آ رہے تھے اور برسوں کے بوڑھے نظر آ رہے تھے۔ ان کی صحت بھی متاثر ہوئی تھی۔ وہ بالکل نحیف و زار مریض کی طرح نظر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر یکدم خوشی کے تاثرات ابھرے۔ میں خدا کا شکر بجالایا..... ورنہ تو میں یہی سمجھا تھا کہ تانی کی طرح وہ بھی مجھے دیکھتے ہی میرے لئے لینا نہ شروع کر دیتے..... ”شش..... شو کے پتر.....! ت..... تو آ گیا۔“ وہ لرزیدہ آواز میں بولے اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگے..... میں نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا اور وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے۔

”پتر!..... تو کہاں چلا گیا تھا.....؟ کیا میری بات اتنی بری لگی تھی..... اوئے جھلے..... بڑے تو بولتے ہی ہیں۔ وہ رقیں ہو کر بولے..... تو میں نے بڑی ملامت آمیزی سے فوراً..... ”نہیں..... نہیں ابا! یہ بات نہیں تھی..... مجھے بھلا آپ کی بات

سے کھڑا ہو کر چند قدم میرے قریب آیا۔ ”کسی خوش فہمی میں پڑنے کی ضرورت نہیں سمجھ کا کے.....!“ وہ زہر خندہ لہجے میں بولا۔

”..... تجھے ضمانت پر رہا کیا گیا ہے..... کیس نہیں ختم ہوا تجھ پر اور..... ضمانت کسی بھی وقت منسوخ ہو سکتی ہے..... سمجھتے تم.....“

اس کے سرسراتے لہجے میں چھپی ہوئی دھمکی نے ایک لمحے کیلئے مجھے پریشان سا کر دیا۔

”..... اور ہاں.....“

”..... ایک بات کان کھول کر سن لو..... کا کے.....! تجھے ہفتے میں دوبار ادھر تھانے میں حاضری بھی بھرتے رہنا ہوگی۔“

”حوالدار جی.....! میں نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں..... اب ایک ذرا میری بھی عرص سن لیں۔“

میں نے اس کی گفتگو پوری ہونے کے بعد متحمل سے لہجے میں کہا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے..... دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا..... پھر میری طرف معاندانہ نظروں سے گھورتے ہوئے پھنکارا..... ”بولو۔“

”..... رانی کو اغوا ہوئے آج پورے ڈیڑھ مہینہ ہو چکا ہے..... اس کی بازیابی کیلئے آپ نے اب تک کیا کیا ہے.....؟“

”جس نے رپورٹ درج کروائی ہے اغوا کی اسے کہو آ کر یہ سوال کرے مجھ سے..... اب جاؤ یہاں سے.....“

وہ رکھائی سے بولا..... مجھے طیش تو آیا۔ مگر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہنا چاہا..... ”مگر..... حوالدار جی.....“

”بس..... اب جاؤ..... ورنہ حوالات کی سیر کرا دوں گا تمہیں۔“ وہ تہدید لہجے میں گھور کر بولا۔

”حوالدار جی.....! رپورٹ کروانے والا میرا تایا ہے..... اور میں اس کا بھتیجا ہوں..... وہ بوڑھا آدمی تھانے کے آخر کب تک چکر کاٹے گا.....؟ میں نے بلا خرا اپنی

بات پوری کر کے ہی دم لیا۔ اس نے غصے سے میز پر رکھا سیاہ رول بجایا اور دھاڑ کر بولا..... ”اگر اتنا ہی اپنے بوڑھے تایا جی کا خیال تھا تو پھر اتنے دن سے کہاں مرے ہوئے تھے..... میں کہتا ہوں سیدھی طرح سے دفع ہو جاؤ..... ورنہ.....“ اس نے تہدید کی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟..... کہاں جاؤں.....؟ اور کس سے جا کر فریاد کروں.....؟ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں سیدھا گھر پہنچا اور تایا ابا سے بولا۔

”ابا.....! آپ نے جن لوگوں کے ساتھ تھانے جا کر رانی کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی تھی..... مجھے ان کے نام بتاؤ۔ میں ان لوگوں کے ساتھ تھانے جانا چاہتا ہوں.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں حوالدار کریم داد کی بے رخی کے بارے میں بھی بتایا۔ میں نے دیکھا..... میری بات پر تایا ابا کے چہرے پہ ذہنی کرب کے آثار ابھرے اور وہ پڑمرده لہجے میں بولے۔ ”پتر! گاؤں کے لوگوں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے..... وہ ہمیں جادو ٹونے والے قبیلے سے تعلق رکھنے والا سمجھنے لگے ہیں..... اور سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔ میں تو اکیلا ہی روتا پیتا رانی بیٹی کے اغوا کی رپٹ کروانے گیا تھا.....“

تایا ابا کی بات پر جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں سمجھ لیا۔ مجھے اب حوالدار کریم داد کی بے رخی و بے اعتنائی کی وجہ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ مجھے گاؤں والوں پر بھی غصہ آنے لگا جنہیں ہماری طرف سے شدید غلط فہمی ہو گئی تھی، بلکہ غلط فہمی کیا..... یہ کھلی جہالت تھی بجائے وہ ہماری مدد کرنے کے الٹ ہم سے نفرت کرنے لگے تھے۔ یہ سب اس ذلیل جگدوش کی وجہ سے تھا۔ جس نے ہمیں کہیں کانہ رکھا تھا..... اگرچہ اس میں رانی کی بے وقوفی بھی شامل تھی۔ تا وہ میری محبت حاصل کرنے کے چکروں میں جگدوش جیسے شیطان کی آلہ کار بنتی..... تاہم یوں ذلیل و خوار ہو رہے ہوتے..... نیز خود رانی بھی بے چاری جانے اب تک کس حالت میں تھی۔ ایک جوان جہان کنواری لڑکی کا اتنے عرصے عائب رہنا معمولی بات تو نہیں ہوتی..... مجھے اب کبھی رانی پر طیش آتا تھا کبھی ترس آتا اس پر..... اس نے اپنی نادانی کی وجہ سے ہمیں تو مصیبت میں ڈالا ہی تھا..... مگر خود بھی وہ برباد ہو گئی۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں؟ رانی کو

اپنے ہی لوگوں کی مخالفت برداشت کرنی پڑتی ہے..... پر تم دل چھوٹا نہ کرنا اپنا.....“  
 ”نہیں مولوی صاحب! مجھے ذرا باتوں کی پروا تو نہیں..... مگر تایا تائی نے  
 رانی کی گمشدگی کو اپنے دل پہ لے لیا ہے۔“

”ہاں..... یہ تو دکھ ان بے چاروں کو جھیلنا ہی ہوگا۔“

”مولوی صاحب.....! آپ سے ایک گزارش ہے.....“ میں نے فوراً حرف

مدعا بیان کرنے کی غرض سے کہا۔

”ہاں شوکت بیٹا.....!“ بولا.....“

”مولوی صاحب! وہ خبیث حوالدار کریم داد ان دونوں چودھری برادران

سے ذرا دب رہا ہے..... یا ایسا درون خانہ رشوت کے عوض کر رہا ہے..... کہ وہ رانی کی

بازیابی کے سلسلے میں کوئی خاص قانونی کارروائی کرتا نظر نہیں آ رہا..... میں چاہتا ہوں کہ

اگر آپ..... گاؤں کے چند معتبر لوگوں کے ساتھ تھانے تشریف لے جا کر حوالدار کریم

داد پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں کہ..... وہ رانی کو بازیاب کرنے کے سلسلے میں ذرا

دلچسپی لے تو کچھ نتیجہ نکل سکتا ہے.....“ میری بات پر مولوی صاحب کے باریش چہرے

پر چند ٹاپے کیلئے پرسوج تاثرات پھیل گئے۔ وہ خاموش سے ہو گئے تھے..... پھر میں بھی

ان کے کچھ بولنے کے انتظار میں خاموش رہا پھر ذرا دیر بعد وہ پر خیال ہکاری بھر کر

بولے..... پتر شوکت.....! بات یہ ہے کہ..... گاؤں والے واقعی تم سے اور رانی کی

طرف سے زبردست بدگمانی کا شکار ہیں..... حالانکہ..... تمہارے تایا اکبر خان کی بھی

گاؤں میں بڑی عزت تھی..... مگر..... ان کالے منتروں اور جادو ٹونے کی وجہ سے ان کی

اپنی بھی عزت جاتی رہی ہے..... یوں تو میں نے گاؤں والوں کو اپنے طور پر سمجھانے کی

بہت کوشش کی ہے..... مگر وہ..... نہیں مانتے..... یہ تو شکر ہے کہ انہوں نے خاموشی اور

سب سے قطع تعلق (سوشل بائیکاٹ) کر رکھا ہے..... ورنہ تو وہ تمہیں اور اکبر خان کو

گاؤں سے بے دخل کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ میرے سمجھانے بجھانے پر انہوں نے

خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔“

”..... بڑی مہربانی مولوی صاحب آپ کی.....“ میں نے ہولے سے کہا۔ وہ

کدھر تلاش کروں..... وہ دونوں نخوت اور اتنا کے مارے ہوئے چودھری برادران ابھی  
 تک میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ جگدوش کی طرف سے بھی ایک ازلی پریشانی  
 میرے گلے میں نٹھی تھی۔ سوئی کے سر پر اس کا خطرہ الگ منڈلا رہا تھا..... اس وقت تو  
 میں نے جگدوش کی دھمکی کو قابل اعتنا نہیں جانا تھا مگر اب گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ  
 اس کی دھمکی کے الفاظ ہتھوڑوں کی طرح میرے دماغ میں ضربیں لگا رہے تھے۔ مجھے  
 اس کی طرف سے بھی غیر معمولی محتاطی اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ میں چوکھی حالات کا  
 بڑی بری طرح شکار ہو رہا تھا۔

بہر طور..... میں گھر سے نکلا اور..... سیدھا مسجد کے پیش امام مولوی تمیز الدین

کے ہاں پہنچا۔

پہلے وہ مسجد کے حجرے میں ہی رہتے تھے اب مسجد کے قریب ہی انہوں نے

ایک کمرے اور محن کا چھوٹا سا گھر تعمیر کر لیا تھا، مگر وہ مسجد میں ہی مل گئے تھے۔ مولوی

صاحب ہی پورے گاؤں میں وہ شخص تھے جو مجھے سمجھتے تھے اور میرے مسئلے کو بھی..... اس

کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب فطرتاً نیک نفس اور فراغ دل انسان تھے۔ مجھ سے بڑے

پر تپاک انداز میں ملے تھے..... میں نے انہیں شروع سے آخر تک اپنی ساری کٹھا

سنا ڈالی تھی۔

”الحمد للہ.....!“ وہ اپنی ریش پر دایاں ہاتھ پھیر کر بولے۔

”..... بیٹا.....! تم شیطانی طاقتوں کے خلاف لڑ رہے ہو..... اور اللہ کا بھی یہ

حکم ہے کہ شیطان اور شیطان کے پجاریوں کی بیخ کنی کرتے رہو..... کیونکہ انسان کی

زندگی کا مقصد حصول مسرت نہیں بلکہ تکمیل انسانیت ہے..... اللہ تمہیں اپنے نیک مقصد

میں ضرور کامیابی عطا فرمائے.....“

”آمین..... میں نے زیر لب کہا پھر بولا..... مولوی صاحب.....! وہ تو سب

ٹھیک ہے مگر..... مجھے انفس اپنے گاؤں کے لوگوں پر ہو رہا ہے..... انہیں ہماری طرف

سے شدید غلط فہمی ہو گئی ہے.....“

وہ مسکرا کر بولے..... ”بیٹا..... سچائی کی راہ میں چلنے والوں کو بعض اوقات

چودھری پرویز) کے دباؤ یا لالچ میں آ کر مجھ پر کا سو جلا کے ذریعے حوالات میں ہی انسانیت سوز تشدد کیا تھا اور مجھے ایک خود ساختہ اور جھوٹے بیان پر دستخط کرنے کیلئے اکسایا تھا..... جس کی رو سے..... میں نے ہی چودھری حشمت علی خان کے کہنے پر ”چودھری برادران“ کے باپ وڈے چودھری عالم خان پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا اور اسے بالآخر قتل کر کے ہی چھوڑا تھا اور یہ سب باتیں..... چودھری حشمت علی خان کو بھی معلوم تھیں جس نے بعد میں آ کر میری ضمانت بھی کروانے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اس شخص کا خیال ذہن میں آتے ہی میں نے گھر جانے کا ارادہ سردست ترک کر دیا اور چودھری حشمت علی خان کی حویلی کی طرف چل دیا.....

مجھے یقین تھا اس وقت حویلی کے بجائے اپنے ”ڈیرے“ پر ہی موجود ہوں گے۔ جوان کی حویلی سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں اپنے راستے چلا جا رہا تھا اور اس وقت مکئی کے کھیتوں کے درمیان بنی میڑھی میڑھی کچی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے سامنے گردوغبار کے بگولے فضا میں اڑتے نظر آئے..... شاید کوئی گاڑی تھی جو خاصی تیز رفتاری کے ساتھ سامنے سے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں ذرا ٹھٹھک کر رک گیا۔ وہ جیب تھی۔ کچھ دیکھی بھالی لگ رہی تھی۔ قریب آئی تو میں بری طرح چونک پڑا۔ یہ جیب بغیر ہڈ کے تھی۔ یعنی اپنی پائیوں کا جنگلا نصب تھا مگر اس پر کیڑوس ہڈ نہ تھا۔ یہ جیب ان دونوں فساد ”چودھری برادران“ کی تھی۔ وہ دونوں سامنے کی نشستوں پر براجمان تھے۔ چودھری نیاز کے ہاتھوں میں اسٹیرنگ تھا، عقبی سیٹوں پر ان کے تین رائل بدست کارندے براجمان تھے۔ جیب ایک زبردست جھٹکے سے قریب آ کر رکی اور وہ سب مجھے گھورتے ہوئے کدکڑے مار کر جیب سے اتر پڑے۔ میرا دل سینے میں بری طرح دھڑکنے لگا۔ ان کے تیور مجھے ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے۔ دونوں چودھری برادران خشناک نظروں سے گھورتے ہوئے میرے قریب آ کر کے پھر چودھری پرویز نے مجھ سے قہر آلود لہجے میں کہا ”اوئے..... کدھر فرار تھا تو اب تک.....؟“

میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا کر نڈر لہجے میں کہا..... ”میں شہر گیا تھا۔“  
”ہوں..... شہر گئے تھے..... یا..... ہمارے ازلی دشمن چودھری حشمت علی

میری افسردگی کو سمجھتے ہوئے ازراہ شفقت میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”پتر شوکت.....! تو اپنا دل چھوٹا نہ کر..... جھوٹ کے دن تھوڑے اور سچائی کی عرطوبل ہوتی ہے..... آج تیری سچائی کو جھوٹ سمجھنے والے انشاء اللہ اسے سچ مان کر تمہاری اتنی توقیر کریں گے کہ..... تمہارے دکھوں کا ازالہ ہو جائے گا۔“

مولوی صاحب کی باتوں سے میرے ٹوٹے ہوئے دل کو ذرا ڈھارس بندھی اور میں انہیں سلام کر کے واپس آ گیا۔ گاؤں کے لوگ مجھے چھپتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور مجھے دیکھ کر ہی نفرت سے منہ اپنا پھیر کر راستہ بدل لیتے تھے بلکہ چند اشتعال پسندوں نے تو کھلے بندوں مجھے طعن و تشنیع کا بھی نشانہ بنایا تھا۔  
”..... اس شیطان کے پجاری سے دور رہو کہیں یہ مردود ہم پر بھی کالا جادو نہ کر ڈالے.....“

”..... اللہ ہمارے ایمان کی سلامتی رہے بھیا.....! اس مردود شیطان کے چیلے پہ کڑی نگاہ رکھنا..... کہیں یہ ہمارے نو جوانوں کو نہ بھٹکانے کی کوشش کرے..... وغیرہ وغیرہ۔“

غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ میں قتل سے یہ سب برداشت کر رہا تھا۔ کیونکہ مولوی صاحب کی سختی سے مجھے تاکید تھی کہ..... میں مشتعل ہو کر کسی سے الجھنے کی کوشش نہ کروں۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا مگر ابھی تک میرے ژولیدہ ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا..... مولوی صاحب کے پاس جس امید کے سہارے میں گیا تھا۔ وہ پوری نہ ہو سکی تھی۔ ان کے بعد ایک نام اور امید کا جگنو بن کر میرے تیرہ کار دماغ میں گونجا تھا اور وہ نام تھا۔ چودھری حشمت علی خان..... یہی وہ شخص تھا جو میری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتا تھا۔ میری اس سے ایک ملاقات غالباً تھانے میں بھی ہو چکی تھی۔ یہ ان دنوں کا ذکر تھا جب..... ”چودھری برادران“ نے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ میں نے ہی ان کے دشمن دیرینہ..... چودھری حشمت علی خان سے ساز باز کر کے رانی کو چودھری عالم خان کے قتل پر اکسایا تھا اور بہانہ یہ بنایا تھا کہ رانی کو جن چڑھ گیا تھا اور پھر بعد میں حوالدار کریم داد نے چودھری برادران (چودھری نیاز اور

شعلہ باز نظروں سے میری طرف گھورنے لگے۔ ان دونوں کی بظلوں سے ہولسٹر جھول رہے تھے۔ پھر یک بارگی ان دونوں نے ہی اپنے چرمی ہولسٹروں سے پستول نکال لئے۔ میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اچانک میں نے ان دونوں کو چوکتے ہوئے دیکھا۔ وہ میرے عقب میں دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹھکے تھے۔ میں نے بھی غیر ارادی طور پر ان کی ٹھٹھکی ہوئی نظروں کی سیدھ میں اپنے عقب میں مڑ کر دیکھا۔ ایک کار خاص تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی ہماری طرف آرہی تھی۔ پھر وہ قریب آ کر رک گئی اس کے اندر سے ایک بھاری بھر کم اور لمبے تر سگے شخص کو دیکھ کر میرے چہرے پر قدرے طمانیت پھیل گئی۔ مگر میں تھوڑا متوحش سا بھی ہونے لگا۔ اس کی عمر والے سرخ و سپید شخص نے سفید کڑکڑاتی ہوئی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ یہ چودھری حشمت علی خان تھا۔ اس کی باتیں بغل سے گولیوں کی پٹی کی صورت میں ایک ہولسٹر بھی جھول رہا تھا۔ اس کے ہمراہ چار مسلح کار پرداز بھی اتر آئے تھے۔

اب دونوں دیرینہ دشمن آمنے سامنے تھے اور میں ان ہاتھیوں کے درمیان تھا اور بالخصوص میرے لئے یہ بہت ہی مخدوش اور سنگین صورت حال تھی۔

چودھری حشمت نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی پھر ان دونوں چودھری برادران کی طرف گھورنے لگا۔ وہ دونوں بھی اس پر بر مانی ہوئی نظریں جمائے ہوئے تھے۔ چودھری حشمت علی خان کے اتفاقاً اور بالکل غیر متوقع طور پر یہاں پہنچ جانے سے البتہ مجھے کسی قدر ان دونوں خار کھائے چودھری برادران سے اپنی گلو خلاصی ہونے کی امید ہو چلی تھی۔ چودھری حشمت علی خان شاید شہر سے لوٹا تھا اور اپنے گاؤں کی طرف ہی جا رہا تھا کیونکہ اس کی جاگیر کا علاقہ ادھر ہی سے گزرتا تھا۔

میں نے چودھری حشمت علی خان کو سلام کیا تو وہ مجھ سے بارعب لمبے میں بولے۔

”..... کیوں کا کا شو کے.....! تو ادھر کیا کر رہا ہے.....؟“

”بچ..... چودھری صاحب! میں آپ ہی سے ملنے آ رہا تھا کہ.....“

میں نے ان سے یہ کہہ کر ایک نظر چودھری برادران کی طرف دیکھا اور دانستہ

خان کے ساتھ ہمارے خلاف کوئی نیا گٹھ جوڑ کر رہے تھے.....“ چودھری نیاز نے کاٹ دار لمبے میں کہا۔

میں نے متحمل لمبے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے چودھری صاحب! آپ کو میری طرف سے سخت غلط فہمی ہے..... رب دی سون..... میں تو چودھری حشمت علی خان کو جانتا بھی نہیں ہوں..... میں ایک غریب لڑکا ہوں جی..... بھلا چودھریوں سے میرا کیا میل.....؟“ میری بات پر دونوں چودھری برادران نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا پھر چودھری پرویز مجھے گھور کر بولا..... اگر چودھری حشمت علی خان سے تیرا کوئی گٹھ جوڑ نہیں تو پھر ہماری بات کیوں نہیں مانتا تو.....؟“

”کیسی بات جی.....؟ میں نے پوچھا۔

”..... زیادہ لگا کا کا بننے کی کوشش نہ کر..... سمجھا تو.....“ چودھری نیاز غصے

سے دھاڑا۔

”..... ہم تیری بات کا تب ہی اعتبار کریں گے جب تو چودھری حشمت علی خان کے خلاف پولیس کو اپنا بیان ریکارڈ کروائے گا کہ تو نے ہی اس کے کہنے پر ہمارے سونہریں پو (چودھری عالم خان) کا قتل کیا ہے۔“

”..... او جی..... اس طرح تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔“ میں نے مسکے صورت بنا کر کہا۔

”..... تو کیا ہم تجھے زندہ چھوڑ دیں گے.....؟“ چودھری نیاز مجھے گھورتے

ہوئے غرا کر بولا۔

”اوئے..... بات سمجھ ہماری.....“ چودھری پرویز نے مجھ سے کہا۔

”..... ہم تجھے بچالیں گے..... یہ ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے.....

بس ایک بار چودھری حشمت کے گلے میں چھانسی کا پھندا پڑ جائے۔“

”معاف کرنا چودھری صاحب! میں یہ کام نہیں کر سکتا..... کیوں کہ میں نے

کوئی جرم نہیں کیا ہے۔“ میں نے بالا خرحتی جواب سے انہیں نواز ہی دیا۔ وہ دونوں

کھڑا ہے.....“

”اوائے چل جا..... کسی اور کو جا کر یہ گیدڑ بھھکیاں دے..... چل.....“

چودھری حشمت علی خان کا بھی خون گرم ہو گیا۔ میں نے خطرے کی بو محسوس کی۔ میں کار کے قریب جا کر ذرا راکا اور عقب میں مڑ کر دیکھا تو..... چودھری برادران سمیت ان کے تینوں کارندوں نے ہم پر پستولیں نکال کر تان لیں۔ ادھر چودھری حشمت کے چاروں آدمیوں نے بھی اپنی رائفلیں اور بندوقیں ان پر سیدھی کر لی تھیں اور چودھری حشمت کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے تھے اور پھر ان میں سے ایک نے چیخ کر چودھری برادران سے کہا۔ ”خبردار! اگر کسی نے اب ہمارے چودھری جی کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو.....“ اس کی للکار نے ان سب کو صم بکھم کھڑا رہنے پر مجبور کر دیا، پھر اس کے بعد ہم سب کار میں سوار ہو گئے۔ میرا متوحش دل سائیں..... سائیں..... کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ چودھری حشمت علی خان نے ڈرائیونگ خود سنبھال لی۔ میں عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا، پھر جیسے ہی کار چودھری برادران کے قریب سے ہو کر ابھی ذرا ہی دور گئی تھی کہ اچانک سناٹے دار ٹھٹھکی ہوئی فضا میں گولیوں کی خوف ناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ چودھری برادران اور ان کے تینوں کارندوں نے ہماری کار پر فائرنگ کر ڈالی تھی۔ کئی گولیاں کار کی باڈی میں زنا زٹ کی آواز سے پوسٹ ہو گئیں اور کار کا عقبی شیشہ بھی ایک دھماکے سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ میرے دائیں بائیں بیٹھے چودھری حشمت علی خان کے دو آدمیوں نے بھیا نک چیخ ماری ان کے سر ڈھلک گئے۔ ان کی گردنوں کے عقبی حصے میں شاید گولیاں لگی تھیں۔ شکر تھا کہ مجھے گولی نہیں لگ سکی تھی۔ چودھری حشمت کے حلق سے ایک طیش بھری غراہٹ ابھری اور اس نے فوراً کار کو بریک لگا دیئے۔ میں نیچے جھک گیا تھا۔ گولیوں کی تڑا بڑی جاری تھی۔ اب چودھری حشمت علی خان اور اس کے باقی بچے کچھے دو آدمیوں بنے کار سے اتر کر اس کی آڑ میں جوابی فائرنگ شروع کر ڈالی تھی۔ میں ابھی تک کار کی عقبی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ دھواں دھار فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو چکا تھا۔ میرا دل بے تحاشا دھک دھک کر رہا تھا۔ اچانک پھر مجھے چودھری حشمت علی خان کے ایک اور آدمی کی کرہ بہ انگیز چیخ سنائی دی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ گویا اب

اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو ان دونوں چودھری برادران میں سے چودھری نیاز نے چودھری حشمت علی خان سے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”..... کیوں حشمت علی خان! کیا اب اس کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف کوئی نئی سازش تیار کرنے والے تھے تم؟“ اس کی طنز کی زہریلی کاٹ کو محسوس کر کے چودھری حشمت علی نے ایک برماتی ہوئی نظر چودھری نیاز پر ڈالی..... پھر چند قدم اس کے قریب آ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

”..... اوائے تمہاری مت (عقل) ماری گئی ہے یا میرے اپنے آدمی مر گئے ہیں جو میں ایک غریب کا کے کو اپنا آلہ کار بناؤں گا اور ہاں..... اپنے دلوں سے یہ غلط فہمی نکال پھینکو کہ..... میں نے تمہارے ابا (باپ) کا خون کیا ہے..... میں چودھری عالم خان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔“

”چودھری حشمت.....! ہمیں پورا یقین ہے کہ ہمارے سوہنے ابا کا قتل تو نے ہی کروایا ہے.....“

”اچھا چلو پھر جیسا تم سمجھو..... مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔“ بلا آخر چودھری حشمت نے لا پرواہانہ لہجے میں کہا اور پھر مجھ سے بولا۔ ”چل اوکا کے شوکت.....! میری گڈی میں بہہ جا کر.....“

”نہیں چودھری! یہ ہمارا مجرم ہے..... تو اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔“ چودھری نیاز نے ٹھیلے لہجے میں کہا تو چودھری حشمت علی خان کے چہرے پہ سناٹے کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور پھر وہ..... اسے گھور کر گونجدار آواز میں بولا..... اوائے..... یہ جس کا بھی مجرم ہے مگر اس وقت یہ مجھ سے ملنے آ رہا تھا..... تمہیں کوئی اعتراض ہے تو..... جا کر قانون کا دروازہ کھٹکھاؤ۔“

”چل اوائے..... تو نے سنا نہیں..... میری گڈی میں بیٹھ جا جا کر۔“ چودھری حشمت نے آخر میں مجھے بھی گھور دیا۔ میں خاموشی سے ان کی کار کی طرف بڑھ گیا تو میری ٹھٹھکی ہوئی سماعتوں میں چودھری پرویز کی للکارتی ہوئی آواز گونجی..... ”چودھری حشمت علی خان.....! تو یہ اچھا نہیں کر رہا۔ یہ مت بھول کہ تو اس وقت ہماری جاگیر پر

بڑھ کر چودھری حشمت کو سنبھالا وہ ہوش میں تھے۔

”چودھری صاحب! آپ ٹھیک تو ہونا۔“

”کا کا.....! تو بھاگ جا..... ورنہ یہ تجھے بھی بے گناہ مار ڈالیں گے.....“

چودھری حشمت نے اپنی تکلیف کو دانتوں تلے بھینچ کر مجھ سے کہا تو میں پر جوش قطیعت سے بولا۔ ”نہیں چودھری صاحب! میں آپ کو ان بزدل گیدڑوں کے زرخے میں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک مجھے قریب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سنائی دی۔ میں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ مڑا تو چودھری پرویز اور اس کے ایک کارندے کو جھاڑیوں سے ابھرتے دیکھا۔ میں نے فوراً راتقل کارخ ان کی طرف موڑا وہ دونوں ٹھٹکے میں نے ادھر لپٹی دبا دی۔ کارندے کی پیشانی اڑ گئی اور آواز نکلے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ جبکہ چودھری پرویز زخمی ہو کر جھاڑیوں میں ہی بے سدھ گر پڑا۔ میں نے چودھری حشمت علی خان کو سہارا دیا اور عقابی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں سنبھالے کار کا عقبی دروازہ کھول کر انہیں اندر بیٹھا دیا اور خود جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی بھی کار نہیں چلائی تھی۔ مگر مجھے ٹریکٹر وغیرہ چلانا آتا تھا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے کار اسٹارٹ کی اور گیر بدل کر ایکسیلیٹر دبا تا چلا گیا۔ کار کا انجن زور سے غرایا اور ایک طوفانی جھٹکے کے ساتھ اچھل کر آگے بڑھی اور کچے تارہوار راستے پر آندھی طوفان کی طرح دوڑنے لگی۔

”او کا کے.....“ تو ڈوڈا بہادر اور جی دار ہے.....“ ذرا دیر بعد چودھری حشمت علی خان نے اپنے مخصوص لہجے میں میری بہادری پر تبصرہ کیا۔ بلاشبہ ایک قدردان اور زندہ دل آدمی ہے۔

”چودھری صاحب! میں نے بھی ان کے کارندوں سے خوب بدلہ لیا ہے..... میں نے جوابا کہا۔

”شادا.....! میں تو کہتا ہوں..... ان کا بھی صفایا کر کے ہی جاتے ہیں..... گڈی موڑ واپس.....“ اچانک چودھری حشمت نے کہا تو میں بولا.....“ چودھری صاحب! جیسا آپ کا حکم..... ہو۔“

چودھری حشمت کے ساتھ صرف ایک آدمی بچا تھا۔ میں نے اب اس جنگ میں کودنے کا فیصلہ کیا اور چودھری حشمت کے ایک مردہ ساتھی کی راتقل اور گولیوں کی پٹی اٹھائی اور بہ احتیاط کار کا دروازہ کھول کر باہر رینگ گیا۔ مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی۔ میں بھر بھری مٹی والی زمین سے چپک کر رہ گیا۔ مجھے اپنے چہرے کے قریب سے گزرتی و سنسناتی گولیوں کی ”جھپک“ صاف سنائی دی تھی۔ میں بال بال بچا تھا۔ میں نے راتقل کو سیدھا کیا اور لیٹے لیٹے فائرنگ کی سمت دیکھا تو مجھے چودھری برادران کی جیب نظر آ گئی۔ جس کے عقب میں چھپے ہم پر فائرنگ کر رہے تھے۔ ابھی تک ان کے تین کارندوں میں سے کوئی بھی ہلاک نہ ہوا تھا جبکہ ادھر چودھری حشمت علی خان کے تین آدمی دشمنوں کی گولیوں کی بھیٹ چڑھ چکے تھے اور..... تب پھر میرے اندر پہلی بار ان دنوں اکھڑ مزاج چودھری برادران کے خلاف نفرت کا لاوا کھل اٹھا اور پھر میں نے بھی وہیں بھر بھری مٹی والی زمین پر لیٹے لیٹے..... ان کی جیب پر پورا برسٹ فائر کر ڈالا..... اور پھر تیزی سے قریب کی جھاڑیوں میں رینگ لیا۔

اچانک دشمنوں کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ میں نے خود رو جھاڑیوں کی اوٹ سے جیب کی طرف دیکھا وہاں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا پھر میں نے ذرا مڑ کر کار کی طرف دیکھا تو چودھری حشمت اور ان کا اکلوتا آدمی کار کی آڑ سے ابھر کر اس پار دیکھنے لگے۔ اور تب مجھے دشمنوں کی مکاری کا اندازہ ہوا جب نامعلوم سمت سے اچانک دوبارہ گولیوں کی سمع خراش تڑتڑاہٹ ابھری اور میں نے دونوں کو چپچسپ مارتے زمین بوس ہوتے دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اور دماغ جوش غیظ کے مارے سلگ اٹھا۔ میں نے فوراً اپنا سر ذرا اٹھا کر فائرنگ کی سمت دیکھا تو..... مجھے چودھری برادران کے دو کارندے نظر آئے۔ میں نے آؤ دیکھا تاؤ ان کا نشانہ لیا اور لپٹی دبا دی۔ میری راتقل نے ایک خونی قہقہہ اگلا..... وہ دونوں خبیث کارندے حلق کے بل جگر پاش چپچس مار کر لہرائے اور زمین بوس ہو گئے۔ میں پھرتی سے رینگ کر چودھری حشمت کی طرف بڑھا تو میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ وہ زندہ تھے مگر زخمی حالت میں اور ان کے دائیں بازو میں گولی لگی تھی جبکہ ان کا آخری ساتھی ہلاک ہو چکا تھا۔ میں نے آگے

حالات کی اس غیر متوقع اور اچانک کشاکشی نے میرے اعصاب مضطرب کر ڈالے تھے مگر میں کچا کھلاڑی نہ تھا۔ لہذا چودھری حشمت علی خان کی حویلی پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ ہماری کار اور چودھری حشمت علی خان کی حالت دیکھ کر حویلی میں ہی نہیں بلکہ پورے گرائیں میں کہرام مچ گیا۔ چودھری کے آدمیوں کی تعداد میں بھی کمی نہ تھی وہ ہی نہیں بلکہ پورا گاؤں مشتعل ہو گیا۔ وہ اپنے وڈے چودھری پر قاتلانہ حملہ کرنے والے ان چودھری برادران کو اس وقت مزہ چکھانا چاہتے تھے مگر چودھری حشمت علی خان تحمل مزاج اور سمجھدار آدمی تھے۔ انہوں نے بمشکل انہیں روکا اس کے بعد چودھری کا بڑا بیٹا خاور علی جلدی سے گاؤں کے ایک ڈاکٹر کو بلا لایا۔ شکر تھا کہ گولی بڑی میں نہ لگی تھی صرف بازو کا گوشت چھید کر نکل گئی تھی۔ بہر طور ڈاکٹر نے ان کی مرہم پٹی کر دی تھی۔ چودھری حشمت علی خان کے تین بیٹے تھے۔ دو چھوٹے شہر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جبکہ بڑا بیٹا خاور علی ان کے ساتھ رہتا تھا اور زمینوں و دیگر معاملات میں ان کا ہاتھ بنایا کرتا تھا وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے پینے میں رہی ہوگی۔ یہ لوگ سب حویلی سے ملحقہ بیٹھک میں موجود تھے۔ میں اپنا مسئلہ بیان کرنے چودھری حشمت علی خان سے ملنا چاہتا تھا مگر..... اب انہیں خود تکلیف میں دیکھ کر سردست چپ رہا۔ لیکن چودھری صاب کی یہ بھلے مانسی تھی کہ انہوں نے ذرا دیر بعد خود ہی مجھ سے پوچھ لیا۔

”اوئے کا کا.....! تو بتا..... مجھ سے کیوں ملنا چاہتا تھا.....؟“

ان کے استفسار پر میں نے کہا۔ ”چودھری صاحب! بس رہنے دیں..... پھر

کبھی سہی۔“

”نہیں اوئے..... اس وقت بتا..... کیا بات کرنا چاہتا تھا تو مجھ سے..... یہ

تب پھر اچانک میں نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھا تو یکدم چونک پڑا.....“

ہمارے تعاقب میں چودھری برادران کی جیپ دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا ”لوجی چودھری صاحب.....! شکار خود آ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے کا کے.....! تو گڈی کو روک دے..... میدان جنگ سے بھاگنا

ہماری شان نہیں ہے.....“ میں نے ایسا ہی کیا اور فوراً ایک ویران جھنڈ میں کار روک لی

اور دروازہ کھول کر باہر اتر آیا۔ چودھری حشمت علی خان نے بھی زخمی ہونے کے باوجود

کار سے اترنے میں سستی نہیں دکھائی تھی۔ اب ان کے ہاتھوں میں بھی رائفل نظر آ رہی

تھی۔ جو شاید عقبی سیٹ پر موجود اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشوں میں سے ایک کی لی

تھی۔ کیوں کہ دوسرے کی میرے پاس تھی۔ ہم دونوں جھاڑیوں میں آ گئے۔ دشمنوں

نے شاید ہمیں دور سے ہی کار سے اترتے دیکھ لیا تھا اور انہوں نے اپنی جیپ وہیں

روک لی تھی۔ میں نے اور چودھری حشمت نے انہیں جیپ سے اترنے کا موقع دیے

بغیر تابوت توڑ فائرنگ کر ڈالی۔ دشمن پر ہماری جی داری کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور وہ فوراً

جیپ ریورس کر کے بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ”بھاگ گئے بزدل کہیں کے.....“ چودھری

حشمت نے زہر آلود لہجے میں کہا تو میں نے ان سے کہا۔ ”چودھری صاحب.....! میرا

خیال ہے اب ہمیں واپس ہی چلے چلنا چاہئے ٹھیک ہے کا کا!“ وہ ہولے سے ہولے۔

☆.....☆.....☆



میرا خیال تھا کہ چودھری شمت علی خان..... سب سے پہلے چودھری برادران کے خلاف پرچہ کٹوائے گا مگر ایسا نہیں ہوا انہوں نے حوالدار کریم داد کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”حوالدار.....“ رانی کا اب تک کیا بتا؟..... برآمد ہوئی یا نہیں.....“ ان کے اچانک استفسار پر حوالدار کریم داد بوکھلا سا گیا پھر بولا..... ”جی..... جی..... ہم کوشش کر رہے ہیں۔“

”کیا مٹی کوشش کر رہے ہو تم.....؟..... چودھری درشت لہجے میں بولا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

”اوائے کا کا.....! تجھے کن پر شبہ ہے.....؟ میں جانتا تھا انہوں نے دانستہ یہ سوال حوالدار کریم داد کے سامنے مجھ سے پوچھا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی بلا تعویق و تاہل کہا۔ ”جی چودھری جی!..... شبہ نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ..... یہ حرکت چودھری نیاز اور پرویز کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔“

میرے جواب پر حوالدار کریم داد نے دانت بھیج کر مجھے گھورا پھر کرخت لہجے میں بولا۔

”اوائے تجھے کیسے یقین ہے کہ یہ حرکت ان کی ہو سکتی ہے تجھے کیا خواب میں الہام ہوا تھا۔

”حوالدار..... یہ بات تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ..... رانی کو اٹھانے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں..... اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے کہنے پر آپ نے مجھ پر اپنے کاسو نامی جلاد کے ہاتھوں تشدد بھی کروایا تھا تا کہ میں آپ کی مرضی کے بیان پر اپنے دستخط کر ڈالوں۔“ میں نے بھی اسے آڑھے ہاتھوں لیا، وہ بوکھلا سا گیا۔

”یہ کا کا..... کیا کہہ رہا ہے..... حوالدار.....؟ چودھری شمت علی خان نے اسے گھور کر پوچھا۔

”یہ بکواس کرتا ہے..... چودھری صاحب.....!“ حوالدار کریم داد مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے چودھری شمت علی خان سے بولا۔

جھکڑے تو ہمارے گھر کی لونڈیاں ہیں..... ہاں پتر دس مجھے.....“ وہ جیسے آخر میں مجھے پکارتے ہوئے بولے۔

”چودھری صاحب! رانی کو گواچے (گم) ہوئے مہینہ ہو چلا ہے..... میں جب تھانے گیا تو حوالدار کریم داد الٹا مجھ پر ہی گرم ہو گیا۔ کہنے لگا پہلے ہماری مرضی کے بیان پر دستخط کرو کہ میں نے اور رانی نے آپ کے کہنے پر چودھری عالم خان کا خون کیا ہے..... ورنہ مجھے دوبارہ اندر کر دے گا۔ چودھری نیاز اور پرویز بھی یہی مجھ سے چاہتے ہیں۔“ میں نے بالآخر انہیں ساری بات بتادی جسے سن کر چودھری شمت علی خان کے چہرے کا رنگ متغیر سا ہو گیا پھر اس کی جگہ طیش بلاخیز نے لے لی اور وہ اس لہجے میں غصے سے بڑبڑائے۔

”..... اس حوالدار کی یہ جرات..... چل تو ابھی میرے نال..... تھانے..... چل کر نشتے ہیں“

”نہیں چودھری صاحب! ابھی آپ رہنے دیں..... آپ کے حالات صحیح ہو جائیں تو بعد میں.....“

”اوائے ہمارے حالات ایسے ہی رہتے ہیں..... اور ویسے بھی ہم نے اپنی رپورٹ لکھوائی ہے.....“ چودھری شمت علی خان نے میری بات کاٹ کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اباجی.....! میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ ان کا بیٹا خاور بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

ان کے بعد آغا فانا..... دو گاڑیوں اور آٹھ دس گھوڑوں پر مشتمل مسلح افراد کا یہ قافلہ روانہ ہوا اور سیدھا پہنچ کر ہی دم لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں ایک بار پھر..... چودھریوں کے ساتھیوں میں دوبارہ جنگ نہ چھڑ جائے، مگر تھانہ خالی تھا۔ البتہ حوالدار کریم داد اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ مجھے اور چودھری شمت علی خان کو ساتھ دیکھ کر ایک لمحے کو چونک سا گیا تھا پھر جبراً چہرے پر مسکراہٹ سجا کر اس نے صرف چودھری شمت علی خان اور ان کے بیٹے خاور سے ہاتھ ملایا تھا اور مجھے یکسر نظر انداز کر ڈالا تھا۔

سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ ادھر چودھری حشمت علی خان، حوالدار کریم داد کو متذبذب پا کر بولے..... اچھا چل..... رانی کے اغوا پر ان دونوں بھائیوں کے خلاف تو پرچہ کاٹ لے..... ان دونوں سے میرے آدمی خود ہی نمٹ لیں گے۔“

طوعاً و کرہاً..... حوالدار کریم داد نے چودھری حشمت علی خان سے کہا۔

”..... دیکھئے چودھری صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ..... میں خود بھی مجبور ہوں..... ابھی میں چودھری عالم خان کے قاتل کو ہی گرفتار نہیں کر سکا ہوں..... پھر الٹا..... مقتول کے بیٹوں کی بھی محض رانی کے اغوا کے شے میں گرفتاری کے احکامات جاری کر دوں..... اس طرح تو میرے لئے بھی مشکل پڑ جائے گی..... آپ سمجھدار آدمی ہیں..... ضرور میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔“

”ہوں..... تو یہ بات ہے.....“ چودھری حشمت علی خان ہرکاری بھرتے ہوئے بولا۔

”اچھا تو ٹھیک ہے پھر..... یہ معاملہ بھی ہم خود ہی حل کر لیں گے..... مگر پھر تم بیچ میں مت آنا ہمارے..... سمجھ گیا نا تو..... یہ کہہ کر وہ پلٹے اور ہم بھی باہر آ گئے، پھر میں نے ان سے اجازت چاہی تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”اوئے کا کے شو کے.....! تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے..... وہ دونوں تیرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں..... تیری جان کو بھی خطرہ ہے..... تو کدھر جائے گا..... چل ہمارے ساتھ آج سے تو ہمارے ساتھ رہے گا۔“

”چودھری صاحب! آپ کی بڑی مہربانی..... وہ بات یہ ہے کہ..... میرا تایا اکبر خان بہت پریشان ہو جائے گا۔ وہ بے چارہ اپنی بیٹی رانی کی کشدگی سے بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ ایسے میں اسے میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں..... میرا اللہ میرے نال ہے۔“

”اوئے کا کا.....! تو واقعی بہت جی دار منڈا ہے۔“ وہ فخر سے میرا کاغذ ہاتھ تھپتھا کر بولے۔ ”اچھا پھر جیسے تیری مرضی..... مگر..... ہم سے ملتے جلتے رہنا..... رانی کا بھی کچھ سوچ لیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میں واپس اپنے گھر کی طرف لوٹ گیا..... مگر پھر سوئی

”..... حقیقت میں آپ بتاتا ہوں جی..... بات دراصل یہ ہے کہ..... یہ شوکا..... بڑا ہی کمینا آدمی ہے..... اس نے آپ کے اور چودھری نیاز وغیرہ کے بیچ جھگڑا کر دانے کا سوچ رکھا ہے..... جب شروع شروع میں ہم نے اسے چودھری عالم خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا تو اس مردود نے یہی بیان دیا تھا کہ..... اس نے چودھری عالم خان کا قتل آپ کے کہنے پر کیا ہے۔“

میں حوالدار کریم داد کے اس سفید جھوٹ پر کھول اٹھا۔

”یہ جھوٹ ہے چودھری صاحب!“ میں احتجاجاً چلا کر بولا۔

”بلکہ حقیقت یہی ہے کہ میں اس سے پہلے آپ کو جانتا بھی نہ تھا..... مگر..... حوالدار نے ہی چودھری نیاز اور چودھری پرویز کے دباؤ پر مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ..... میں ان کی مرضی کے مطابق یہی بیان دوں کہ..... میں نے آپ ہی کے کہنے پر یہ قتل کیا ہے..... ورنہ مجھے پھانسی ہو جائے گی۔“

چودھری حشمت علی خان..... کریم داد اور چودھری برادران کے خفیہ درون خانہ گٹھ جوڑ سے اچھی طرح واقف تھا لہذا وہ اس کی بات سے صرف نظر کرتے ہوئے اس سے بارعب لہجے میں بولا۔

”..... دیکھو حوالدار جی! سب سے پہلے اب تم چودھری عالم خان کے ان دونوں بیٹوں کے خلاف رانی کے اغوا کا پرچہ کاٹو گے پھر..... جب میں بھی ان کے خلاف پرچہ کٹاؤں گا۔ چودھری حشمت علی خان کی بات پر حوالدار کریم داد ایک دم چونک کر ان سے مستفسر ہوا۔

”آ..... آپ..... نے بھی پرچہ کٹانا ہے؟..... آپ کے ساتھ کیا ہوا.....؟“ اس کے استفسار پر بلاخر چودھری حشمت علی خان نے اسے چودھری برادران اور ان کے آدمیوں کے ہم پر قاتلانہ حملے کی روئیداد بیان کر ڈالی۔ جسے سن کر حوالدار کریم داد بھونچکا رہ گیا۔ اس کے چہرے سے اب دیدنی حد تک پریشانی مترشح ہونے لگی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ مجھے خود بھی البتہ اس بات پر تعجب تھا کہ ابھی تک چودھری برادران نے بھی حوالدار کریم داد کو ایسی کسی بات

”رانی کو تو بھول گیا.....“ دوسرے ہی لمحے اس نے پراسرار لہجے میں کہا۔  
میں چونک پڑا۔ میرا دل رانی کے ذکر پر یکبارگی دھڑکا تھا۔ کہیں اس نے تو رانی کو اغوا  
نہیں کیا تھا۔ مگر رانی کو تو اغوا ہوئے مہینے سے اوپر کا عرصہ بیت چکا تھا.....؟ جبکہ  
جگدوش..... تو ابھی یہاں ظاہر ہوا تھا اور وہ بھی میرے ساتھ ہی.....؟ میں نے سوچا۔  
”ذال دیا تا میں نے تجھے چتا میں۔“ وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔ میری  
انجھی ہوئی پرسوج خاموشی کو اس رذیل نے میرے تفکر پر محمول کیا تھا۔ میں نے ذرا  
مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ ”رانی کو تو غائب ہوئے ایک ڈیڑھ مہینے  
ہو چکا ہے..... اور تم.....“

”ہاں..... میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے اور کن لوگوں کے قبضے میں ہے۔“ وہ  
بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ”..... اور..... میں جب چاہوں اسے برآمد  
کر کے ایک بار پھر اپنی شتو گنڈی بنا سکتا ہوں.....“

”وہ کن لوگوں کے قبضے میں ہے.....؟ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔  
”..... وہ چودھری نیاز، چودھری پرویز کے روزانہ انسانیت سوز تشدد کو سہہ رہی  
ہے اور اب میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اسے ان دونوں بھائیوں کے ہوس ناک  
چنگل سے چھڑاؤں گا..... پھر اسے اپنے تابع بنالوں گا۔“ جگدوش نے فاتحانہ انداز میں  
کہا اور میرا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ اب میرا شک یقین کامل میں بدل چکا تھا کہ بے  
چاری رانی انہی دونوں چودھری بھائیوں کے قبضے میں ہے اور روزانہ اس کی بربریت اور  
ہوس کا نشانہ بنتی تھی۔ یہ سن کر میرا دل و دماغ طیش ناک آندھیوں کی زد میں آ گیا۔  
تاہم میں نے اپنی جلتی سگتی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے جگدوش سے پوچھا۔

”..... رانی کو ان دونوں خبیث بھائیوں نے کدھر قید کر رکھا ہے.....؟“  
”دھیرج بالکے..... دھیرج..... تو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا..... وہ بولا۔

”دیکھو اگر تو مجھ سے ایک سودا کر لے تو رانی کو زندہ سلامت میں تیرے  
سامنے پیش کر دوں گا اور ان دونوں چودھری بھائیوں کو بھی ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ ساری  
زندگی وہ تجھ سے پناہ مانگتے پھریں گے.....“

”کیا سودا..... بتا مجھے.....؟ میں نے اسے گھور کر پوچھا۔

کا خیال آتے ہی میں سیدھا مرادے کے گھر کی طرف ہولیا۔

شام ہونے والی تھی۔ دور افتادہ دیہاتوں میں ویسے ہی سرشام ہی رات کا  
گمان ہونے لگتا تھا۔ اس وقت بھی شام گویا رات کی وحشت ناک تاریکی میں بدلنے  
لگی۔ میرا ذہن چوہری برادران کے اس نئے اور خوف ناک تنازعے میں الجھا ہوا تھا۔  
وہ اب پہلے سے بھی زیادہ میری جان کے دشمن بن چکے تھے..... رانی کے پراسرار غیاب  
کی الگ مجھے فکر سنا رہی تھی۔ میں نیم اجالا نما تاریکی میں بڑھا چلا جا رہا تھا کہ اچانک  
میں ٹھٹھک کر رکھا..... میرے عین سامنے چند قدموں کے فاصلے پر ایک ریچھ نما درندہ کھڑا  
تھا۔ یہ جگدوش تھا..... یارا بلیس..... جگدوش، جو مجھے اپنی اکلوتی آنکھ سے گھورے جا رہا  
تھا..... میرا دل تیزی سے دھڑدھڑانے لگا۔

☆.....☆.....☆

میں اب اس کی دہشت میں آنے والا کب تھا۔ البتہ اسے یہاں دیکھ کر مجھے  
تشویش ضرور ہونے لگی تھی۔ وہ چند قدم میری طرف بڑھا۔ میں محتاط ہو کر کھڑا ہو گیا۔  
میری رگوں میں خون سنسنانے لگا میں نے اپنی نظریں اس کے یک چشم چہرے پر مرکوز  
کر رکھی تھیں۔

”مورکھ! اب بھی سے ہے..... میرے راستے سے ہٹ جا..... ورنہ میں تجھے  
رسا کر کے رکھ دوں گا۔“

وہ غرا کر بڑے کینہ توڑ لہجے میں مجھ سے بولا۔

”میں اب تمہاری اس پرانی اور بے کار کی گیدڑ بھیکوں میں آنے والا نہیں  
ہوں شیطان.....“ میں نے نڈر ہو کر مستحکم لہجے میں اسے لکارتے ہوئے کہا۔

”عنقریب تو میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے ہی والا ہے۔“

”ہا..... ہا..... ہا.....“ وہ طاغوتی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”..... تیرا یہ خواب کبھی پورا نہ ہوگا۔ میں اب تجھ سے دوسری قسم کی لڑائی

لڑوں گا کہ تیرے اپنے لوگ تیرا جینا دو بھر کر دیں گے..... کیونکہ میں نے ایک ایسے  
انسان کی روح کو قابو میں کر لیا ہے..... جو تیرے خون کی پیاسی ہو رہی ہے“ میں اس  
خبیث شیطان کی بات پر پریشان سا ہو گیا۔

ہلاک کر سکتی ہے..... میں اب ذرا مطمئن سا ہونے لگا۔ مگر رانی والی بات نے مجھے اداس کر ڈالا تھا۔ وہ بے چاری اپنی نادانی کے باعث ان دونوں چودھری برادران کے ہاتھوں مسلسل کھلونائی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً یہ سوچ کر دل میں تہیہ کیا تھا..... اس سے پہلے..... جگدوش اسے کھلونا بنا کر میرے خلاف اپنا تابع بنا ڈالے مجھے..... فوراً..... رانی کو چودھری برادران کے ہوس ناک چنگل سے چھڑالینا چاہئے تھا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اپنی جان جاناں سوئی سے ملنے کا قصد کیا۔ میں اسے جگدوش سے باخبر کر دینا چاہتا تھا کہ وہ خبیث یہاں بھی آچکا تھا۔ میں اس کے گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ دونوں باپ بیٹی جاگ رہے تھے۔ میں نے انہیں جگدوش سے خبردار کرتے ہوئے تاکید کی کہ..... وہ گھر سے باہر نہ نکلے اور تاہی اس کا باپ مراد اسے گھر پر اکیلا چھوڑے۔ میں نے انہیں ایک یہ بھی خاص ہدایت کی کہ..... جگدوش آگ سے ڈرتا ہے..... لہذا اسے دور رکھنے کیلئے گھر میں ہر وقت..... کونکوں کی انگلیٹھی یا آگ کی دو تین مشعلوں کو جلتے رہنا اشد ضروری تھا۔ اس کا باپ بے چارہ پریشان ہو گیا تھا۔ اپنی بیٹی کو دوبارہ زندہ حالت میں دیکھ کر اسے جو راحت ملی تھی..... وہ کافور ہونے لگی..... میری تاکید کے مطابق اس نے ابھی تک گاؤں میں یہ بات مشہور نہیں کی تھی..... کہ..... سوئی دوبارہ گھر آچکی ہے۔ ورنہ گاؤں کے لوگ سوئی کو زندہ دیکھ کر پھر مشتعل ہو جاتے اور اسے بھی شیطانی روح سمجھتے..... کیونکہ..... انہوں نے اپنے سامنے سوئی کو مردہ حالت میں دفن ہوتے دیکھا تھا۔ میں پہلے ہی گاؤں والوں کی مخالفت بھگت رہا تھا اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ..... یہ دونوں غریب باپ بیٹی بھی گاؤں والوں کا عتاب سہتے۔

”پتر شوکت.....! آخر اس موذی جگدوش سے کب جان چھوٹے گی ہماری..... مجھے تو پھر ڈر لگنے لگا ہے کہیں میری سوئی دہی..... پھر مجھ سے نہ بچھڑ جائے۔“ سوئی کا باپ مراد پریشان ہو کر مجھ سے بولا۔ میں اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”.....“ چاچا! تو فکر نہ کر..... بہت جلد میں اس موذی شیطان جگدوش کا خاتمہ کر دوں گا..... بس تم دونوں ہمت نہ ہارنا اور اپنا دل مضبوط کئے رکھنا۔“ میں انہیں تسلی دیکر واپس اپنے گھر چلا آیا۔

”..... تو میرے اور سوئی کے راستے سے ہٹ جا.....“ اس نے کہا اور میں غیظ آلود لہجے میں بولا۔

”ہرگز نہیں..... اگر تو نے سوئی کی طرف دوبارہ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”ہا..... ہا.....“ وہ میری بات پر ایک بے ہنگم قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”بالکے..... تو میرا بال بھی نہیں بیکا کر سکتا تو میرا راستہ تو کھونا کر سکتا ہے..... مگر مجھے فنا کے گھاٹ نہیں اتار سکتا۔“

میں اس کی خوش فہمی دور کرتے ہوئے زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔ ”اے خبیث شیطان.....! تو چیلارام کا حشر بھول گیا۔ جسے ہم نے جلا کر خاکستر کر ڈالا تھا..... میں اچھی طرح تیری موت کا بھی راز جان گیا ہوں..... آگ..... جلتی سلکتی آگ..... یہی تجھے ہلاک کر سکتی ہے..... میری بات پر جگدوش کی ساری اکڑفوں جاتی رہی۔ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات سے اب مجھے بھی اس بات کا پورا یقین ہونے لگا تھا کہ یہ خبیث شیطان بھی آگ ہی کے ذریعے نیست و نابود ہو سکتا تھا، کیونکہ..... جب ٹھاکر دیال سنگھ نے میرے ذریعے چیلارام کے داس..... گوردن کو پکڑا تھا تو..... گوردن نے اپنے گرو گھنٹال چیلارام کے بارے میں یہ راز بتایا تھا کہ..... سوائے آگ کے اس شیطان ساحر کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لہذا پھر بعد میں مجھے بھی یہ ادراک ہوا تھا کہ..... چیلارام کی طرح جگدوش بھی صرف ایک ہی طریقے سے ہلاک ہو سکتا تھا اور یہ..... طریقہ..... آگ تھا۔ کسی طرح اگر میں جگدوش کو بھی چیلارام کی طرح آگ میں جھونک دیتا تو..... یقیناً اس خبیث کا بھی چیلارام کی طرح ہی حشر ہو سکتا تھا۔ مگر..... مجھے..... ایسے موقع کی تلاش تھی۔

”..... تو میرے لئے اب بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے..... بالکے.....! معا جگدوش نے اپنی پیشانی پر لگی اکلوتی خوفناک آنکھ سے گھورتے ہوئے کہا۔ اور تیرا بندوبست بھی اب مجھے ترنت کرنا ہی پڑے گا.....“ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ پہلی بار مجھے مسرت کا احساس ہوا تھا..... جگدوش کی اس خوفزدہ سی دھمکی نے میرے اس یقین کو مزید پختہ کر دیا تھا کہ..... وہ آگ سے ڈرتا تھا اور..... آگ ہی ایسے خبیث ساحر کو

کی حرکت ہو سکتی ہے۔ مجھے گاؤں والوں کی کم عقل اور مرادے کی موت کا اڑھد افسوس ہوا۔ میں جانتا تھا کہ اب میرے لئے اس گاؤں میں جگہ نہیں رہی تھی۔ لہذا اس سے پہلے کہ گاؤں والوں کا وہ مشتعل جھوم ادھر تایا جان کے گھر کا رخ کرتا..... میں منہ چھپائے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی نکل کھڑا ہوا۔ شکر تھا کہ سوئی بھاگ کر زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ وہ سیدھا دوڑتی ہوئی میرے گھر کی طرف ہی آ رہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔

پھر سوئی کو ساتھ لیکر جنگل کی طرف بڑھ گیا۔

نامراد جگدوش کی وجہ سے ایک بار پھر میں اور سوئی راندہ درگاہ ہو گئے تھے..... البتہ مجھے یہ تسلی ضرور تھی کہ..... سوئی جب تک میرے ساتھ تھی..... جگدوش اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اچانک مجھے ایسے کڑے وقت میں چودھری شمش علی خان کا خیال آیا اور میں نے ان کے گاؤں کا رخ کیا۔ میں اور سوئی چھپتے چھپاتے اپنے گاؤں کی حدود سے دور نکل آئے تھے..... اچانک فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری..... میں بری طرح ٹھنک گیا اور سوئی دہشت سے چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اسی وقت ایک کرخت آواز ہماری ٹھنکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”خبردار.....! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا..... ورنہ دونوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔“

میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلقوں میں آن اٹکا۔ سامنے ہی چند قدموں کے فاصلے پر میں نے دونوں چودھری برادران اور ان کے رائفل بدست حواریوں کو دیکھا۔ ان سب نے اپنی منگوں کا رخ ہم دونوں کی طرف کر رکھا تھا۔ میرا دل جیسے سائیں..... سائیں کرتی کنپیوں پر دھڑکنے لگا۔

”لے چلو ان دونوں کو اٹھا کر.....“ چودھری نیاز کی درشت آواز ابھری اور پھر ان کے کارندے ہمیں پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے چلے۔ ذرا دوزان کی چپ کھڑی تھی۔ سوئی کو بے دردی سے دھکیل کر اس میں سوار کر دیا گیا۔ اپنی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو سوئی کی..... کیونکہ یہ دونوں چودھری برادران مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھے

جگدوش نے گاؤں میں نازل ہوتے ہی میرے خلاف محاذ باندھ لیا تھا۔ اس نے میرے حالات پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں اس وقت گاؤں میں دوہرے تہرے حالات کا شکار ہوں..... اور وہ یوں تو اپنے کالے اور پراسرار علوم سے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا مگر دوسرے عام طریقے سے میرے خلاف سازش تیار کر سکتا تھا اور مجھے سب سے زیادہ اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں یہ خبیث..... مکاری سے کام لیتے ہوئے..... گاؤں والوں اور ان دونوں چودھری برادران کو میرے خلاف مزید بھڑکا کر میرے لئے مشکلات کھڑی کر سکتا تھا اور پھر وہی ہوا۔

جگدوش عام آدمی کے بھیس میں گاؤں کے لوگوں میں رل مل گیا پھر اس نے اس افواہ کو مزید ہوا دی کہ..... میں نے اور مرادے نے سوئی کی لاش پر کالا جادو کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دیا اور اب عنقریب میں اور مرادا..... پورے قبرستان کے مردوں کو زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لوگوں نے یہ سنا تو ایک بار پھر اشتعال کی آندھی اٹھ کھڑی ہوئی..... وہ اپنے پرکھوں کی لاشوں کی بے حرمتی ہرگز نہیں چاہتے تھے..... بس پھر کیا تھا سب سے پہلے..... گاؤں والے ایک بڑے جھوم کی صورت میں مرادے کے گھر جا گئے..... انہوں نے جو سوئی کو وہاں پایا تو جگدوش کی بات کی تصدیق ہو گئی..... مرادا گھبرا گیا۔ گاؤں والوں کو کیا جواب دیتا؟ مشتعل جھوم نے سوئی کو زندہ حالت میں دیکھا تو..... مارو..... مارو.....“ کا شور بلند ہو گیا۔ مرادے کا ڈنڈے مار مار کر کچومر نکال دیا گیا۔ سوئی بری طرح دہشت زدہ ہو کر گھر سے بھاگ نکلی..... اور..... یہی جگدوش چاہتا تھا..... مجھے جیسے ہی اس اندوہناک واقعہ کی خبر ہوئی میں سمجھ گیا اس کینے جگدوش

تھے۔

بہر طور..... وہ مجھے لے کر اپنی حویلی میں پہنچے اور ہم دونوں کو ایک زمین دوز قید خانے میں لے آئے۔ یہاں پرانی کے علاوہ جانے کیا کیا بلا نکھرا ہوا تھا۔ ہمیں یہاں قید کر کے چلے گئے۔ یہاں صرف ایک لائین روشن تھی۔ اچانک میری نظر سامنے دیوار کے ایک کونے پر پڑی۔ میں چونک گیا وہاں کوئی مجھے بیٹھا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ کوئی جوان عورت تھی۔ جس کے ٹھوڑی سے بال چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ ”شش..... شوکت.....! یہ کون ہے.....؟ میں نے تہہ خانے کے سبز زدہ دم بخود ماحول میں سوئی کی لرزاں آواز ابھری۔ میں نے اسے آپ سے لگاتے ہوئے تسلی دی اور پھر اس سے علیحدہ ہو کر اس الم نصیب عورت کی طرف بڑھا وہ دیوار زندان سے پشت نکائے اپنا کھجڑی سے بالوں بھرا چہرہ گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔ پھر جیسے آہٹ پاتے ہی اس نے اپنا سر اٹھایا تو تب تک میں بھی اس کے ذرا قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر مجھے پہچانتے ہی ایک زوردار ہڈیانی چیخ ماری۔

”شوکت.....“ میں بھی اسے دیکھ کر بہ مشکل ہی پہچان پایا۔

وہ رانی تھی۔ اجڑی بجزی رانی..... کسی کنڈر کی طرح اس کے ویران چہرے سے آسبی پر چھائیاں مترشح تھیں۔ ”رانی.....! تو..... یہاں.....؟“ میرے لب متحرک ہوئے۔

وہ یکدم لرزتے قدموں سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہسٹریائی جنون کے ساتھ گویا مجھ سے شکوہ کناں ہوتے ہوئے بولی۔..... دیکھ شوکے.....! تو نے مجھے کس حال تک پہنچا دیا..... اب تو تیرے کلیجے کو خنڈک مل گئی ہوگی ناں.....“

”یہ تو کیا کہہ رہی ہے رانی؟..... میں تو خود تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں.....! میں نے بڑے رمان کے ساتھ کہا۔ پھر مجھے اس کی قابل رحم ہیئت کڈائی پر بڑا ترس آیا۔ وہ شکستہ لہجے میں بولی..... ان خبیث چودھریوں نے مجھے روزانہ اپنی درندگی کا نشانہ بنایا اور اب تو..... اب تو..... ان کے کارندے بھی مجھے.....“ وہ اتنا بتا کر رو ہانسی ہو گئی۔ مارے رقت کے وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کر سکی اور بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں

سے چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں دھیرے سے اس کے قریب گیا میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور ان دونوں چودھری برادران کی درندگی پر میرا خون رگوں میں مثل لاوا کھولنے لگا۔ میں نے دھیرے رانی کو چھوا اور ملائمت آمیزی سے بولا۔

”رانی..... تیرے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا مجھے بے حد افسوس ہے..... تو فکر نہ کر..... اللہ ہمیں اس مشکل سے ضرور نکالے گا۔“

”شوکے..... اللہ کے واسطے..... مجھے اس جہنم سے نکال دے..... بہت ظلم ہوتا ہے مجھ پر یہاں.....“ اس کے لہجے کی یاسیت اور درد انگیز فریاد پر میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ میں نے پھر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”..... رانی.....! تو ذرا حوصلہ کر..... میں انشاء اللہ..... تجھے ضرور یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔“ اس نے ایک چونکتی ہوئی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی پھر ذرا پرے کھڑی سوئی کو دیکھ کر مجھ سے بولی۔

”..... یہ کون ہے.....؟ میں ذرا خاموشی کے بعد بولا..... یہ سوہنی ہے۔“

”کک..... کیا..... جگدوش مر گیا.....؟“ وہ عجیب چونکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ اسے معلوم تھا کہ..... سوئی کون تھی..... اور کس کے قبضے میں تھی، تاہم میں نے اس کے چہرے کے یکدم بدلتے ہوئے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ..... وہ سوئی کو میرے ساتھ دیکھ کر ذرا بھی خوش نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ..... میں دراصل سوئی سے ہی اصل محبت کرتا تھا اور نیز میں نے سوئی کو جگدوش کی قید سے چھڑوانے کا کس قدر مصمم عزم کر رکھا تھا، یہی سبب تھا کہ سوئی کو زندہ سلامت میرے ساتھ دیکھ کر وہ حسد میں مبتلا ہونے لگی تھی۔ ”..... نہیں..... ابھی وہ خبیث شیطان جگدوش زندہ ہے۔“

میں نے ہولے سے جوابا کہا تو وہ یکدم ہسٹریائی انداز میں ناگن کی طرح پھینکارتی ہوئی سوئی کی طرف لپکی اوز میں جب تک اسے سنبھالتا وہ سوئی کو دبوچ چکی تھی۔ رکا میں بھی نہیں تھا۔

”تو نے..... میرا شوکا چھین لیا..... تیری وجہ سے میں آج در بدر ہوئی۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

وہ ہڈیائی انداز میں چیختی ہوئی سوئی کو نوچنے گھسٹنے لگی۔ سوئی بے چاری

بھی زمین پر گر کر مایہ بے آب کی طرح تڑپنے لگی..... پھر میں نے دیکھا جگدوش اس پر زیر لب کوئی منتر پڑھ کر پھونکنے لگا۔ تب پھر آنا فانا رانی کا زخمی اور خون آلود وجود غائب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی جگدوش کا خوفناک بھاری بھر کم وجود بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تہہ خانے کے محدود ماحول میں ایک بارگی اعصاب شکن سناٹا چھا گیا۔ سوئی ہنوز میرے ساتھ چکی کھڑی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور خود گم صم سا کھڑا تھا..... ذرا دیر گزری تو میں نے سامنے ایک شبیہ ابھرتے دیکھی..... میں چونک گیا۔ وہ رانی کی شبیہ تھی جواب رفتہ رفتہ اس کے پورے وجود میں ڈھلنے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد رانی مجسم میرے سامنے کھڑی تھی۔ اب اس کے چہرے سے تکلیف و آرام اور الم نصیبی کی بجائے..... گہری طمانیت بھری پر چھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں انتقام و جنون خیزی کی آگ روشن تھی۔ جس سے اس کا وجود بدلا بدلا سا محسوس ہونے لگا۔ اچانک دروازے پر آہٹ ابھری..... ہم چونک گئے۔ تہہ خانے کے دروازے سے وہ دونوں چودھری برادران اندر داخل ہوئے..... ان کے ہمراہ..... چار نیم شخم مسلح کارندے بھی تھے۔ رانی ان کو دیکھ کر سلگ اٹھی اور غراہٹ آمیز چیخ کے ساتھ چودھری نیاز اور چودھری پرویز پر جھپٹی..... اس لمحے ان کے چاروں کارندوں نے رانی کو دبوچ لیا۔ رانی تو پہلے ہی ان پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا..... رانی نے ایک کارندے کی گردن پر دانت گاڑ دیئے وہ حلق کے بل لرزہ خیز انداز میں چیخا..... باقی تینوں نے رانی پر بندوقیں تان لیں۔ رانی نے شعلہ برساتی نظروں سے انہیں گھورا اور..... باری باری اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کی گردنیں دبوچ لیں۔ انہوں نے بندوق کی لیبی دبا دی۔ تہہ خانے کے محدود ماحول میں کان پھاڑ دھماکے ابھرے اور بارود کی بو پھیل گئی۔ مگر رانی اپنی جگہ صحیح سلامت کھڑی تھی۔ وہ لوگ اسے زندہ دیکھ کر بھونچکے سے رہ گئے۔ رانی نے دونوں کارندوں کی گردنیں دبوچ کر انہیں بے پناہ قوت کے ساتھ تہہ خانے کی دیوار سے دے مارا۔ ان کے حلق سے بھیا نک چیخ ابھری۔ چوتھے کا بھی رانی نے یہی حشر کیا ادھر دونوں چودھری برادران سمجھ بیٹھے کہ رانی پر جن

حیران پریشان اپنا دفاع کرنے لگی، اتنے میں، میں بھی اس کے قریب جا پہنچا اور رانی کو بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے الگ کیا اور غصے سے بولا۔ ”رانی.....! یہ کیا حرکت ہے.....؟ کیا تو پاگل ہو گئی ہے.....“

”ہاں..... ہاں..... میں پاگل ہو گئی ہوں۔ وہ جنونا نہ انداز میں بولی۔  
”یاد رکھو شکے.....! میں آج تم دونوں کی وجہ سے بے عزت ہوئی ہوں.....  
میں تم دونوں کو بھی چین سے نہیں رہنے دوں گی.....“ پھر وہ ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی۔

”جگدوش..... عظیم جگدوش..... آ..... میری مدد کر.....“ وہ جگدوش کو پکارنے لگی تو میں نے اس پر لعنت بھیجی۔ اچانک دیوار پر ایک بھیا نک سایہ ابھرا..... اور رچھ نما ایک ہیولا اچھل کر تہہ خانے میں آ گیا۔  
یہ جگدوش تھا۔ جسے دیکھ کر سوئی کے حلق سے بے اختیار خوفزدہ سی چیخ نکل گئی اور وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ جگدوش کو دیکھ کر رانی کے جنونا نہ چہرے پر خوشی کے آثار اُٹ آئے۔

”جگدوش.....! تو نے مجھے پراسرار طاقتوں سے نوازنے کا وعدہ کیا تھا تاکہ میں اپنے محبوب دشمن سے انتقام لوں..... اب وہ وقت آ گیا ہے..... مجھے اس نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اپنا وعدہ پورا کر..... جگدوش۔“

جگدوش نے اس کی طرف ایک لمبے پھل والا چہرا پھینکا اور اس سے بولا۔  
”..... تو چھٹا نا کر میری داسی.....“ مجھے اپنا وجہ یاد ہے..... اٹھا یہ چہرا اور اپنی گردن پر پھیر لے..... پھر میں تجھے پیاسی آتما کی صورت میں ٹھکتی دوں گا۔“ جگدوش کے حکم دینے کی دیر تھی کہ..... رانی نے فوراً اس کی تعمیل کی اور چہرا اٹھالیا۔ میں اپنی جگہ ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے رانی نے جگدوش کا پھینکا ہوا چہرا اٹھا کر اپنی گردن پر پھیر لیا۔ سوئی کے حلق سے مارے دہشت کے چیخ بلند ہو گئی اور ادھر میں بھی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ رانی کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز ابھری۔ بس اس کی گردن سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ چہرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور پھر وہ خود

چڑھ چکا ہے۔ وہ دونوں بھاگے..... تو رانی نے ایک کوراہے میں ہی چھاپ لیا۔ وہ چودھری نیاز تھا۔ رانی اپنی خون آلود باجیس پھیلائے مکروہ اور منتقم ہنسی کے ساتھ اس سے بولی۔

”کیوں چودھری.....! تو نے میری عزت خراب کی ہے..... اب اس کا حساب بھی دے۔“

”مم..... مم..... مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو۔“ چودھری نیاز دہشت سے کپکپا کر بولا۔

”..... ہاں..... تجھے معاف کر دوں گی..... مگر..... تیرا خون پینے کے بعد.....“

”رانی نے انگارہ برساتی آنکھوں سے اسے گھور کر کہا اور پھر اس کی خون چکاتی باجھوں سے خوفناک نوکیلے دانت جھانکنے لگے..... اور پھر وہی دانت اس نے چودھری نیاز کی گردن پر گاڑ دیئے..... اس کے طلق سے بھیانک چیخ خارج ہو گئی..... اور وہ..... نیچے گر گیا۔ رانی جھک کر اس کا خون چوسنے لگی۔ سوئی اور میں دم بخود کھڑے یہ لرزہ خیز منظر دیکھ رہے تھے۔ اس بد بخت مردود جگدوش نے رانی کو اپنی شیطانی طاقتوں سے خون آشام ڈائن بنا ڈالا تھا۔ مجھے خود بھی اب رانی سے شدید خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے سوئی کا ہاتھ پکڑا..... دروازے کی طرف دوڑا..... میرے عقب سے رانی کی خوفناک چیخ ابھری تھی..... مگر میں نے جلدی سے باہر نکل کر تہہ خانے کا دروازہ بند کر دیا۔ پوری حویلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ چودھری پرویز کے کارندوں نے ہمیں پھر دبوچ لیا..... چودھری پرویز بھی وہیں کھڑا روئے جا رہا تھا۔ اسے شاید اپنے بڑے بھائی چودھری نیاز کے بھیانک انجام کے بارے میں لرزہ خیز اندازہ ہو چکا تھا۔ میں نے چودھری پرویز سے کہا۔

”چودھری جی! میں نے تہہ خانے کا دروازہ بند کر دیا ہے..... اسے اب مت کھولنا..... رانی ایک خون آشام ڈائن بن چکی ہے..... ورنہ وہ ہم سب کو مار ڈالے گی۔“

”اوئے..... یہ رانی ایک دم ڈائن کیسے بن گئی.....؟“ چودھری پرویز نے خود

پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو جیسے مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع مل گیا ہو میں جلدی سے بولا۔

”..... چودھری جی.....! آپ تو میری بات کا یقین ہی کب کرتے ہیں جو میں آپ کو ساری بات بتاتا..... اب بھی وقت ہے..... چودھری جی.....! میری بات پر بھروسہ کریں..... ورنہ ہم سب اس شیطان جگدوش کی کارستانوں کی بھینٹ چڑھ جائیں گے.....“ میری بات پر پہلی بار اکڑ مزاج چودھری پرویز کے چہرے پر پرسوج تاثرات ابھرے اور..... وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”..... تو پھر بتا مجھے یہ سارا کیا چکر ہے..... یہ جگدوش شیطان کون ہے.....؟“

جوابا میں نے صراحت بتانی شروع کی۔

”..... چودھری جی.....! یہ جگدوش ایک بہت بڑا شیطانی ساحر ہے..... اور میں نے اسے نابود کر ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے..... کیونکہ اس کی وجہ سے میں اب تک مصیبتوں کا شکار رہا ہوں..... اس نے سب سے پہلے..... رانی کے ذریعے آپ کے والد وڈے چودھری عالم خان کا قتل کروایا پھر اب آپ کے وڈے بھرا..... چودھری نیاز کو بھی بیدردی سے ختم کر ڈالا..... رانی اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اس کی داسی بن چکی تھی اور اب تو اس نے جگدوش کے کہنے پر خود ہی اپنی جان کا خاتمہ بھی کر ڈالا تھا کیونکہ جگدوش نے میرے سامنے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اگر اپنے ہاتھوں سے اپنی جان کا خاتمہ کر ڈالے تو..... وہ اس کی روح کو قابو کر لے گا اور اسے پراسرار طاغوتی طاقتوں سے مالا مال کر دے گا۔ درحقیقت رانی مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی..... مگر میں سوئی سے پیار کرتا تھا جسے مردود ملعون جگدوش نے اپنی قید میں کر رکھا تھا تا کہ ایک خاص وقت پر اس پر کالا منتر کر کے خود کو ناقابل تسخیر قوتوں کا مالک بنا ڈالے..... مگر میں نے اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر اللہ کے حکم کی طاقت سے اس کا یہ شیطانی منصوبہ ادھورا کر ڈالا ہے..... اب وہ رانی پر اپنا کالا علم کر کے اسے میرے پیچھے لگا چکا ہے..... مگر اب وہ آپ کیلئے بھی خطرناک بن چکی ہے اور آپ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی ہے.....



یہی ہے کہ اس حرام زادی ڈائن کو..... تہہ خانے کے اندر ہی قید میں رکھا جائے..... خود ہی وہ..... مرجائے گی..... تو اک بات بتا؟ وہ آخر میں بولا تو میں نے فوراً کہا۔  
”جی..... بولیں۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ..... تو کسی طرح..... اس بڑے شیطان..... جگدوش کو فنا کر ڈال..... اس طرح اس کی چیلی یہ ڈائن (رانی) بھی تو یوں آپ مرجائے گی۔“  
”ہاں..... اس طرح یہ ممکن تو ہو سکتا ہے..... مگر چودھری صاحب.....! اس شیطان جگدوش کو ہلاک کرنے میں مجھے جانے ابھی کتنا وقت اور لگے..... ایسا نہ ہو کہ اس کے فنا ہونے سے پہلے..... وہ ڈائن ہی تہہ خانے سے آزاد ہو جائے.....؟“ میں نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے اس سے کہا۔ تو وہ جلدی سے پرامید ہو کر بولا۔  
”نہیں..... ایسا میں بھیجے ہونے دوں گا..... تم بے فکر رہو..... میں آج ہی اپنے کارندوں کو ہدایت دیکر تہہ خانے کے دروازے پر پہرے پر بٹھا دوں گا۔“ اس کی بات سن کر میں الجھن آمیز سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

مجھے اب جگدوش سے زیادہ..... رانی کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا.....؟“ اور میں پہلے یہی چاہتا تھا کہ..... جگدوش سے پہلے پہل کسی طرح رانی کا خاتمہ ہو جائے..... کیونکہ خدشہ تھا کہ..... اگر ایک بار رانی جواب ایک خوفناک اور خون آشام چڑیل بن چکی تھی، وہ تہہ خانے سے باہر نکل آئی تو چودھری پرویز تو اپنی جان سے جاتا ہی..... میری اور سوتنی کی جانوں کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا.....“  
”کیا سوچنے لگے اب تم.....“ مجھے پرسوج خاموشی میں پا کر معا چودھری پرویز نے پوچھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا.....؟ میں خود گولگو میں مبتلا تھا۔

”چودھری صاحب! اگر آپ اس ڈائن کو قید میں ہی رکھنا چاہتے ہیں تو یہی سب سے بہتر ہے..... جگدوش جیسے ہی مجھ سے بھڑنے کی کوشش کرے گا..... میں اس سے مقابلہ کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”..... ہوں..... تم اب کدھر جاؤ گے.....؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ تو جانے کیوں مجھے اپنے وجود میں سرسراہٹ سی اترتی محسوس ہونے لگی۔ میں

اس لئے اس نے آپ کے کارندوں اور چودھری نیاز کا بیدردی سے خون کر ڈالا..... اس کی وجہ سے آپ کو اور میرے گاؤں والوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ..... میں خود ایک کالے منتروں کا پجاری ہوں..... اور آپ سب لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے..... اور یہی وہ مردود جگدوش چاہتا ہے..... تاکہ..... وہ آپ لوگوں کے دل میں میرے خلاف غلط فہمی بھڑکھڑائے اپنے راستے سے ہٹا سکے..... جبکہ یہ بات صرف میں ہی جانتا ہوں کہ جگدوش کس طرح ہلاک ہو سکتا ہے۔“

یہ سب بتاتے ہوئے میں نے چودھری پرویز کو سرحد پار کی ریاست کے ٹھاکر دیال سنگھ اور چیلارام کے بارے میں بھی بتایا۔ میری باتیں سن کر چودھری پرویز کے چہرے سے ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ..... شاید اب اسے عقل آ جائے..... وہ چند ٹاپے پریشانی اور خاموشی کے بعد جھلا کر بولا.....  
”اب مجھے یہ بتا کہ..... اس ڈائن (رانی) سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے.....؟“  
”..... چودھری صاحب.....! وہ اب میرے علاوہ سوتنی اور آپ کی بھی جان کی دشمن بن چکی ہے.....“ میں نے کہا۔

”..... اور..... اسے ہلاک کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ کسی طرح تہہ خانے میں آگ لگادی جائے..... کیونکہ یہ شیطانی لوگ..... آگ کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔“

”تہہ خانے میں آگ لگادیں.....؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے..... اس طرح ہماری پوری حویلی جل کر خاکستر ہو جائے گی۔“ چودھری پرویز..... پریشان کن تشویش سے بولا، تو میں نے کہا۔

”چودھری صاحب.....! اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے..... ہمیں یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا..... ورنہ..... ایک بار اگر وہ خون آشام ڈائن (رانی) تہہ خانے سے آزاد ہو گئی تو..... پھر وہ ہم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔“ میں نے آخر میں اسے ڈراتے ہوئے کہا۔ تو وہ ذرا دیر کی تفکیر آمیز خاموشی کے بعد حتیٰ لہجے میں نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہرگز نہیں.....“ میں ایسا نہیں کر سکتا..... اس کا طریقہ

اس کا گھرو بیٹا..... خاور علی خان..... اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ..... چودھری پرویز کی حویلی پر ہلہ بولنے کی تیاری کر رہے تھے..... میں پریشان ہو گیا۔ اور جلدی جلدی چودھری حشمت علی خان کو ساری کھانا ڈالی کہ..... چودھری پرویز کے دل سے اب غلط فہمی دور ہو چکی ہے۔ نیز انہیں رانی کے ڈائن بننے اور چودھری پرویز کے بڑے بھائی چودھری نیاز کی ہلاکت کے بارے میں بھی بتا دیا۔ میری بات سن کر..... چودھری حشمت علی خان کے چہرے کی سرخی معمول پر آنے لگی..... مگر اس کے بیٹے خاور کا طیش پھر بھی کم نہ ہوا اور وہ..... اپنے باپ سے بولا۔

”..... ابا جی.....! کچھ بھی ہو..... چودھری پرویز کو سبق سکھانا ضروری ہے..... اس نے آپ پر بلا وجہ قاتلانہ حملہ کرنے کی جرات کیسے کی..... اس نے ہماری غیرت کو لاکارا ہے۔“ میں اس کے خطرناک عزائم جان کر پریشان ہو گیا..... البتہ اس کا باپ اسے سمجھاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

”اوئے..... خاور پتر! اب مٹی ڈالو..... اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے.....“

”نہیں ابا جی.....! یہ کیا بات ہوئی.....؟ اگر اس کی غلطی سے آپ کو خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو.....؟“ خاور کا غصہ کسی طور پر بھی کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

”..... اوئے پتر.....! زندگی اور حیاتی سوہنے رب دے تھ ہے..... کسی انسان کی طاقت نہیں..... بس اب بھول جا.....“ باپ کے سمجھانے پر میں نے دیکھا ان کا بیٹا خاموش تو ہو گیا تھا..... مگر..... اس کا اندرونی ابال کسی طور بھی کم نہ ہوا تھا۔ میں اندر سے ڈرنے لگا..... کہیں اگر..... یہ لوگ آپس میں لڑ پڑے تو..... جگدوش کو اپنی چال چلنے کا موقع مل جائے گا اور کوئی بعید نہیں..... کہ اس خون خرابے اور جنگ وجدال میں..... کوئی ایسا بھیا تک واقعہ بھی ظہور پذیر ہو جاتا..... جو پورے علاقے کو سیاہ آندھی میں لپیٹ دیتا۔ میں نے جب خاور کو ڈرانے کی غرض سے چودھری حشمت علی خان کو رانی کے ڈائن بننے اور شیطان جگدوش کے بارے میں بتایا تو خاور کو میری بات کا ذرا برابر بھی یقین نہ آیا۔ وہ مجھے غصیلی نظروں سے گھورتا ہوا پاؤں شیخ کر چلا گیا۔ میں نے

اپنے گھر جاؤں گا“ میں نے کہا.....“

”مگر..... ہم نے تو سنا ہے..... وہاں تمہارے گاؤں کے لوگ تم دونوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں.....؟“ وہ ایک نظر سوئی کے چہرے پر ڈالتے ہوئے مجھ سے بولا۔ اس کی بات درست تھی۔ گاؤں والوں نے سوئی کے باپ مرادے کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ میرے لئے اب اپنے گاؤں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ یوں تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ..... یہاں سے سیدھا چودھری حشمت علی خان کی حویلی میں ہی جاؤں گا..... مگر یہ بات میں چودھری پرویز کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں پھر میری طرف سے دوبارہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا۔ کیا پتہ چودھری پرویز ابھی تک چودھری حشمت علی خان کو اپنا دشمن سمجھ رہا ہو..... اگرچہ..... میں نے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہر طور..... میں نے پھسکی مسکراہٹ سے کہا..... ”اللہ کی زمین بڑی ہے..... کہیں تو پناہ مل ہی جائے گی ہم دونوں کو۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ایک نظر اپنے ساتھ کھڑی سوئی کی طرف دیکھا تھا۔ ”..... تم..... کہیں چودھری حشمت علی خان کے ہاں تو نہیں جا رہے۔“ معا چودھری پرویز نے میری طرف بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تو میں ایک لمحے چونک سا گیا پھر صاف گوئی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

”ہو..... نہیں۔ میرے سر کی اثباتی جنبش پر ایک سرسراتی ہوئی ہمکاری بھری پھر بولا۔

”ٹھیک ہے..... مگر چودھری حشمت علی خان کو میرا ایک پیغام دے دینا کہ..... ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی..... ہو سکے تو ہمیں وہ معاف کر دے.....“ میں اس کی بات پر یک دم خوشی سے بولا۔

”ج..... چودھری صاحب.....!“

”ہاں..... بالکل ج..... اب تم جاؤ۔“ چودھری پرویز نے اسرار بھری مسکراہٹ سے کہا اور پھر میں سوئی کو لیکر..... خوش خوشی..... چودھری حشمت علی خان کی حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں پہنچا تو..... حویلی کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ چودھری حشمت علی خان اور

اچانک ایک روز مجھے روح فرسا اطلاع ملی..... چودھری پرویز کی حویلی میں چند نامعلوم مسلح افراد نے حملہ کر دیا یہ حملہ اس کی حویلی کے تہہ خانے پر متعین..... اس کے محافظوں پر کیا گیا تھا..... ان نامعلوم حملہ آوروں نے بعد میں تہہ خانے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ رانی جواب جگدوش کے کالے منتر کی وجہ سے ایک خون آشام ڈائن بن چکی تھی۔ آزاد ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے اپنی عزت کے لیرے چودھری پرویز پر حملہ کیا اور اسے ہلاک کر ڈالا۔ چودھری پرویز کے کالے کرتوتوں کا یہی انجام ہوتا تھا..... مگر..... اب مجھے خود سے زیادہ سوہنی کی طرف سے تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ کیونکہ وہ سراپا انتقام بنی ہوئی تھی۔ سوہنی کو اپنی محبت کا قاتل سمجھے ہوئے تھی۔

مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ..... آخر یہ کس کی حرکت تھی.....؟ اچانک میرے ذہن میں..... چودھری شمت علی خان کے بیٹے..... خاور کا نام ابھرا میں پہلے ہی یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ..... چودھری پرویز کی حویلی کے تہہ خانے کے محافظوں پر حملہ اور بعد میں تہہ خانے کا دروازہ کھول کر رانی کو آزاد کرنے کی یہ حرکت دانستہ..... پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کا ہی نتیجہ تھی۔ اور یہ لرزہ خیز حقیقت خاور ہی اچھی طرح جانتا تھا کہ..... رانی..... چودھری پرویز کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ یقیناً یہ حملہ اس نے ہی..... اس مقصد کیلئے کروایا ہوگا..... تاکہ رانی آزاد ہوتے ہی..... سب سے پہلے..... چودھری پرویز کا خون کر ڈالے۔ اگر ایسا تھا تو خاور نے انتقام میں اندھا ہو کر ایک بہت بڑی اور سنگین غلطی کی تھی۔ جس کا خمیازہ اب ہمارے علاوہ جانے کس کس کو بھگتنا پڑتا۔ بہر طور..... اب مجھے پہلے سے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت تھی۔ یوں کہ میں نے ذریعہ معاش کیلئے..... چودھری شمت علی خان کی زمینوں پر ٹریکٹر چلانے کی نوکری حاصل کر لی تھی۔ مگر اب..... رانی کے آزاد ہوتے ہی مجھے یہ نوکری کرنا بھی مشکل ہی نظر آرہی تھی۔

میں اور سوہنی اب دوہرے تہرے خطرات کا شکار ہونے لگے تھے۔ ایک خطرہ ہمیں جگدوش کی طرف سے تھا، دوسرا..... رانی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ..... میری زندگی اب ایک بار پھر متلاطم خیز طوفانوں کی زد میں آنے والی تھی۔ مگر میں نے کب

چودھری شمت سے درخواست کی کہ..... ہمیں اپنے گاؤں میں پناہ دے..... کیونکہ میرے گاؤں والے میری اور سوہنی کی جان کے دشمن بن چکے ہیں۔ چودھری شمت علی خان نے یہاں میری پوری مدد کی۔ پھر..... اس نے وہیں اپنی حویلی کے قریب میں اپنے ایک مزارع خوشی محمد کے گھر میں رہنے کو کہا اور مجھے اپنے بوڑھے تایا اور تائی کو بھی وہیں فروکش ہونے کا کہا۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سمایا، مگر چونکہ ابھی میرا اپنے گاؤں جانا خطرے سے خالی نہ تھا اس لئے..... اس بھلے مانس انسان نے میری یہ مشکل بھی حل کر ڈالی..... اپنے چند آدمی بھیج کر..... تایا اور تائی کو یہاں بلالانے کا حکم صادر کر دیا۔

خوشی محمد ایک بوڑھا شخص تھا اور..... چودھری شمت علی خان کا پرانا خدمت گزار بھی تھا۔ اس کی بیوی مرچکی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا جو شادی کے بعد شہر جا بسا تھا اور لوٹ کر بوڑھے باپ کی خبر تک نہ لی تھی۔

..... اس کا گھر..... کچا..... مگر کشادہ صحن والا تھا۔ اس میں دو بڑے کمرے اور ایک چھوٹا استور نما کمرہ تھا۔

خوشی محمد کو چودھری شمت علی خان نے اپنی حویلی میں ہی ملازموں والے کمرے میں رکھ لیا تھا۔

تایا، تائی آچکے تھے۔ میں نے انہیں دل بہ جبر کے رانی کے متعلق محض اتنا ہی بتایا کہ..... وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ تایا تائی بے چارے پہلے ہی صدمے سے ٹڑھال تھے۔ یہ خبر سن کر..... وہ مزید بے حال ہو گئے..... میں نے اور سوہنی نے انہیں یہ مشکل سنبھالا..... مگر دونوں ہی اب زندہ لاش کی مثل ہو گئے تھے۔“

ادھر میرا اور سوہنی کا ایک چھت تلے رہنا معیوب ثابت ہو رہا تھا..... مگر وہ کہاں جاتی۔ اس کا دنیا میں اب اللہ کے سوا اور کوئی نہ رہا تھا۔ چودھری شمت نے ہمیں فوراً شادی کا مشورہ دیا اور یوں یہ کام بھی بخوبی انجام پذیر ہوا۔

سوہنی، اب محبوبہ کے بعد میری بیوی بن چکی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے مگر اب بھی ہماری خوشیوں کو جیسے کہن لگا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ..... جگدوش کا خطرہ اب بھی اس کے سر پر نگئی تلواری کی طرح لٹک رہا تھا۔

ہے..... وہ رانی کے بھینس میں یہاں آگئی ہے۔ اسے اس مردود شیطان جگدوش نے چڑیل بنا ڈالا ہے۔ میں نے تائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ادھر مکار رانی جو اس وقت اپنا ڈانٹوں والا بھیا نک روپ بدلے..... انسانوں والے روپ میں تھی یک دم زار و قطار رونے لگی۔ تائی اور تایا بے چارے پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اسے پھر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور تایا مجھ سے منت کرتے ہوئے بولے۔

”پتر شو کے! یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ رانی کا تجھ سے آخر کون سا خدا واسطے کا بیر ہے..... جو تو اس کی جان ک دشمن بنا ہوا ہے..... اگر تو ہم سے خوش نہیں ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں..... تایا کی بات سن کر میں تڑپ کر بولا۔

”نن..... نہیں..... نہیں..... تایا آپ.....! یہ بات نہیں..... ہے میں تو.....“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ انہیں سمجھانا بے سود تھا..... ان کی عقلوں پر پردے پڑ چکے تھے..... رانی جیسی بھیا نک اور انتقام کی ماری۔ ڈانٹ کا اصلی روپ ابھی انہوں نے نہیں دیکھا تھا اور میں انہیں سمجھا بھی نہیں پار ہا تھا..... میرے لئے یہ بڑی مشکل اور خطرناک صورت حال تھی۔

القصہ کوتاہ..... رانی ہمارے ساتھ رہنے لگی۔ اب تو میں اپنی بیوی سوئی کو ایک لمحے کیلئے بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ..... ہم دونوں ہی رانی کی اصلی اور بھیا نک حقیقت سے واقف تھے..... رانی بھی مجھے اور بالخصوص سوئی کو..... اکثر خونخوار نظروں سے گھورا کرتی تھی۔

ایک روز میں نے موقع پاتے ہی..... رانی سے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔  
”..... بد بخت.....! تو یہاں سے فوراً چلی جا..... ورنہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس وقت..... تایا اور تائی اندر کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ رانی کو اسٹور والا کمرہ دیا ہوا تھا۔ اور میں بے دھڑک وہاں جا گھسا تھا جبکہ سوئی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ ہمارا ہی کمرہ تھا۔

مجھے سامنے پا کر..... اچانک رانی کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ وہ ایک اکی اپنی

ہمت ہارنا سیکھا تھا؟ تاہم اب میں سنجیدگی سے نقل مکانی کے بارے میں سوچنے لگا۔  
میرا ارادہ..... شہر جا کر بسنے کا تھا۔ مجھے اس بات کی تسلی ہی تو تھی کہ جب تک سوئی میرے ساتھ تھی..... جگدوش کی حیثیت کچھ بھی نہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ..... وہ اپنی موت آپ مر سکتا تھا..... کیونکہ سوئی کو حاصل کئے بغیر..... اس کا ”امر سادھنا“ والا شیطانی منصوبہ ادھورا ہی تھا۔ اس لئے میں نے یہی سوچا تا کہ..... اب جگدوش کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے..... اور مجھے اسے تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ..... اب میں اس کے پیچھے نہیں تھا..... بلکہ..... وہ خود میرے تعاقب میں تھا اور میرے ہوتے ہوئے وہ سوئی کو ہاتھ بھی لگانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس ملعون و مردود نے رانی کو خون آشام ڈانٹ بنا دیا تھا تا کہ اس کے ذریعے سے مجھے ختم کرے۔ سوئی کے حصول کیلئے اپنا راستہ صاف کر سکے.....“

ایک روز میں جلدی کھیتوں سے گھر لوٹ آیا۔ گھر داخل ہوا تو..... مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا..... رانی گھر پر موجود تھی اور..... تایا تائی کے چروں پر خوشی کے ڈوگرے برس رہے تھے..... مگر بے چاری سوئی کے چہرے کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے خوفناک نظروں سے رانی کو گھورا اور غصیلے لہجے میں کہا۔

”..... تو یہاں کیا کرنے آئی ہے..... فوراً دفع ہو جا یہاں سے.....“

تایا تائی نے جو یہ سنا تو مجھ پر برہم ہوئے.....  
”..... پتر.....! تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے..... یہ کیا کہہ رہا ہے تو..... رانی کو نہیں پہچان رہا۔ میرے تایا نے حیرت سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تایا ابا.....! یہ رانی نہیں ہے..... ایک ڈانٹ ہے..... جواب ہماری جان کی دشمن بن چکی ہے۔“ میں نے رانی کو غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے تایا سے کہا تو..... تائی جیسے پہلے ہی مجھے پر ادھا رکھائے بیٹھی تھی فوراً میرے دوارے ہو گئی۔

”..... عقل کو تھ پا..... ادشو کے.....! یہ کیا بکواس کر رہا ہے..... تو.....“

”میں صحیح کہہ رہا ہوں..... تائی.....! یہ رانی نہیں ہے۔ اس کی جو روح

ہیت بدلنے لگی..... وہ ایک بھیا نک اور خون آشام چڑیل کے روپ میں میرے سامنے تھی۔ میں بھی ذرا محتاط ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ انگارہ آنکھوں سے مجھے گھورتی ہوئی غرا کر بولی۔

”..... میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی..... نہیں چھوڑوں گی زندہ.....“

یہ کہہ وہ مجھ پر چھٹی..... اور اپنے استخوانی سیاہ ہاتھوں کی انگلیوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ کھرچ ڈالا۔ میرے حلق سے کراہ نکل گئی مگر میں نے اپنے حواس قفل نہیں ہونے دیئے..... اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ اور نیچے گرا دیا مگر اس کے وجود میں بھی بلا کی شیطانی طاقت تھی۔ اس نے زور سے مجھے اچھال دیا۔ میرا سر دیوار سے جا لگا۔ میرے حلق سے باعث تکلیف کراہ آمیز چیخ نکل گئی اور آنکھوں کے سامنے تاریکی بھی تیرنے لگی۔ رانی اٹھ کر باہر کو لپکی میں سمجھ گیا وہ کہاں جانا چاہتی تھی۔ سوئی کا خیال آتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں نے دو تین بار سر کو جھٹکا تاکہ دماغ میں اترنے والی تاریکی غالب نہ آئے ورنہ اگر میں بے سدھ ہو جاتا تو سوئی کو اس بھیا نک اور خون آشام چڑیل سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا..... لہذا میں اٹھ کر بھاگا..... اچانک مجھے قریب کے کمرے سے سوئی کی کرب ناک چیخ سنائی دی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن آٹکا..... میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں آیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔ رانی (خون آشام چڑیل) نے میری محبوب بیوی سوئی کا گلا دبوچ رکھا تھا۔ میں مجنونا نہ انداز میں چیخ مار کر رانی پر جھپٹا اور عقب سے اس کی گردن کے گرد اپنے دونوں بازوؤں کا کھنچہ کس کر اسے اپنی طرف جھٹکا دیا تو دوسرے ہی لمحے اس کا سر گردن سمیت میرے دونوں بازوؤں کے کھنچے میں آ گیا۔ رانی کا سر تن سے جدا ہو گیا تھا مگر..... اس کا سر میرے ہاتھوں میں دبا کمرہ انداز میں مسکرا رہا تھا..... سوئی نے یہ دہشت ناک منظر دیکھا تو بے ہوش ہو کر چڑیل (رانی) کے ہاتھوں میں جھول گئی..... میں نے فوراً اپنے بازو پر بابا کمال شاہ کا تعویذ اتارا اور جلدی سے سوئی کے گلے میں ڈال دیا۔ میں نے یک دم اپنے دائیں بازو پر بندھے تعویذ پر ہاتھ رکھ کر اللہ کا نام لیا اور پھر چڑیل کے دونوں استخوانی ہاتھوں کا کھنچہ

سوئی کی گردن سے چھڑانے لگا۔ اسے میں فرش پر پڑی چڑیل کی کھوپڑی چیخ مارتی ہوئی فضاء میں بلند ہو کر میری پیشانی سے ٹکرائی..... میرا سر چکرا گیا۔ مگر میں نے تکلیف کی پروا نہ کی..... بلا خر سوئی کی گردن، چڑیل کے کھنچے سے آزاد کر دیا اور فوراً سوئی کے بے سدھ وجود کو سنبھال کر اسے چار پائی پر لٹا دیا اور چڑیل غراتی چیختی ہوئی زمین پر لڑھکے ہوئے اپنے سر کو اٹھانے کیلئے لپکی تو..... میں نے اس کے سر کو لات مار کر فٹ پال کی طرح اچھال دیا۔ پھر اس کا کٹا ہوا سر اچھل کر کھلے دروازے سے باہر نیم تاریک محن میں جا پڑا..... وہاں..... تایا اور تائی مجھے کھڑے نظر آئے..... وہ شاید اس دھماچو کڑی کی آوازیں سن کر جاگ گئے تھے اور اپنے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ سران کے قدموں سے ٹکرایا تھا۔ چڑیل بھی اپنا سر اٹھانے کیلئے باہر کو لپکی۔ تائی نے یہ دہشت ناک منظر دیکھا تو غش کھا کر گر پڑی..... تایا نے البتہ خود کو سنبھالے رکھا تھا..... فوراً ہی زیر لب قرآنی آیات کا ورد کرنے لگے۔

دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا..... ان کے قدموں میں پڑے ہوئے سر نے ایک زوردار اور لرزہ خیز چیخ ماری پھر اگلے ہی لمحے اس کے سر کو آگ لگ گئی۔ اس کے سر کو آگ لگنے کی دیر تھی کہ..... چڑیل کا سر بریدہ وجود بھی..... بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کے بعد ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے..... وہ جل کر خاکستر ہو گئی۔ میں نے بے اختیار سکون کی گہری سانس لی۔ تایا حیرت ناک نظروں سے یہ دہشت انگیز منظر دیکھ رہے تھے..... پھر مجھ سے بولے..... ”پتر!..... یہ سب کیا ہے.....؟“

”تایا.....! یہ وہی خون آشام چڑیل تھی جو رانی کا بھیس بھر کر یہاں رہنے لگی تھی..... میں نے انہیں بتایا کہ یہ سوئی کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ پرتایا..... زمین پر پڑی بے ہوش تائی کی طرف متوجہ ہوئے اور میں اندر کمرے کی طرف دوڑا پھر بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لا کر یہ خوشخبری سنائی کہ..... وہ چڑیل جل مری ہے۔ پھر معا باہر محن سے مجھے تایا ابا کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”پتر شوکت! ادھر آ..... جلدی..... تیری تائی کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔“

میں اور سوہنی دوڑ کر..... محن میں آئے تائی کو ہوش نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تشویش نے آن گھیرا..... میں نے اکڑوں بیٹھ کر تائی کی نبض ٹٹولی اور پھر ان کے سینے کی دھڑکن سنی تو..... وہاں اتھاہ خاموشی تھی۔ میں لرز گیا۔  
تائی اس دہشت انگیز منظر کی تاب نہ لا کر..... مر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

رانی نے چڑیل کے روپ میں اپنی ہی ماں کو مار ڈالا تھا۔ مجھے تائی کی موت کا بہت غم تھا۔ تایا تو جیسے غم سے غڈ حال ہو کر رہ گئے تھے پھر میں نے اور سوہنی نے بڑی مشکلوں سے تایا کو سنبھالا اور تائی کی تجھیز و تدفین کا بندوبست کیا۔

پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا تھا۔ مگر چڑیل کے مرنے پر لوگوں نے سکون کی سانس بھی لی تھی۔ مگر ان کا یہ سکون عارضی ثابت ہوا..... کیونکہ اس اندوہناک واقعے کے بعد سے..... گاؤں میں لرزہ خیز اور خونی وارداتوں کا آغاز ہو گیا، پھر روزانہ ہی کسی نہ کسی شخص کا بڑی بیدردی سے قتل ہونے لگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ خونی وارداتیں..... وہ مردود جگدوش ہی کر رہا تھا۔ اس طرح وہ یہاں کے لوگوں کو بھی مجھ سے متنفر کرنا چاہتا تھا..... کیونکہ گاؤں کے بیشتر لوگوں نے ایک رچھ نما خوفناک یک چشم والے انسان کو..... یہ خونی وارداتیں کرتے دیکھا تھا اور جگدوش نے انہیں دھمکی دیتے ہوئے میرے خلاف درغلایا تھا کہ..... وہ یہ سب..... میرے کہنے پر کر رہا تھا..... اور وہ یعنی جگدوش درحقیقت میرے ہی کالے علم کی پیداوار تھا..... لہذا جب تک میں اور سوہنی اس گاؤں میں رہیں گے..... وہ یہ خونی وارداتیں کرتا رہے گا اور ایک دن سارے گاؤں والوں کو ہلاک کر ڈالے گا۔ اسکی اس دھمکی پر پورے گاؤں میں خوف کی لہر دوڑ گئی..... اور میں اندر سے تمللا کر رہ گیا۔ جگدوش کی یہ سازش تھی..... اس طرح وہ مجھے اور سوہنی کو بے گھر کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ..... کسی موقع کی تلاش میں رہتے ہوئے..... سوہنی کو مجھ سے چھین لے۔ اب تو یہاں بھی سارا گاؤں میری اور سوہنی کی جان کا دشمن ہو گیا۔ میں نے لاکھ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا..... مگر..... لوگوں کی عقل پر پردے پڑ چکے تھے۔

بالآخر ایک روز چودھری حشمت بھی یہ کہنے پر مجھے مجبور ہو گئے کہ..... میں اور سوہنی جتنی جلدی ممکن ہو سکے..... گاؤں چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں۔ انہوں نے اس تشویش کا بھی برملا اظہار کر ڈالا تھا کہ..... اگر ہم نے جلد ہی گاؤں بدری اختیار نہ کی تو..... گاؤں کے مشتعل افراد کا ٹولہ مجھے اور سوہنی کو جان سے مار ڈالے گا۔

یوں اب ہمارے لئے..... ایک لمحہ بھی گاؤں میں رہنا ممکن نہ رہا تھا بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ..... اس سے پہلے کوئی ناخوشگوار واقعہ جنم لے..... میری اور سوہنی کی اس میں ہی عافیت ہے کہ..... ہم دونوں فی الفور..... اس گاؤں سے ہجرت کر جائیں۔

تایا ابا کو ہمارے جانے پر از حد دکھ تھا۔ وہ واپس اپنے گاؤں لوٹ گئے تھے اور اپنی دکان سنبھال لی جبکہ میں اور سوہنی علی الصبح اپنا مختصر سا بوریا بستر سمیٹ کر..... شہر جانے والی لاری میں سوار ہو گئے۔

شہر جانے والی لاری میں تو ہم بیٹھ چکے تھے مگر..... میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ..... شہر میں ہم آخر کہاں جا کر رہیں گے.....؟ وہاں ہمارا کوئی عزیز رشتے دار نہ تھا..... بس..... ایک اندھی منزل تھی اور نامعلوم سمت..... تھوڑی دیر بعد لاری چل پڑی..... سرشام ہم شہر پہنچے۔ لاری اڈا پر ویرانی طاری تھی..... میں اور سوہنی لاری سے اترے۔ سوہنی نے دیہاتی طرز کا شٹل کاک برقعہ پہن رکھا تھا۔ ہمیں بھوک اور پیاس ستانے لگی۔ اڈے پر ہی ایک چھوٹا سا چھپر ہوٹل تھا۔ ایک کونے کی بوسیدہ سی میز کرسیوں پر ہم بیٹھ گئے۔ میرے پاس تھوڑی بہت جمع پونجی تھی جو مجھے کوئی روزگار ملنے تک احتیاط سے خرچ کرنی تھی۔ شکر تھا کہ یہ لاری اڈے پر ایک تنگ و تاریک سا مسافر خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ میں نے آج کی رات ادھر ہی بسر کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ سالن کی ایک ہی پلیٹ منگوائی ہم نے جیسے تیسے آتش شکم سرد کی اور میں سوہنی کو لئے..... سیلن زدہ سے اس مسافر خانے میں آ گیا۔ ہمارے پاس صرف ایک بچی اور کپڑے کا بوسیدہ سا ٹرک تھا۔ ہم اکھڑے ہوئے پلستر والے فرش پر دردی بچھا کر بیٹھ گئے۔

..... شوکت! اب ہم کہاں جائیں گے..... ہم تو بالکل ہی در بدر ہو گئے۔“

لمحہ بھر کی افسردہ سی خاموشی پر سوہنی نے غمگین آواز میں مجھ سے کہا تو میں اسے تسلی دینے کی غرض سے بولا۔

..... سوہنی! اللہ پر بھروسہ رکھ..... اب وہی ہمارا آسرا اور سہارا ہے..... تو دل چھوٹا نہ کر اپنا۔“

..... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے..... اور میرے ساتھ تو بھی.....“

..... نا..... سوہنی..... نا، ایسا کیوں سوچ رہی ہے تو میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر ملائمت آمیزی سے کہا۔ وہ بے چاری میری بات پر سسک کر رونے لگی۔ میں نے بے اختیار محبت سے اسے اپنے گلے لگالیا۔ تھوڑی دیر گزری تو دوسرا ہی فرش پر ڈنڈا بجاتے ہوئے آن وارد ہوئے۔ وہ دونوں ہی مجھے خرام خور محسوس ہوئے۔ سوہنی نے جلدی سے اپنے چہرے پر برقع کا نقاب چڑھا لیا۔ وہ دونوں..... مجھے اور سوہنی کو گھور گھور کر تنکے لگے۔ پھر ان میں سے ایک کڑک دار لہجے میں بولا۔

..... اوئے..... کون ہو تم لوگ.....؟ کون سے گاؤں سے بھاگ کر آئے ہو.....“

..... بھاگ کر آئے ہیں..... ناجی..... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم میاں بیوی ہیں۔“

میں نے پریشان ہو کر یک دم کہا تو دوسرا سپاہی اپنی چنگیزی مونچھوں کو مروٹیاں دیتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں بولا۔

..... اوئے..... ہمیں تو نے کیا اتنا ہی بیوقوف سمجھ رکھا ہے جو ہم تیری مانجھے سا جھے والی باتوں میں آجائیں گے..... ہیں..... ذرا نکال ناں..... نکاح نامہ..... میں اس کی بات پر فکر مند ہونے لگا۔ کیونکہ نکاح نامہ سنبھالنے کی مجھے کب ہوش تھی؟ اور نا ہی ضرورت..... میں نے لہجی میں ان سے کہا۔

..... ناجی..... نکاح نامہ تو میرے پاس نہیں..... مگر.....“

..... اوئے..... نکاح نامہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ تیرے پاس، تو ضرور اس کڑی (لڑکی) کو بھاگ کر لایا ہے..... چلو نا ذرا تھانے..... تیری مہمان داری کریں گے تو تو

آپ ہی سچ بول دے گا۔“

اتنے میں سوئی نے نقاب کے پیچھے سے منت بھرے لہجے میں ان سے کہا۔  
 ”.....نن..... نہیں..... میں اس کی بیوی ہوں، مجھے یہ بھگا کر نہیں لایا ہے۔  
 ”..... ہاں تو تیرے گھر والوں سے پوچھ ہی لیں گے..... بعد میں ابھی تو تم  
 دونوں تھانے چلو..... اٹھو“

پہلے والے نے کرخت لہجے میں کہا۔ تو دوسرا اپنے ساتھی سے بڑبڑانے  
 والے انداز میں بولا۔

”..... مجھے تو یہ دونوں چور بھی لگتے ہیں۔“  
 ”نہیں..... نہیں جی..... ہم چور نہیں ہیں۔“ میں نے یکدم متوحش سے لہجے  
 میں کہا۔

”اچھا.....“ پہلا والا مجھے گھور کر بولا پھر معنی خیز لہجے میں کہا۔  
 ”..... تمہاری انٹی میں کتنے روپے ہیں۔“ میں اس کی بات کا مطلب فوراً  
 جان گیا اور اپنی جیب سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے تو اس نے نہ صرف  
 وہ نوٹ جھپٹ لئے بلکہ میری جامہ تلاشی لیکر باقی بچے کچے مزید روپے بھی چھین  
 لئے..... اس کی اس حرکت پر غصہ آ گیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”یہ کیا بدتمیزی ہے.....؟ میرے روپے واپس کرو۔“

”اوئے..... نذرانہ دیتا ہے..... ابھی تم دونوں کو تھانے لے جا کر خوار  
 کر دیں.....“ دوسرے نے حیثیت نہ لہجے میں سوئی کی طرف دیکھ کر مجھے دھمکی دی۔ میرے  
 تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی سخت جملہ کہتا  
 اچانک سوئی نے روہانے لہجے میں مجھ سے کہا۔  
 ”..... شوکت حسین! رہنے دو۔“

”تیری رن سمجھدار لگتی ہے۔ وہ ہماری بات سمجھ گئی ہے۔ چلو ماکھے..... چھوڑو  
 انہیں۔ دوسرے سپاہی نے اپنے پہلے والے ساتھی سے کہا اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔  
 میں اپنی جگہ تملاکر رہ گیا۔

”سوئی! یہ کیا کیا تم نے.....؟ اب تو ہمارے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں  
 رہی۔“

میں نے فکر مندی سے کہا۔ تو وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔  
 ”تیرے سر کا صدقہ گیا۔ مٹی ڈالو..... ورنہ یہ ہمیں تھانے لے جا کر بہت بے  
 عزت کرتے..... اللہ ہماری مدد کرے گا۔ میں اس کی بات پر تھکے تھکے انداز میں دوبارہ  
 اس کے قریب بیٹھ گیا..... اب میرے دل و دماغ میں پریشان کن حالات نے یلغار کر  
 ڈالی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ..... مجھے خود سے زیادہ سوئی کی فکر ستانے لگی  
 تھی۔ ہمارے پاس دو جوڑے کپڑوں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ایک پھوٹی  
 کوڑی بھی تو نہیں تھی ہمارے پاس..... گویا کل کا سورج ہمارے لئے..... پریشان کن  
 حالات اور اذیت ناک گھڑیوں کے ساتھ طلوع ہوتا تھا۔ مجھے ژولیدہ حالات میں گم صم  
 بیٹھا پا کر سوئی نے نرمی سے کہا۔ ”کیا سوچنے لگے..... شوکت؟“

”..... اب کیا سوچنا؟ پتہ نہیں..... صبح ہمارے لئے کیسی کیسی پریشانیوں  
 لے کر ہوتا تھی.....“ میں نے پر تشکیر لہجے میں کہا۔

”شوکت.....! مایوسی گناہ ہے..... رب سوہنا..... خیر کرے گا۔ تو تو بہت  
 ہمت والا جوان ہے..... پھر یہ مایوسی کیسی.....؟ اس کے ملامت اور گداز لہجے میں جانے کیا  
 جان فزاء جادو تھا کہ میں اپنے اندر ایسا کی عجیب سا حوصلہ محسوس کرنے لگا تھا۔  
 ”..... شوکت! ہم صبح ہوتے ہی دڑے دڑے بنگلوں کی طرف چل نکلیں  
 گے..... وہاں ضرور کوئی ہم دونوں کو نوکر رکھ لے گا۔“

”تو تو بڑی سیانی ہو گئی ہے۔ میں تو تجھے ایسی ہی سمجھتا تھا۔“ میں نے پر کبیدہ  
 فضا کو کم کرنے کی خاطر خوش دلی سے کہا۔ وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔ اس نے اب اپنے  
 چہرے سے نقاب الٹ دیا تھا۔ شادی کے بعد اس کے ملکوتی حسن میں مزید نکھار پیدا  
 ہو گیا تھا۔ اس کے نرم و گداز گالوں میں گلابوں سی رنگت مزید شہابی ہو گئی تھی اور اس کی  
 گہری جھیل ایسی آنکھیں جہاں پہلے ہر سے اداسی کے کھنڈر آباد رہتے تھے..... اب  
 وہاں خوشیوں کے خواب ناک کنول کھلنے لگے تھے۔



جلدوش کی آنکھ والا بھیا نک سر نظر آ رہا تھا۔ اس کے خوفناک چہرے پر بڑی مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ دوبارہ مجھ سے غراہٹ آمیز آواز میں بولا۔

”.....تم دونوں کب تک مجھ سے بچو گے.....؟ میں تمہیں ہر جگہ ذلیل و خوار کر کے رکھ دوں گا۔ اب بھی وقت ہے..... میرا کہا مان لے..... اور اس ناری کو میرے حوالے کر دے۔“

اس کی تہدید پر یکدم میرے اندر سے خوف عنقا ہونے لگا اور اس کی جگہ جوش آمیز طیش نے لے لی۔ چنانچہ اگلے ہی لمحے میں نے بلا خوف لہجے میں دانستہ ہنس کر اس سے کہا۔

”اے لعنتی شیطان.....! تو اپنی خیر منا..... تری اس منحوس زندگی کے اب تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔“

”ہا..... ہا..... ہا..... تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا..... مورکھ! میں ابھی تجھ پر بھوکے شکاری کتے چھوڑتا ہوں۔“ اس نے ایسا غرور آمیز قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور غائب ہو گیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی اچانک مجھے باہر بہت سے کتوں کے بھونکنے کی خوفناک آوازیں سنائی دیں اور میں بری طرح لرز اٹھا۔ اس مسافر خانے کے کمرے میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ صرف بغیر کواڑ کے سینٹ والے چوکھٹے بنے ہوئے تھے۔ میں جلدی سے چوکھٹے کی طرف آیا تو سامنے کا منظر دیکھ کر دہشت زدہ رہ گیا۔ سامنے میدان میں کیم شیم اور خونخوار کتے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ان کی سرخ سرخ زبانیں، نوکیلے دانتوں کے جبرڑوں سے باہر لپٹا رہی تھیں۔ وہ ہماری ٹکا بوٹی کرنے کو بے چین تھے۔ میں واپس پلٹا اور سوئی کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ مسافر خانے میں ایک دوسرے سے ملحقہ تین چار اور بھی کمرے تھے جن کے درمیان سینٹ کی دیواروں سے پارٹیشن کئے گئے تھے۔ میں دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں آ گیا مگر جیسے یہاں بھی چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ ادھر مسافر خانہ کتوں کے بھونکنے اور غراہٹوں سے گونجنے لگا۔ میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ وہ خونخوار کتے اندر داخل ہو چکے تھے۔ میرے اندر سائیں سائیں ہونے لگی۔ سوچنے کا بالکل وقت نہ تھا۔ وہ خونخوار شکاری کتے ہمیں چھاڑ کھانے کیلئے بے

”مگر میں تجھے ان وڈے وڈے بنگلوں میں کام کرنے نہیں دوں گا۔ تو میرے دل کی رانی ہے اور رانی بن کر رہے گی۔ میں نے محبت پاش نظروں سے اس کے گلابی چہرے کی طرف دیکھ کر کہا تو مارے حیا کے اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ ہم وہیں لیٹ گئے۔ مگر میں جاگتا رہا۔

رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ باہر تاریک ساٹا پھیل گیا تھا۔ نجانے رات کا کون سا پہر تھا کہ میری بھی آنکھ لگ گئی.....“

☆.....☆.....☆

اچانک ایک چیخ پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں ویسے ہی کھٹکے کی نیند سو رہا تھا۔ رات ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا سوئی میرے ساتھ لپٹ گئی تھی اور خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت مارے دہشت کے پیلی پڑنے لگی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا اسے سنبھالتے ہوئے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے.....؟ کیا ہوا؟ سوئی.....!“

”وہ..... وہ..... باہر کوئی ہے۔“ وہ کپکپاتے لہجے میں بولی۔ کک..... کک..... کوئی ٹانگ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ تو میں جلدی سے اٹھا مسافر خانے سے باہر آ گیا اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ ہر سوتاریک ساٹا طاری تھا۔ وہاں مجھے کوئی نظر نہ آیا میں دوبارہ ادھر آ کر سوئی کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”..... باہر کوئی بھی نہیں ہے؟ تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا تھا۔“

میں نے اس سے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ..... اچانک ایک شناسا اور غراہٹ آمیز آواز مجھے سنائی دی..... مورکھ! یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔“

یہ آواز مسافر خانے کے اس تنگ و تاریک کمرے کی چھت سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے بے اختیار آواز کی سمت اپنے سر کو اٹھایا دیکھنے کیلئے تو میری رگوں میں خون منجمد سا ہونے لگا۔ چھت پر پراسراسی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور میں نے دیکھا چھت سے ایک قومی ہیکل اور بدہیت جھمپکلا چپکا ہوا تھا۔ مگر اس کے چہرے کی جگہ

جین تھے۔ اچانک میری نظربیت الخلاء پر پڑی۔ اس میں دروازہ نصب تھا۔ میں ایک پل بھی ضائع کئے بغیر سوئی کو لے اس میں داخل ہوا۔ کتے ہماری بوسوگتھے ہوئے یہاں بھی آن وارد ہوئے تھے۔ جب میں بیت الخلاء کا دروازہ بند کرنے لگا تو اس وقت ایک کتے نے غرا کر مجھ پر جست لگائی مگر میں اس سے بھی پھرتی کے ساتھ دروازہ بند کر چکا تھا۔ وہ کتابند دروازے سے ٹکرا کر دھپ سے گر گیا تھا۔

اندر سخت تعفن اور بدبو تھی..... جس سے دماغ پھٹا جا رہا تھا مگر..... ان کڑے لمحات میں یہ بھی غنیمت پناہ گاہ لگی تھی مجھے۔

کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ سوئی غزاں رسیدہ پتے کی طرح میرے ساتھ چٹٹی ہوئی کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا۔ یہ بہت تنگ بیت الخلاء تھا جس کی دیواریں سات آٹھ فٹ ہی اونچی تھیں اور اوپر کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اچانک مجھ پر ایک روح فرسا انکشاف ہوا اور میں جی جان سے لرز اٹھا۔ بیت الخلاء سے باہر بھونکتے ہوئے چند ایک کتے جست بھرتے ہوئے بیت الخلاء کی دیوار پھانڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے دروازے کی متوازی جھری سے اپنی آنکھ لگا کر دیکھا تو میرا خیال درست ثابت ہوا۔

مجھے تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ اگر..... یہ کتے بیت الخلاء کی دیوار ٹاپ کر اندر داخل ہو جاتے تو..... مجھے اور سوئی کو بھنبھوڑ کر رکھ دیتے۔ تب پھر معا ہی بیت الخلاء کی مختصر دیوار پر ایک کتے کی خوفناک غراہٹ سنائی دی۔ میں نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا تو..... میرا خون خشک ہو گیا۔ ایک خوفناک کتا دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سوئی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ بری طرح سہم گئی تھی۔ وہ خوفناک کتا..... ہمارے اوپر کودنے کے لئے پرتول رہا تھا۔ میں نے بیت الخلاء کا جائزہ لیا۔ اچانک مجھے اندر ایک دو اینٹوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے نظر آئے۔ میں نے ایک اٹھالیا اور اسے پوری قوت سے کتے پر اچھال دیا۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ اینٹ کا وہ آدھا ٹکڑا بڑے زور سے کتے کے تھوٹھنے پر لگا۔ اس نے بھیا نک آواز خارج کی اور واپس دوسری طرف الٹ گیا۔ اس اثناء میں ایک اور کتے نے چھلانگ لگائی۔ میرے پاس اب ایک ہی ٹکڑا

باقی بچا تھا۔ میں نے وہ اچھال دیا۔ جوش اور گھبراہٹ کی آمیزش میں..... میرا یہ نشانہ خطا گیا تھا۔ کتنے نے اچانک میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں نے سوئی کو ذرا پرے دھکیل دیا۔ کتا میرے اوپر آن پڑا۔ سوئی کے حلق سے دہشت زدہ چیخ نکلی۔ کتے کی غراہٹ میری سماعت چھلنی کرنے لگی۔ مگر میں نے اس سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی اور جیسے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ میں نے پوری قوت سے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونہ اس کے بدیت تھوٹھنے پر رسید کر ڈالا..... وہ تڑپ کر نیچے گرا تو میں نے بلاخیز پھرتی کے ساتھ اس کی گردن دبوچ لی اور اسے دیوار سے لگا کر اس کی گردن پوری قوت سے دباتا چلا گیا۔ اس نے مجھے پنجے مارنے کی کوشش کی مگر..... مگر میری وحشت جنون خیزی کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور ذرا ہی دیر بعد وہ جھول کر رہ گیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ دھپ سے گرا اور ختم ہو گیا۔ میں نے اب کسی تیسرے کتے کی آمد سے پہلے ارادہ کیا..... اب مجھے خود دیوار پر چڑھ جانا چاہئے، ورنہ اگر مزید کتوں نے دیوار پھانڈ لی تو ان کا مقابلہ نہیں کر پاؤں گا چنانچہ میں نے سیوریج کے پائپوں کی مدد سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا اور ذرا سی کوشش کے بعد بیت الخلاء کی دیوار پر آچکا تھا۔ مجھے باہر نیچے ان گت کتے نظر آئے۔ جو خوفناک جڑے کھولے خونخوار انداز میں تھوٹھنے بلند کئے مجھے گھور رہے تھے۔ اب جیسے ہی کوئی کتا دیوار پر چھلانگ لگنے کی کوشش کرتا میں لات مار کر اسے دوبارہ نیچے گرنے پر مجبور کر دیتا۔ میری یہ حکمت عملی خاصی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ باہر اب شاید سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا تھا..... کیونکہ کمرے میں روشنی سی پھیلنے لگی تھی پھر میں نے دیکھا..... کتے آہستہ آہستہ واپس لوٹنے لگے۔ ذرا ہی دیر بعد کمرہ خالی ہو گیا..... وہ سارے شیطانی کتے شاید واپس لوٹ چکے تھے۔ میں نے سوئی کو اندر ہی رہنے کو کہا اور پھر خود باہر کی طرف نیچے کمرے میں آکودا۔ مجھے خدشہ لاحق تھا کہ..... کہیں میری بو پا کر خبیث شیطانی کتے دوبارہ ہی مجھ پر یلغار کر دیتے۔

بہر طور..... میں محتاط روی سے چلتا ہوا..... باہر آیا تو دور دور تک ان خونخوار کتوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔

باہر صبح کاذب کی روشنی چہار سو پھیلنے لگی تھی۔ لاریوں نے ہارن دیکر لائین

سے لگنا شروع کر دیا تھا۔ اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد میں واپس..... کمرے میں آیا اور سوئی کو آواز دی۔ وہ بیت الخلاء کا دروازہ کھولے ڈری سہی ہوئی باہر نکلی۔ پھر مجھے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔

”ہائے شوکے! کتنے خونخوار کتے تھے..... میرا تو انہیں دیکھ کر خون ہی خشک ہو گیا تھا۔ سوئی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا..... میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”سوئی! تمہارا شوکا..... اپنے دشمنوں کیلئے ان سے زیادہ خونخوار ہے۔ آؤ..... چلتے ہیں۔“ پہلی بار وہ ہولے سے مسکرائی اور پھر میں نے ہنسی اور ٹرک اٹھالیا اور باہر نکل آئے۔ شہر پوری طرح بیدار ہونے لگا تھا۔ موٹروں، گاڑیوں کی شور مچاتی آوازیں ابھرنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس بھرے پرے شہر میں ہمارا کوئی نہ تھا؟ کوئی منزل نہ تھی؟ بس اللہ کا بھروسہ تھا۔ ہم دونوں سڑک کے کنارے کنارے ست روی سے چلتے گئے۔

ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ پریشان ہوا جا رہا تھا کہ..... آخرا ب ہمارا کیا بنے گا؟ اپنے گاؤں ہوتا تو دوسری بات تھی۔ مگر اب تو وہاں پر بھی سارے ہماری جان کے دشمن بن چکے تھے۔ رہا یہ شہر تو..... یہ بھی بے مروت ہی محسوس ہو رہا تھا۔ ہر طرف نفسا نفسی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ بڑی تیز رفتار زندگی تھی یہاں کی..... اللہ کا بھروسہ تھا اور اس کا سہارا۔ ہم دونوں چلتے چلتے تھک کر چور ہو گئے تو..... فٹ پاتھ کے کنارے ٹڈیالہ ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ کسی سرکاری پارک کی دیوار تھی۔ میں ذرا دیر میں سوئی کو لیکر اندر باغ میں آ گیا۔ یہاں ایک تل سے پانی پیا..... اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھے تو اب یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ مردود جگہ واپس اپنی سازش میں کامیاب ہو جائے گا..... کیونکہ اس مردود کی وجہ سے ہم بالکل ہی خانماں برباد ہو چکے تھے۔ یہاں ہمیں کون سر چھپانے کو چھت دے سکتا تھا..... یا دو وقت کی روٹی..... جب تک دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی..... مجھے جگہ واپس کی طرف سے بے فکری تھی مگر..... اندھیرا پھیلنے ہی بے سروسامانی کے عالم میں ہمیں پھر جگہ واپس کی طرف سے خطرہ لاحق ہونے لگتا..... اس لئے میری انتہائی کوشش تھی کہ..... کسی طرح رات کا

اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہل ہمیں کم از کم سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ تو مل ہی جائے۔ میں سر پکڑے پریشان بیٹھا تھا۔ صبح خیزی کی وجہ سے پارک میں خوش فکر لوگ..... ٹریک سوٹ پہنے چہل قدمی کر رہے تھے اور کچھ ورزش میں مصروف تھے۔ میں انہیں حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ کتنے بے فکر اور خوش و خرم لوگ تھے..... ان کا یقینا آرام وہ گھر بھی ہوگا۔ یہ ورزش کرنے کے بعد سکون سے وہاں پڑیں گے۔ نہ انہیں چھت کی فکر تھی نہ روزگاری۔ ایک میں اور سوئی بد نصیب تھے جن کا اس بھرے پرے شہر بے مروت میں کوئی پرسان حال نہ تھا۔

”شوکت! کیا سوچنے لگے؟“

مجھے ڈولیدہ سوچوں میں گم پا کر..... معا سوئی نے آہستگی سے اپنا نرم و گداز ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ کر نرمی سے پوچھا۔ میں ذرا چونکا پھر ایک گہری اور آزرده سی ہمدردی خارج کر کے بولا۔

”سوئی! میں سوچ رہا تھا۔ اب ہم کہاں جائیں..... جانے ہمیں کتنے دن در بدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی۔“

”شوکت! تو مرد ہو کر دل چھوٹا کر رہا ہے..... اللہ مالک ہے ہمارا..... جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا خدا ہوتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے..... مگر.....“

”مگر اگر چھوڑ دو..... تم رقم وغیرہ کیلئے پریشان ہو تو..... یہ لو.....“ اس نے جلدی سے کہا اور اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی کھول کر میرے سامنے کر دی..... میں نے دیکھا اس کی سرخ و سپید ہتھیلی پر..... دوسو نوے کے خوبصورت بندے چمک رہے تھے جو اس نے جانے کب اپنے کانوں سے اتار لئے تھے۔

”..... تو انہیں..... کسی سونارے (جیولری) کے ہاتھ بیچ دے..... میرے بابا نے بڑا کر دیئے تھے..... پورے ڈھائی ہزار سے کیا کم ہوں گے؟ وہ دل پر جبر کر کے بولی۔ مجھے اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے فوراً اسے مصنوعی ہنسی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں سوئی! یہ تیرے بابا کی نشانی ہے..... میں نے تجھے کیا دیا ہے..... جو اب الٹا تیرے یہ بندے بھی بیچ ڈالوں.....“

مجھ سے نہ ہوگا۔ تو اسے فوراً پہن لے۔

”ہائے شوکت! کیسی بات کرتا ہے تو..... وہ تڑپ کر بولی۔

”..... یہ میں تجھے اپنی خوشی سے دے رہی ہوں اور پھر مجھے بھلا اب تجھ سے

کیا چاہئے..... کیا تو میرا نہیں ہے۔“

اس نے ایک خاص ادائے دل آراء سے کہا اور میرے دماغ سے ساری کٹافٹیں اور تھکان ڈھلنے لگی۔

”ہاں..... سوئی! تو تو میرے لئے واقعی..... دنیا جہان کی دولت سے کم نہیں

ہے..... مگر..... یہ مجھ سے نہ ہوگا۔“

میں محبت پاش لہجے میں اس سے بولا۔ تو وہ دوبارہ یہ اصرار بولی۔ ”شو کے!

میری خاطر..... دیکھ یہ چیزیں تو آنی جانی ہوتی ہیں..... تجھے کوئی اچھا روزگار مل جائے گا

تو پھر..... مجھے تو اس جیسے اور بنا دینا پر..... اب یہ میرے کام کے نہیں رہے..... مجھے

چھینے لگے ہیں۔“

میں جانتا تھا..... کہ وہ..... دل پر جبر کر کے ایسا کہہ رہی ہے۔ میں نے ٹالنے

والے انداز میں اس سے کہا ”اچھا ٹھیک ہے..... جب ضرورت پڑی تو یہ بھی کر لیں

گے، مگر ابھی مجھے ذرا اپنی سی کوشش تو کر لینے دو۔ چلو آؤ..... بنگلوں کی طرف چلتے ہیں۔

یہ کہہ کر میں ٹرک سنبھالے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی برقعہ سنبھالے کھڑی ہو گئی۔ ہم دونوں

باغ کے مرکزی گیٹ سے باہر نکل آئے۔

☆.....☆.....☆

ہمارے سامنے پر رونق سڑک تھی۔ اس کے پار بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ میں نے سوئی کا ہاتھ پکڑا اور..... بڑی مشکلوں سے سڑک پار کی۔

دن کافی چڑھ آیا تھا..... ہم اس متمول علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔ اب

ہماری دورویہ عالیشیان کوٹھیوں اور بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ میں نے ہمت کر کے.....

ایک بنگلے کا بڑا سا گیٹ بجانا چاہا تو..... اس سے پہلے ہی ایک بغلی چوکت سے جھانکتے

ہوئے بڑی بڑی مونچھوں والے..... گن مین نے کرخت لہجے میں کہا۔

”..... اوئے..... کس سے ملتا ہے، کون ہو تم لوگ؟“

سوئی بے چاری ڈرسی گئی، مگر میں نے ہمت کر کے اس سے کہا۔

”بھائی! ہم گاؤں سے آئے ہیں اور چاہتے ہیں کسی کے گھریلو ملازم بن کر

رہیں۔“

”چلو..... چلو..... بھاگو یہاں سے، نا جان نہ پہچان، آگے گھریلو ملازم

بنے..... بھاگو۔“

وہ کرخت صورت گن مین بولا اور میں منہ لٹکائے آگے بڑھ گیا۔

پھر دو تین بنگلے چھوڑ کر..... چوتھے پر قسمت آزمائی کی، تو وہاں سے بھی ہمیں

یہی جواب ملا۔ گویا..... ہم چوکیداروں اور محافظ ٹائپ آدمیوں کے منہ لگتے رہے اور وہ

ہمیں بڑی حقارت اور نخوت سے دھکارتے رہے۔ میں تو بالکل ہی مایوس ہو گیا تھا اور

تھک ہار کر وہیں بیٹھ رہا۔ بے چاری سوئی نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

”شوکت! تم کوشش کرو..... کہ ان اکھڑ مزاج چوکیداروں سے ملنے کے

بجائے بنگلے کے مالکان سے ملنے کی کوشش کرو..... وہ یقیناً رحم دل ہوں گے۔“

”میں کیا کروں؟ کیا زبردستی اندر گھس جاؤں..... میں نے جھنجھلا کر کہا۔ بے چاری سوئی بھی میرے سخت لہجے پر چپکی ہو رہی۔“ اچھا آؤ..... آگے چل کر قسمت آزمائی کرتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر آگے بڑھ گئے۔

چند بنگلے چھوڑ کر..... ہم عقبی قطار کی طرف آئے۔

یہاں بھی مجھے پھر بنگلے اور کوٹھیوں کے گیٹ پر خزانہ قسم کے چوکیدار اور محافظ کھڑے نظر آئے۔ مجھ میں اب ان سے الجھنے کی سکت نہ تھی۔ میں ویسے ہی چڑچڑا ہوا ہاتھ۔

بالآخر ایک آخری کوشش کی غرض سے..... میں ایک بنگلے کے گیٹ کے قریب بنے گارڈز کیمین کے قریب آیا۔ وہاں ایک اکھڑی چارپائی پر دو افراد بیٹھے..... بیڑی پی رہے تھے اور آپس میں من مٹھڈ بھی کئے جا رہے تھے۔ میں نے انہیں دروازے کے باہر ہی رک کر سلام کیا۔ انہوں نے ایک نظر مجھ پر ڈالی پھر..... میرے عقب میں کھڑی برقعہ پوش سوئی کو عجیب نظروں سے گھورنے لگے۔ میں نے ان سے کہا۔

”..... بھائی! ہم گاؤں سے آئے ہیں..... یہاں اگر ہمیں کوئی کام مل جائے، تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“ میری بات پر..... وہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے..... پھر ایک نے..... چارپائی سے کھڑے ہو کر..... ہمیں اندر آنے کا کہا۔ میں اور سوئی اندر آ گئے۔ کیمین تنگ سا تھا۔

”بیٹھو..... آرام سے بات کرتے ہیں۔“ دوسرا گھنی مونچھوں والا نرمی سے بولا۔ یہ واحد شخص تھا جو خلاف توقع ہم سے حلیم طبع انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ مجھے ان دونوں بھلے مانسوں سے امید سی ہونے لگی اور پھر میں اور سوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بچی چارپائی پر رکھ دی۔ ٹریک فرش پر رکھ دیا۔ سوئی چارپائی کے کونے میں میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

”ہاں..... اب بتاؤ..... تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں سے آرہے ہو۔“

دوسرے نے اک گہری سانس لے کر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے

پوچھا۔ تو میں بتانے لگا۔

”وہ جی..... میرا نام شوکت ہے۔ شوکت حسین! ہم اپنے گاؤں ”بج گرائیں“ میں رہتے ہیں..... وہاں ہمارا کوئی نہ تھا۔ ہم نے سوچا..... شہر آ کر قسمت آزمائی کرنی چاہئے۔“

”یہ زنانی کون ہے؟ پہلے والے نے برقعہ پوش سوئی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”..... یہ جی میری بیوی ہے۔“ میں نے جوابا کہا۔

”اچھا..... تم کون سا کام کرنا چاہتے ہو؟ دوسرے پوچھا۔

”او جی..... کوئی سا بھی کام ہو..... باغ کی رکھوالی کر لوں گا..... سودا سلف لادوں گا۔ گاڑی چلا لیتا ہوں.....“

”بس..... بس..... ٹھیک ہے“ پہلے والے نے جلدی سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور پھر..... اپنے قریب کھڑے ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کیا خیال ہے ماہے؟ بندہ تو کام کا دکھائی دیتا ہے..... میرا خیال ہے..... اپنے صاحب کو ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔“ مجھے کام کی امید ہونے لگی، پھر دوسرے نے مجھ سے پوچھا۔

”اوئے شوک! تجھے..... بندوق شندوق بھی چلانی آتی ہے..... یا صرف گرائیں میں گنڈا سا ہی گھمایا کرتے تھے۔“

”دو آ ہو جی! میں جلدی سے سینہ پھلا کر بولا۔

”سنگل بیرل، ڈبل بیرل سب چلا لیتا ہوں۔ پستول بھی تھا میرے پاس.....“

”اچھا..... اچھا..... ٹھیک ہے۔ بندہ تو تو واقعی ٹکڑا نظر آتا ہے..... چل او ماہے..... تیری تو جان چھوٹی سمجھ..... ابھی صاحب آئے گا۔ میں اسے ملا لیتا ہوں۔“ وہ اپنے ماجد نامی شخص سے بولا۔ میں یہ سمجھا شاید میں نے اس کی روزی پر لات مار دی ہے اس لئے فوراً سادگی سے بولا۔ ”بھائی جی! کیا میری وجہ سے اس بھائی کی چمٹی ہو

نصیب ہو جائے۔“

”ہاں..... ہاں..... انشاء اللہ“ میں نے کہا پھر تھوڑی دیر گزری تھی کہ.....  
 اچانک وہ دونوں ماجے سا جھے اندر داخل ہوئے۔ ”ہاں بھی روٹی کھائی تم نے.....“  
 ”جی ہاں..... بڑی مہربانی جی۔ آپ کی.....“ میں نے خوشی سے کہا۔  
 ”صاحب..... آگئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد تمہیں ان سے ملواتا ہوں۔“  
 وہ بولا..... اور میں نے جی اچھا کہہ کر..... خاموشی اختیار کر لی۔  
 ”وہ جی نوکری ملنے کے بعد..... ہمیں یہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ مل جائے گا  
 ناں.....؟ میں نے فوراً پوچھا۔

”ہاں..... ہاں..... نوکری ملنے کے بعد..... ماجد کا کوارٹر خالی ہو جائے گا.....  
 تم دونوں وہیں رہنا۔“

”بہت بہت مہربانی جی..... شکریہ۔“ میں اس سے احسان مند ہونے والے  
 لہجے میں خوشی سے بولا۔ اس کا نام..... شاہ مراد تھا اور وہ یہاں کا پرانا نمک خوار اور  
 خدمت گار تھا۔

پھر خاصی دیر بعد..... اس نے دوبارہ ٹیلی فون (انٹرکام) پر اندر رابطہ  
 کر کے..... ہمیں اندر لانے کا پوچھا اور..... پھر..... جی اچھا کہہ کر..... ریسور رکھ دیا۔  
 ”چلو بھی..... آؤ تم دونوں میرے ساتھ.....“ وہ بولا۔ پھر اپنے ساتھ ملازم  
 ماجد عرف ماجے سے بولا۔

”چل اوئے..... ماجے تو بھی چل ساڈے نال اندر اک ہی وری..... تو بھی  
 گھھ کر لے صاحب نال۔ چل آ.....“

پھر ہم سب بڑے سے گیٹ کے اندر داخل ہو گئے..... ہم ایک وسیع و عریض  
 اور چکنے فرش پر چلتے ہوئے بنگلے کے اندر داخل ہو گئے۔ پھر ایک بڑے سے خوبصورت  
 اور سجے سجائے کمرے میں آ گئے۔ ضرورت کی ہر بیش قیمت اور جدید اشیاء سے مزین  
 اس کمرے کی شان و شوکت نے میزبان نظریں خیرہ کر دی تھیں۔ ہم دبیز قالین پر چلتے  
 ہوئے..... جوتے اتار کر ایک صوفے کے پاس کھڑے ہو گئے۔

جائے گی۔“

”اونہیں..... یہ تو خود..... اپنے گاؤں جانا چاہتا ہے۔“ وہ بولا۔  
 ”..... اس بے چارے کا باپ مر گیا ہے۔ ماں اور جوان بہن گاؤں میں  
 اکیلے رہ گئے ہیں..... ان کا ایک ٹکڑا ہے چھوٹا سا یہ اب وہیں جا کر اسے سنبھالنا چاہتا  
 ہے..... اور دراصل یہ مالک کو تب تک چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جب تک انہیں دوسرا.....  
 باڈی گارڈ نہیں مل جاتا..... ماجد ذرا نمک حلال قسم کا آدمی ہے ناں۔“  
 ”باڈی گارڈ.....؟ میں ہولے سے بڑبڑایا۔

”اوئے تجھے باڈی گارڈ..... کا مطلب نہیں پتہ؟ پہلا والا چونک کر مستقر ہوا  
 تو میں جلدی سے بولا۔

”آہو جی..... معلوم ہے..... باڈی گارڈ کا مطلب..... محافظ ہوتا ہے جی.....  
 وہ تو میں خوشی سے بڑا بڑا تھا۔“

”اچھا ٹھیک ہے.....“ سر ہلا کر چپ ہو رہا پھر پوچھا، کوئی روٹی دوٹی بھی  
 کھائی ہے؟

میں نے سوئی کے بھوکا ہونے کی خاطر جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر اس  
 نے وہیں ایک ٹیلی فون سیٹ (انٹرکام) پر کسی ہاتھ نامی ملازمہ سے دو افراد کا کھانا  
 لانے کا کہا۔

ذرا دیر بعد..... ایک ادھیڑ عمر کی ملازمہ، کھانے کی ٹرے اٹھائے وہاں آئی۔  
 وہ دونوں باہر چلے گئے۔ میں نے اور سوئی نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ  
 ہو کر ہم بیٹھے ہی تھے کہ..... اچانک باہر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ  
 گیا کہ..... صاحب لوگ آ گئے تھے۔

”دیکھ شو کے! میں نہ کہتی تھی کہ..... اللہ ہماری دعا سن لے گا..... ہمیں یہاں  
 ضرور کام مل جائے گا۔“

سوئی نے معصومانہ خوشی سے کہا تو میں اس سے بولا۔ ”..... مگر میں تجھے کام  
 کرنے نہیں دوں گا..... اب یہ دعا کر ہمیں سر چھپانے کیلئے ہی ادھر ہی کہیں چھت بھی

صوفہ پر ایک ادھر سوئڈ بوئڈ شخص براہمان تھا۔ اس کی عمر..... پچاس سے کم طور کم نہ تھی۔ اس کے ہمراہ ایک بیس بائیس سالہ زرق برق لباس پہن بڑے کردفرے ساتھ بیٹھی تھی وہ بہت خوبصورت تھی۔ جیسی شہری لڑکی کو ہونا چاہئے تھا مگر میری سوئی۔ زیادہ نہیں۔

میں نے جھٹ صاحب کو سلام کر دیا۔ انہوں نے سر کے خفیف اشارے اکتفا کیا۔ پھر سامنے سے بولا۔

”..... یہی ہے وہ لڑکا..... جس کے بارے میں تم بتا رہے تھے۔“

”ہاں..... جی یہی ہے۔ وہ..... ساجھا بولا۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی میرا نام شوکت حسین ہے۔“

”گاؤں میں کیا کرتے تھے؟“

”وہ جی چودھری کی زمینوں کی رکھوالی کرتا تھا..... ٹریکٹر چلایا کرتا تھا۔“

”..... پھر اپنے مالک کو چھوڑ کر شہر کیوں آ گئے؟“

”وہ جی..... بس ویسے ہی گاؤں سے دل کھٹا ہو گیا تھا میرا..... چودھری کے

اوباش بیٹوں نے..... میری زنانی کے ساتھ بدتمیزی کرنا شروع کر دی تھی۔“ میں۔ دانستہ دروغ گوئی سے کام لیا۔

”اچھا..... میرے باڈی گارڈ بنو گئے؟“

”ہاں جی..... کیوں نہیں..... ویسے تو سب کی محافظہ اللہ پاک کی ذات سے

ہوتی ہے..... اس پر زیادہ بھروسہ کرنا چاہئے..... بھلا ایک معمولی انسان دوسرے محافظ کیسے بن سکتا ہے۔“

میرے ساتھ کھڑے ساجھے نے مجھے ہلکی سی کہنی ماری اور سرگوشی میں ڈپٹ کر کہا۔

”..... اوئے بے وقوف..... یہ کیا بول رہا ہے؟ میں ذرا گڑبڑا سا گیا۔ مگر میں

نے دیکھا صاحب کے چہرے پر میری صاف گوئی پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

”ٹھیک ہے..... تم واقعی درست کہتے ہو..... میں سمجھتا ہوں کہ تم..... پر بھروسہ کرنا چاہئے۔“

”اوہو..... قمر الدین! تم اس اجڈ پینڈو کو اپنا باڈی گارڈ بناؤ گے..... ڈیم فول..... یہ تو بے وقوف لگتا ہے.....“ وہ زرق برق لباس والی لڑکی نے خاصی بے تکلفی سے صاحب سے کہا اور میں اس کے طرز مخاطب پر بری طرح چونک پڑا۔ میں ان دونوں کو باپ بیٹی سمجھ رہا تھا اب تک..... مگر..... مجھے کچھ اور ہی لگ رہا تھا اور جو بھی لگ رہا تھا وہ میرے لئے..... باعث عجب و تعجب ہی تھا۔

”تم خاموش رہو..... زریں! میں نے فیصلہ کر لیا ہے“ قمر الدین نامی اس بھلے مانس صاحب نے اسے جھڑک دیا اور وہ منہ بسور کر رہ گئی، پھر وہ صاحب ساجھے سے تحکمانہ لہجے میں بولے۔

”..... اوئے ساجھے! تو ان دونوں کو سرونٹ کوارٹر دکھا دے اور آج ہی سے اسے سب کام سکھا دے.....“

”جی..... بہت بہتر.....“ وہ مودبانہ لہجے میں بولا۔ اتنے میں ماجد نے قمر صاحب سے کہا۔ ”صاحب جی! اب تو مجھے چھٹی مل جانی چاہئے..... وہاں گرائیں میں میری بے بے جی اورنگی بہن کے سوا کوئی نہیں۔“

”ہاں..... تم اپنا حساب کتاب کر لو..... تمہیں اجازت ہے۔“

اس کے بعد ساجھا عرف ساجد مجھے ایک کمرے اور مختصر سے صحن والے تنگ و تاریک کوارٹر میں لے آیا۔

”چل بھی..... تیرا تو کام ہو گیا۔ میں دوبارہ آتا ہوں..... تجھے کام سمجھا دوں گا۔“

ساجھے نے کہا اور چلا گیا۔

کوارٹر جیسا بھی تھا ہم دونوں کیلئے کافی تھا۔

ذرا ہی دیر میں سوئی برقع اتار کر گھریلو عورت کی طرح اسے چکانے میں لگ گئی۔

یعنی..... زرینہ سے شادی کر لی۔ اس میں سے بھی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی..... حالانکہ..... ان کی اس دوسری شادی کو پورے دو سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا تھا۔

بہر طور..... زرینہ بیگم نے مجھے دیکھ کر منہ سا بتالیا تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا وہ جواب دیئے بغیر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں کھڑا رہا۔ اتنے میں قمر صاحب برآمد ہوئے۔ انہوں نے ایک طائرانہ سی نظر مجھ پر ڈالی..... میں نے جھٹ سے اپنی پیشانی پر ہاتھ لے جا کر سلام کر دیا۔ وہ نئے سوٹ پتلون میں خاصہ وجہہ نظر آرہے تھے۔ ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ وہ شاید کہیں جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چابیوں کا کچھا تھا۔ شاید گاڑی کی چابیاں تھیں۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ مجھ سے بولے اور پھر میں باآدب ان کے عقب میں چلتا ہوا باہر کھڑی ان کی شاندار کار کے قریب آ گیا۔ وہ خود ہی کار چلاتے تھے۔ اس لئے میں نے جلدی سے کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اس میں براجمان ہو گئے کہ میں بھی عقبی سیٹ کا دروازہ کھول کر بندوق سنبھالے بیٹھ گیا۔

اگلے ہی لمحے انہوں نے کار اشارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

”تمہیں گاڑی وغیرہ بھی چلانی آتی ہے ناں..... معاً انہوں نے کار سڑک کی طرف موڑتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں جی..... بالکل میں چلا لیتا ہوں گاڑی۔“ میں نے فوراً مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

”گڈ..... وہ بولے۔“ کیا نام بتایا تھا تم نے.....“

”وہ جی..... شوکت..... شوکت حسین“ میں نے جلدی سے اپنا نام بتایا۔

”ہاں بھئی..... شوکت حسین..... تم مجھے ایک وفادار اور قابل اعتماد آدمی نظر آتے ہو۔“ انہوں نے عجب سے لہجے میں کہا تو میں بولا۔

”..... میں انشاء اللہ آپ کے اس اعتبار کی لاج ضرور رکھوں گا۔“

”گڈ..... وہ بولے۔ پھر اس کے بعد وہ کسی بڑے فائو اشار ہوٹل کے قریب پہنچے وہاں انہوں نے ایک پر تکلف پارٹی کی میز بانی کی اور رات گئے..... ہم واپس گھر

تھوڑی دیر بعد سا جھانجھے کام وغیرہ سمجھانے کیلئے آ گیا۔

کوارٹر..... بنگلے کے عقبی حصے میں تھا۔ میں خوشی خوشی سا جھانجھے کے ساتھ.....

کیمین روم میں آ گیا۔ یہاں اس نے مجھے ایک چست سا پتلون نما لباس دیا۔ یہ محافطوں والی مخصوص وردی تھی۔ پھر اس نے مجھے ایل جی کے کارتوس والی ایک بندوق اور پٹی دیدی۔ پھر راز دارانہ لہجے میں بولا۔

”..... دیکھ اوئے! صاحب..... بہت اچھا آدمی ہے..... تیرے کام سے اگر وہ خوش ہو گئے تو سمجھ تیرے پوہ بارہ ہو جائیں گے۔“

”ہاں جی..... میں بھی خوب دل لگا کر اپنا کام کروں گا..... صاحب کو کبھی بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“ میں نے فدیوانہ لہجے میں مستعدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... اب تو اپنے کوارٹر جا..... اور شام ٹھیک چھ بجے صاحب کے پاس آ جانا.....“ اس نے کہا اور میں ”جی اچھا“ کہہ کر..... واپس کوارٹر میں آ گیا۔

سوئی مجھے محافطوں والی پتلون بش شرٹ میں دیکھ کر حیرت آمیز خوشی سے بولی۔

”واہ رے شو کے! تو تو بالکل شہری بابو بن گیا؟“

”..... اچھا لگ رہا ہوں ناں.....“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”..... بالکل سوہنا شہزادہ لگ رہا ہے.....“ وہ بولی۔

”..... صاحب! تجھے کتنی تنخواہ دیں گے؟“

”ظاہر ہے..... اتنے وڈے بنگلے کے مالک ہیں صاحب..... تنخواہ بھی اچھی خاصی دیں گے..... ویسے میں نے پوچھا نہیں ہے..... ابھی..... شاید خود ہی بتا دیں؟“

پھر سا جھانجھے کی ہدایت کے مطابق میں ٹھیک 6 بجے شام کو صاحب کے کمرے میں پہنچا..... سب سے پہلے زرینہ سے میری مد بھیڑ ہو گئی..... سا جھانجھے نے مجھے بتا دیا تھا کہ..... زرینہ بیگم..... قمر صاحب کی دوسری بیوی ہیں۔ پہلی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس میں سے کوئی اولاد نہ تھی۔ پھر انہوں نے جانے کیوں اپنی بیٹی جتنی عمر کی لڑکی.....



لوٹے۔

یوں اب میرا یہ روز کا معمول بن گیا۔

میں صبح سویرے ان کی کار میں بیٹھ کر ان کے شاندار دفتر جاتا تھا وہ بہت بڑا کاروبار کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہونے لگا..... کہ ان کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ ساتھ ہی میں نے ایک بات یہ بھی محسوس کی تھی کہ..... وہ اپنی بیوی..... زرینہ بیگم سے ناخوش تھے۔ مجھے ان میاں بیوی کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی..... لیکن میں نے محسوس کیا کہ..... قمر صاحب مجھ پر غیر معمولی بھروسہ کرنے لگے تھے..... اس کا اندازہ مجھے اس دن ہوا۔

میں حسب معمول..... قمر صاحب کے ساتھ واپس لوٹ رہا تھا..... اس روز قمر صاحب معمول سے ذرا جلدی گھر لوٹ رہے تھے۔ وقت یہی کوئی سہ پہر 3 بجے کا ہوگا ورنہ تو وہ شام سات بجے اور کبھی تو دس بجے بھی لوٹتے۔

بہر طور..... گھر لوٹے تو صاحب نے مجھے ایک گھنٹے بعد ملنے کو کہا۔ میں یہی سمجھا شاید..... انہوں نے کسی تقریب وغیرہ میں جانا ہوگا۔

بہر طور..... میں کھانا وغیرہ کھا کر قیلولہ کرنے لیٹا اور..... ٹھیک ایک گھنٹے بعد..... صاحب کے کمرے میں آ گیا۔ مجھے وہاں غیر معمولی سناٹے کا احساس ہوا۔ بعد میں پتہ چلا کہ بیگم صاحب..... کہیں گئی ہوئی ہیں۔ قمر صاحب..... وہیں صوفے پر براجمان تھے اور فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ میں ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ بات ختم کر کے..... صوفے پر براجمان ہوئے اور پھر مجھے بھی اپنے سامنے والے صوفے پر براجمان ہونے کے لئے کہا..... مگر میں نے منفعل سی مسکراہٹ سے کہا..... ”نہیں جی..... میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

”بیٹھو..... میں جو کہہ رہا ہوں.....“ انہوں نے اس بار تحکمانہ لہجے میں کہا اور پھر میں ذرا جھجکتے ہوئے ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک میری نظر..... ان کے عقب میں ایک بڑی سی کھڑکی کے آگے جھولتے ہوئے پردے پر پڑی..... وہ مجھے تھوڑا تھوڑا ہلتا ہوا نظر آیا۔ میں یک دم اٹھ کھڑا ہوا..... اور جلدی سے اپنی بندوق

سیدھی کر لی۔ سامنے بیٹھے قمر صاحب بری طرح چونکے..... وہ سمجھے شاید میں نے ان پر بندوق تان لی ہے۔ تب میں نے پردے کے عقب سے ایک سیاہ نال جھانکتی ہوئی دیکھی۔ میں نے فوراً قمر صاحب والے صوفے پر چھلانگ لگا دی اور قمر صاحب سمیت الٹ گیا۔ کمرے میں گولی چلنے کا دھماکہ ہوا، پردے کے پیچھے جو بھی چھپا ہوا تھا اس نے عقب سے درحقیقت قمر صاحب کے سر کا نشانہ لے کر فائر کیا تھا..... مگر..... صوفہ الٹ جانے کی وجہ سے ان کا نشانہ خطا ہو گیا تھا اور گولی انہیں لگنے کے بجائے میرے بائیں بازو کا گوشت چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے اپنی تکلیف کی پرواہ کئے بغیر پردے پر چھلانگ لگا دی اور بندوق کا ٹھوس کنڈا جھانکتی ہوئی نال پر رسید کر دیا۔ مجھے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے پردے کے عقب سے ایک کیم شیم نقاب پوش شخص ابھرا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا..... میں اس اچانک حملے کیلئے بالکل تیار نہ تھا۔ نتیجتاً میرے قدم لڑکھڑا گئے اور بندوق بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر..... دینر قالین پر جا پڑی..... کیم شیم شخص فوراً اپنے گرے ہوئے پستول کو اٹھانے کیلئے جھکا تو میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھ کر اس پر چھلانگ لگا دی اور زور سے اس کی پشت پر رات مار دی۔ وہ ذرا پرے جا گرا..... مگر اس دوران وہ بد بخت اپنا پستول اٹھا چکا تھا۔ اس نے فوراً مجھ پر فائر جھونک مارا مگر میں خطرہ محسوس کرتے ہی نیچے جھک گیا۔ اور نیچے بیٹھے بیٹھے میں پھر کی طرح گھوما اور اپنی دائیں لات اس کی دونوں ٹانگوں پر جڑی اور اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے۔ وہ دھپ سے گرا..... مگر اس نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور جیسے ہی اس کا رخ میری طرف کرنے کی کوشش کی میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

اب ہم دونوں گھم گھما ہو گئے تھے۔ اس کی ساری کوشش اپنے پستول کی بھیانک سیاہ نال کا رخ میرے چہرے کی طرف موڑنے پر تھی جبکہ میں پستول اس سے جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم دونوں میں کشاکش زور آزمائی جاری تھی وہ بے شک ایک کیم شیم اور توانا شخص تھا..... مگر کم میں بھی نہ تھا۔ پھر ایک موقع پر نال کا رخ میرے چہرے کی طرف

”..... کوئی تکلیف تو نہیں محسوس ہو رہی تمہیں۔“ صاحبہ کے کمرے سے نکلے ہی قمر صاحب نے نرم لہجے میں مجھ سے کہا۔

”نہیں جی..... یہ معمولی سا زخم ہے، میں اب ٹھیک ہوں..... مگر..... صاحب! ہمیں پولیس کو رپورٹ درج کرا دینا چاہئے..... ابھی اسی وقت۔“ میں نے کہا تو ان کے چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔

”..... میں پہلے ہی اس کی رپورٹ کرا چکا ہوں..... مگر..... ابھی تک اس کا کوئی حل نہیں نکلا۔ وہ بولے اور میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”..... جی صاحب جی! میں سمجھا نہیں..... کیا اس سے پہلے بھی آپ پر قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے؟

”ہاں..... اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ..... یہ کس کی حرکت ہے؟ وہ بدستور پر اسرار لہجے میں بولے۔

”کک..... کون..... ہیں وہ لوگ صاحب جی؟..... آ..... آپ انہیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے..... میں نے کہا۔

”..... اس طرح تو صاحب! آپ کی جان کو خطرہ لاحق رہے گا۔“ ان کے کلین شیو چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔

”وہ مجرم..... میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت رہتا ہے۔ بس میں اسے کسی طرح رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا ہوں.....“ ان کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میں چپ رہا۔

وہ دوبارہ بولے..... ”شوکت! مجھے تمہاری بہادری نے بہت متاثر کیا ہے..... آج اپنی جان پر کھیل کر تم نے میری زندگی بچائی ہے..... اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ..... تم پر بھروسہ کر کے میں نے غلطی نہیں کی۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ بولے۔

”..... تمہیں ساری بات بتانا پڑے گی لہذا غور سے سنو۔“

”..... مجھ پر اس سے پہلے بھی دوبار قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے مگر اللہ کے فضل

ہونے لگا۔ صرف ایک لمحے کی دیر تھی اس نے لیلی دبا دی ”دھائیں“ سے گولی چلی اور مجھے گولی کی آتشیں جھپک بالکل اپنی کپٹی کے قریب ہی محسوس ہوئی تھی۔ میرے اندر ایک ایسی جنونانہ طاقت دوڑ گئی اور پھر میں نے اپنے سر کی ایک زوردار ٹکرا اس کی نقاب میں چھپی ہوئی ناک پر رسید کر دی..... اس کے حلق سے کریمہ انگیز چیخ خارج ہوتے ہی پستول پر اس کی گرفت نرم پڑ گئی اور دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی کلائی کو زوردار جھٹکا دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور لڑھک گیا۔ اس کی نقاب خون سے بھر گئی..... مگر ہمت اس نے بھی نہیں ہاری اور..... نجانے کس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنی ٹانگ سکیٹر کر گھٹنے کی ضرب میرے پیٹ پر جڑ دی۔ میں تکلیف سے کراہ کر رہ گیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپا اور میری دست برو سے نکلتا چلا گیا۔ اس اثناء میں گولیاں چلنے کی آواز سے سا جھا بھی دروازے پر نمودار ہوا مگر..... وہ خونی نقاب پوش اسے دھکا دے کر باہر دوڑتا چلا گیا۔ میں اور سا جھا اس کے پیچھے لپکے..... مگر وہ تو چھلاوے کی صورت چشم زدن میں غائب ہو چکا تھا۔

تھک ہار کر ہم واپس کمرے میں لوٹے..... اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ..... قمر صاحب صوفہ سیدھا کئے بڑے آرام سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اس پر براجمان تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو..... ان کی آنکھوں میں اب ایک سگار دبا ہوا تھا۔

”ساجھے! اس بہادر لڑکے کی مرہم پٹی کرو..... جلدی“ وہ گھمبیر لہجے میں ساجھے سے بولے۔ سا جھا جلدی سے ایک بکس اٹھائے دوبارہ نازل ہوا۔ یہ فرسٹ ایڈ بکس تھا۔ جس پر سرخ رنگ کا جعبہ والا نشان نظر آ رہا تھا۔

اس نے وہیں میرے بازو کی مرہم پٹی (ڈریسنگ) کرنا شروع کر دی۔ شکر تھا کہ گولی صرف بازو کا گوشت چمید کر نکل گئی تھی۔ ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ میری مرہم پٹی کرنے کے بعد ساجھے نے دو درد کش (پین کٹر) گولیاں مجھے دیں اور پانی کا گلاس تھما دیا۔ میں نے دونوں گولیاں گڑک لیں۔

”تم جاؤ ساجھے.....“ معا..... قمر صاحب نے اسے جانے کو کہا اور سا جھا خاموشی سے باہر نکل گیا۔

سے میں چتا رہا ہوں..... اور مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والا شخص کوئی اور نہیں..... بلکہ میری بیوی زرینہ ہے.....“

مجھ پر حیرتوں کا ہمالیہ ٹوٹ پڑا.....“ نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ بیگم صاحب بھلا آپ کی جان کیوں لینا چاہے گی۔“

”میری بات غور سے سنتے رہو۔“

”جی صاحب جی۔“

”..... اس میں میری ہی غلطی ہے..... مجھے اتنی کم عمر لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ..... شاید میں محبت سے ہی زرینہ کا دل جیت لوں گا..... مگر اب مجھے اس تلخ حقیقت کا اندازہ ہونے لگا ہے کہ زرینہ نے مجھ سے محض دولت کی خاطر شادی کی تھی..... اور اب وہ..... مجھے اپنے کسی گناہ عاقل کے ذریعے قتل کروادینا چاہتی ہے..... تاکہ میری ساری دولت اس کے نام ہو جائے.....“

میں اب ان کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس لئے.....

پر تشویش لہجے میں بولا۔

”صاحب جی! اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ کو..... فوراً ایسی جان کی دشمن بیوی سے چھٹکارا پالینا چاہئے۔“

”ہاں..... مگر میں چاہتا ہوں..... مجھے اس کا ٹھوس ثبوت مل جائے..... کیا خبر..... میرا خیال غلط ہو..... اس لئے تم آئندہ محتاط رہنا اور کوشش کرنا کہ..... اس گناہ قاتل کو بھاگنے نہ دو۔“

”ٹھیک ہے جی..... میں آپ کی بات سمجھ گیا۔“ میں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

”..... اور ہاں..... اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا..... تمہیں اب پہلا کام یہ کرنا ہے کہ..... زرینہ کی جاسوسی کرنا ہوگی..... وہ کس سے ملتی ہے..... اور کہاں کہاں جاتی ہے مگر اس پر نگاہ رکھو گے کہ زرینہ کو یہ بات معلوم نہ ہو سکے۔“

”جی..... صاحب جی..... میں سمجھ گیا۔ آپ کی بات کا مطلب..... میں نے

کہا پھر انہوں نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ میری طرف بڑھائے..... یہ رکھ لو..... تمہاری بہادری اور جان نثاری کا تو میں کوئی انعام نہیں دے سکتا..... کیونکہ وہ انمول ہے..... یہ میری خوشی کی خاطر رکھ لو..... اور اپنی صحت بناؤ..... اور ہاں..... تمہاری تنخواہ میں نے پندرہ ہزار مقرر کی ہے۔“

میرا حیرت و خوشی سے منہ کھل گیا۔ ”یہ..... یہ..... تو بہت زیادہ ہیں صاحب جی۔“

”تم واقعی بھولے ہو..... رکھ لو..... میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ میں نے وہ نوٹ جیب میں رکھ لئے، پھر میں واپس کوارٹر میں آ گیا۔ سوئی کا دہشت کے مارے برا حال تھا۔ میں اس کی سراسیمہ حالت پر تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

”کک..... کیا ہوا سوئی؟ میں نے پریشانی سے پوچھا۔ وہ لپک کر مجھ سے چٹ گئی۔

اس کا پورا وجود خوف و دہشت سے لرز رہا تھا۔

”وہ..... وہ..... اندر.....“ اس نے انگلی کے اشارے سے کمرے کی طرف مجھے متوجہ کرنا چاہا۔ میں جلدی سے کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی دروازے کے قریب ہی ذرا پہنچا تھا کہ..... اچانک..... اندر سے مجھے ان گنت کئے ہوئے سرفضا میں معلق نظر آئے..... ان کی کئی ہوئی گردنوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ کریہ صورت کئے ہوئے سروں کے چہرے بہت ڈراؤنے تھے اور سرخ انگارہ آنکھوں میں مقناطیسی چمک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سب خوفناک قہقہے لگاتے ہوئے..... میرے قریب آنے لگے..... میں نے خوفزدہ ہونے کے بجائے..... صحن کے کونے میں رکھا ہوا ڈنڈا اٹھالیا اور..... پوری قوت سے ان پر برسانے لگا۔ دو تین سر پھٹ کر..... فرش پر گر پڑے۔ اور چیخنے چلانے لگے..... باقیوں نے..... مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھے بال برابر بھی گزند نہیں پہنچا رہے تھے..... ماسوائے اس کے کہ..... مجھے دہشت زدہ کرتے..... میں نے انہیں بھی نہیں چھوڑا۔ پھر قریب ڈری سہی کھڑی..... سوئی کی طرف لپکے..... وہ چیخ مار کر باہر کی طرف

بھاگی..... میں ڈنڈا لئے..... سوئی کے تعاقب میں جاتے..... کٹے ہوئے سروں کی طرف لپکا، پھر جیسے ہی..... سوئی کو ارٹھ کا دروازہ کھول کر باہر نکلی..... وہ تمام خوفناک شکلوں والے سر..... غائب ہوتے چلے گئے۔

..... میں نے سوئی کو آواز دے کر واپس بلا لیا۔

وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ ہم اندر کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ فرش پر گرے وہ دو تین کٹے ہوئے سر بھی غائب ہو گئے تھے۔ ”یہ ضرور اس مردود جگہ دوش کی شرارت ہوگی۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”شو کے..... یہ مردود شیطان آخر کب ہمارا پیچھا چھوڑے گا؟“ سوئی بے چاری تنگ آ کر بولی۔

”بس..... اب اس کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں..... سوئی؟ میں اسے طفل تسلی دیتے ہوئے بولا..... حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ خود مجھے نہیں معلوم تھا کہ..... یہ بات میں کس بھروسے پر کہہ رہا تھا۔ جگہ دوش کوئی معمولی ساحر نہ تھا۔ وہ ہندوستان کے کالے جنگلوں کا ہی نہیں..... بلکہ پاتال کی منحوس گہرائیوں کا بھی بے تاج بادشاہ تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ..... میں اب چیلا رام والے واقعہ کے بعد سے خبیث جگہ دوش کی موت کے راز سے واقف ہو چکا تھا..... مگر یہ کام بھی ملی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والی بات تھی اور میرا ذہن اس جوڑ توڑ میں ہمہ وقت مصروف رہتا تھا کہ..... آخر..... اسے کس طرح جلتی سلگتی آگ میں جھونکا جائے..... وہ کوئی معمولی انسان تو تھا نہیں کہ..... اسے بہ آسانی اٹھا کر آگ کے جہنم میں جھونک دیا جاتا اور پھر اب اوپر سے قمر صاحب کی ذمہ داری بھی میرے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔

قمر صاحب نے اس واقعہ کے بعد سے ایک انٹر کام میرے کوارٹر میں بھی لگوادیا تھا۔ ایک روز قمر صاحب نے اس پر اسرار قاتل کو چھاپنے کا بڑا خطرناک منصوبہ بنایا۔

”صاحب جی! اس میں تو آپ کی جان کو بھی خطرہ ہوگا؟ میں نے پر تشویش لہجے میں کہا۔ تو وہ تنگی سے مسکرا کر بولے.....“ جو شخص ہماری نظروں سے اوجھل رہ کر حملے کرے تو ایسے موذی سے ہمیشہ کیلئے جان چھڑانے کا ایک یہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ

چارے کے طور پر خود کو پیش کر دیا جائے۔“

قمر صاحب کی ذومعنی گفتگو پر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا..... ان کی یہ بات میرے دماغ میں گردش کرنے لگی.....

”جو شخص ہماری نظروں سے اوجھل رہ کر حملے کرے تو ایسے موذی سے ہمیشہ کے لئے جان چھڑانے کا ایک یہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ خود کو چارے کے طور پر پیش کر دیا جائے۔“

میں نے اب اچانک ہی اپنے دل میں سوچا کہ..... اگر میں بھی جگہ دوش کو جلتی آگ میں جھونکنے کیلئے یہی طریقہ اس مردود پر آزماؤں تو وہ یقیناً نابود ہو سکتا ہے؟

”کیا سوچنے لگے؟“ مجھے سوچوں میں مستغرق پا کر..... اچانک قمر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

”وہ..... وہ..... نہیں جی..... کچھ نہیں“ میں جلدی سے بولا۔

”بس تو پھر تم چوکس رہو..... وہ بولے اور میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

خفی گوشے میں گھات لگائے بیٹھ گیا۔ یہ باغ کا وہ حصہ تھا جدھر سے میں با آسانی چہار اطراف، اندرونی و بیرونی نگاہ رکھ سکتا تھا۔ ٹھیک نصف گھنٹے بعد..... قمر صاحب بھی ٹریک سوٹ میں ملبوس ہو کر باغ کی نرم نرم شبی گھاس پر ننگے پاؤں چہل قدمی کرنے لگے۔ میری نظریں گرد و پیش کا جائزہ لینے میں محو تھیں اور تب اچانک میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں..... میں نے ایک مشتبہ شخص کو..... باغ کے جنوبی گنج میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی حرکات و سکنات مجھے مشکوک محسوس ہوئی تھیں اور تب میں نے اسے ایک پودوں کے خاصے بڑے جھنڈ کی آڑ لیتے دیکھا۔ میرا اس سے فاصلہ..... تقریباً پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھا۔ میں فوراً محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ میری ایک ٹک نظریں اس پر جم سی گئی تھیں اور اٹھائے راہ..... میں نے اپنا پستول بھی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا..... اچانک میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آن اٹکا..... اس مشتبہ شخص نے فوراً ایک ریوالور نکال کر..... باغ کے وسط میں چہل قدمی کرتے ہوئے..... قمر صاحب کا نشانہ لیا۔ گویا..... اب قمر صاحب میرے رحم و کرم پر تھے مگر انہیں یقین تھا کہ..... میں بھی وہیں کہیں ان پر ”حفاظتی“ نگاہ رکھے ہوئے ہوں..... پھر اس سے پہلے کہ وہ قاتل..... قمر صاحب پر گولی چلاتا۔ میں نے اس پر گولی چلا دی۔ باغ میں چند اور بھی لوگ چہل قدمی اور ورزش وغیرہ میں مصروف تھے۔ گولی چلنے کے دھماکے پر وہ سب چیختے چلاتے ہوئے بھاگے..... میری گولی قاتل کی ٹانگ زخمی کر چکی تھی۔ کیونکہ..... وہ لنگڑا تھا..... وہ راہ فرار اختیار کر رہا تھا۔ قمر صاحب خطرہ بھانپتے ہی ایک جگہ دبک گئے تھے۔ میں باغ کی بیرونی دیوار کے ساتھ دوڑتا ہوا..... راستہ کاٹتا اس قاتل کے قریب جا پہنچا..... وہ مجھے دیکھ کر بری طرح ٹھنکا۔ میں نے اسے موقع دیے بغیر..... چھاپ لیا اور پستول بھی اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ میں اسے قابو کر چکا تھا۔ کچھ دوسرے لوگ بھی آگئے تھے۔

وہ پراسرار قاتل..... وہی یحیم شمیم شخص تھا۔ جس نے کچھ روز پہلے بھی قمر صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور وہ میری وجہ سے بال بال بچے تھے۔ بہر طور..... قاتل کو فوراً پولیس کے حوالے کر دیا اور اس نے سب کچھ اگل دیا۔

قمر صاحب کا اس پراسرار قاتل کو پکڑنے کا منصوبہ جتنا خطرناک تھا اتنا سادہ بھی..... چونکہ انہیں یقین کی حد تک اپنی بیگم زرینہ پر شبہ تھا کہ..... ان پر قاتلانہ حملہ..... درحقیقت ان کی بیگم کے اشارے پر ہی ہو رہا تھا اس لئے قمر صاحب نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ..... وہ زرینہ بیگم کو سب سے پہلے نہایت چالاکی کے ساتھ..... اپنے نئے معمول کے بارے میں بتائیں گے کہ..... وہ روزانہ صبح سویرے اکیلے..... باہر ایک قریبی باغ میں ہلکی پھلکی ورزش اور چہل قدمی کیلئے جایا کریں گے..... مگر انہوں نے اسے یہ بات نہیں بتائی کہ..... درحقیقت..... قمر صاحب..... قریبی باغ میں..... اکیلے تو چہل قدمی وغیرہ کرنے کیلئے جائیں گے..... مگر..... میں ان سے دور رہ کر..... ان پر اور ان کے گرد و پیش پر کڑی نظر رکھوں گا..... اور جیسے ہی کسی مشکوک شخص کو..... ان کا نشانہ لیتے دیکھوں تو میں فوراً اسے چھاپنے کی کوشش کروں گا۔“

اب قمر صاحب کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ..... زرینہ سے ذکر کرنے کے بعد..... وہ ضرور اپنے پراسرار عاشق (قاتل) کو خبر کر دے گی..... تاکہ اس کا ”کام“ آسان ہو جائے۔

اب ہمارا یہ روز کا معمول ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے میں منصوبے کے مطابق اپنا حلیہ بدل کر..... باغ کے اطراف میں مڑگشت کرتا۔ قمر صاحب نے ساری احتیاطیں مد نگاہ رکھی تھیں لہذا مجھے لمبی چوڑی بندوق دینے کے بجائے انہوں نے ایک اڑتیں بور کا لائسنس یافتہ ریوالور بھی دلادیا تھا۔ خود انہوں نے اعشاریہ بیس بور کا پستول کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اپنے پاس حفاظت کے طور پر رکھ لیا تھا۔ تیسرے روز کا ذکر تھا۔ میں حسب معمول..... قمر صاحب کے نکلنے سے آدھا گھنٹہ پہلے..... باغ کے ایک مطلوبہ اور

قصہ کوتاہ..... وہ قاتل..... درحقیقت زرینہ بیگم کا عاشق ہی تھا۔ دونوں نے یہی منصوبہ بنایا تھا کہ..... قمر صاحب کو قتل کرنے کے بعد وہ دونوں اس کی دولت پر قبضہ کر لیں گے..... اور پھر شادی..... اس کا نام یاد رہا تھا۔

بہر طور..... قمر صاحب نے..... زرینہ بیگم کو فوراً طلاق دے کر اپنی جان چھڑالی۔

مگر انہوں نے مجھے نہیں چھوڑا تھا۔ انہوں نے مجھے اور سوہنی کو اپنی اولاد سمجھ لیا تھا اور ہمیں سروٹ کوارٹر سے نکال کر اپنے شاندار بنگلے میں رکھ لیا تھا۔

میرے اندر اب ایک نئی ہلچل مچ گئی تھی۔

بالآخر ایک روز میں نے..... قمر صاحب کو جگدوش کے بارے میں ساری حقیقت بلا کم و کاست سنا ڈالی۔ پہلے تو انہیں..... اس دہشت ناک اور لرزہ خیز کتھا پر یقین ہی نہ آیا مگر..... چونکہ وہ مجھ پر کامل بھروسہ کرنے لگے تھے۔ اس لئے انہیں میری کہانی میں یقین آ گیا۔ لہذا وہ میرا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے بولے..... ”برخوردار! جس طرح تم نے میری مدد کی ہے..... اس طرح میں بھی تمہاری مدد کروں گا..... میں شہر کے ایک بہت بڑے عامل کا دل کو جانتا ہوں..... بھوت پریت پکڑنے کا ماہر ہے..... میں اسے بھاری فیس..... دیکر اس جن (جگدوش) کو پکڑنے یا نابود کرنے پر رضامند کر لوں گا۔“ ان کی بات پر میں نے ایک پھسکی مسکراہٹ سے کہا۔ ”انکل (ان کے اصرار پر میں اور سوہنی انہیں ”انکل“ کہنے لگے تھے) جگدوش بذات خود ایک زبردست عامل اور ساحر ہے..... وہ کسی چھوٹے موٹے عامل کے بس کی بات نہیں ہے..... مگر اسے ہلاک کرنے کا طریقہ صرف میں ہی جانتا ہوں..... جو بظاہر بہت مشکل ہے..... یہ بتاتے ہوئے میں نے انہیں..... جگدوش کی حتمی موت سے متعلق وہ راز بتا دیا۔

”..... یہ کون سا مشکل کام ہے پھر.....؟ قمر صاحب یکدم بولے۔

”..... جس طرح میں نے اپنی جان کے دشمن اس موذی قاتل کو چھانسا تھا تم

بھی وہی طریقہ کیوں نہیں اپنالیتے۔“

”ہاں..... میرے دماغ میں بھی..... اس منحوس شیطان جگدوش کو صفحہ ہستی

سے مٹانے کا یہی منصوبہ آیا تھا..... مگر۔“

”اگر..... مگر چھوڑو..... کسی بڑے دشمن کو نابود کرنے کیلئے تھوڑا بہت تو اپنی جان کا رسک لینا ہی پڑتا ہے..... وہ یکدم بولے۔ تو میں نے کہا ”مگر انکل! مجھے اپنی پروا نہیں..... لیکن..... سوہنی؟“

”اسے کچھ نہیں ہوگا..... تم اللہ پر بھروسہ رکھو.....“ وہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے بولے۔

”..... ہم آج ہی سے ایک کام کرتے ہیں..... کہ..... سنو میرا منصوبہ۔“

یہ کہہ کر وہ مجھے جگدوش کو چھانسنے کی منصوبہ بندی بتانے لگے۔

جب وہ اپنی بات مکمل کر چکے تو..... یکدم..... سرگوشیاں لہجے میں بولے۔

”..... کیا جگدوش ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر ہمارے منصوبے سے آگاہ تو نہیں ہو گیا ہوگا؟“

ان کی بات پر میں نے مسکرا کر اپنے دائیں بازو کی قمیض اوپر کر کے وہاں بابا کمال شاہ کا بندھا ہوا تعویذ انہیں دکھا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”جب تک اللہ پاک کا یہ کلام میرے ساتھ ہے..... وہ شیطان مجھ پر چھپ کر وار نہیں کر سکتا..... اور تاہی میرے سامنے وہ نظروں سے اوجھل رہ سکتا ہے۔“

میری بات پر قمر صاحب نے طمانیت کی سانس لی۔ اس وقت سوہنی بھی وہاں ہمارے ساتھ موجود تھی۔ اس منصوبے پر وہ بھی راضی تھی کیونکہ وہ بھی ہمیشہ کیلئے..... اس موذی شیطان سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہم نے اس رات اپنے منصوبے کی ابتداء شروع کر دی۔

اس کے لئے ہم نے شہر کے مضافات میں ایک ویران جگہ کا انتخاب کیا اور..... چند مزدوروں کو ایک دن کی ٹکڑی دیہاڑی دیکر..... تقریباً پچاس ساٹھ فٹ گہرا اور لگ بھگ بیس فٹ چوڑا گڑھا کھدوا ڈالا..... پھر اس کے اندر خشک جھاڑیاں ڈال کر بہت سارا پٹرول چھڑک کر ان جھاڑیوں اور خشک پرالی کو بالکل تر بتر کر دیا۔

گڑھا چونکہ..... سرے تک بھر دیا گیا تھا اس لئے..... بادی النظر میں..... وہ سپاٹ زمین کا منظر پیش کر رہا تھا..... پھر اس کے بعد ہم نے سوئی کو ایک پیرائے میں اس طرح سمجھا دیا کہ..... اس نے کیا کرنا تھا؟ میں نے ساتھ ہی سوئی کو تسلی بھی دی تھی کہ..... وہ بالکل خوفزدہ نہ ہو..... اور یہ کہ..... ہم قریب ہی چھپے بیٹھے ہیں..... میرے پاس جب تک بابا کمال شاہ کا پڑھا ہوا تعویذ ہے..... جگدوش ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا.....“

سوئی..... ایسے حالات سے گزر چکی تھی اس لئے..... ہمت کر کے..... وہیں..... گڑھے کے سرے پر بیٹھ گئی..... میں اور..... قمر صاحب..... ہاتھ میں لائین پکڑے..... قریب کی جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گئے.....

ہمارے آس پاس..... گھنی اور خود رو جھاڑیوں کا جنگل سا تھا.....

..... ہر سو خاموشی طاری تھی۔ رات کے بھیانک تاریک سناٹے میں دور کہیں آوارہ کتوں اور گیدڑوں کے رونے چلانے کی منحوس آوازیں آرہی تھیں۔ ماحول میں آسپی سناٹا چھا گیا تھا۔ سوئی نے منصوبے کے مطابق ہولے ہولے..... سسکتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔

جنگل میں..... اس کے رونے کی آواز بڑی پراسرار محسوس ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا اس کا یہ رونا مصنوعی تھا۔ میں اور قمر صاحب دم سادھے بیٹھے تھے۔

ہماری نظریں سوئی پر جمی ہوئی تھیں۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔

اچانک آسمان پر نکلے طباق چاند کی روشنی میں میں نے..... سوئی کے عقب سے ایک دیوہیکل ریچھ نما ہیولہ سامنہوار ہوتے دیکھا۔

میں نے یک لخت اپنی سانس روک لی تھی۔ قمر صاحب نے جو ایک آنکھ والے اس بد ہیئت جانور کو دیکھا تو وہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے اور..... زیر لب آئینہ کریمہ کا ورد کرنے لگے۔ میں محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک..... جگدوش نے سوئی کے قریب آ کر پیچھے سے اس کے کاندھے پر اپنا پنجہ نما ہاتھ رکھ دیا۔ سوئی یک دم خوف زدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جگدوش کو ایک بھیانک عفریت کے روپ میں دیکھ کر تھر تھر کانپنے

لگی۔ میں اندر سے ڈر بھی رہا تھا کہ سوئی واقعی خوفزدہ ہو کر..... ہماری طرف نہ دوڑ پڑے ورنہ..... سارا کھیل بگڑ جاتا۔ مگر خیریت گزری کہ سوئی نے کمال ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود پر قابو پایا اور روہانے لہجے میں..... جگدوش سے بولی۔

”جگدوش! میں اب ایسی خوفزدہ والی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں..... تو مجھے اپنے ساتھ لے چل..... اس کی بات سن کر..... میں نے دیکھا جگدوش کی اکلوتی خوفناک آنکھ میں ایک پراسرمت چمک ابھری..... اور پھر اس کی خراٹے دار آواز ابھری۔“

”میں تو تجھے پہلے ہی کہتا تھا کہ..... میں تجھے اپنی رانی بنا کر رکھوں گا..... مگر تو..... اس دو نکلے کے چھوکرے..... شوکت کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ مجھے لگتا ہے..... اس نے شاید تنگ آ کر تجھے چھوڑ دیا ہے۔ پر تو فکر نہ کر..... اس سارے جیون میں کیول میں ہی تیرا..... دوست متر ہوں..... آ..... چل میرے ساتھ.....“

یہ کہہ کر اس نے سوئی کا نرم و گداز ہاتھ تھام لیا۔ میری کنپئیاں سلگنے لگیں اور دل جیسے..... سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ میں اب پوری طرح محتاط ہو کر بیٹھ گیا تھا..... ادھر سوئی نے بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے چالاکی سے کہا تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے..... شوکت نے مجھے چھوڑ دیا ہے..... مگر.....“ وہ یہ کہہ کر گڑھے کے بالکل سرے پر سرک آئی..... اور دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا..... جگدوش کامیابی کے مسرت انگیز جوش میں اسے پکڑنے کیلئے بے تاب سے آگے بڑھا تو تب تک میں جنگلی بلے کی طرح..... جھاڑیوں کے تاریک سلسلوں کی آڑ لیتا ہوا..... اس کے عقب میں ابھرا اور لائین سنبھالتے ہوئے دیوانہ وار اس کی طرف دوڑا..... ٹھیک اسی وقت جگدوش کو خطرے کا احساس ہوا اور جیسے ہی اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھنے کی کوشش کی تو تب تک میں اس کے بالکل سر پر پہنچ چکا تھا پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بڑے زور سے گڑھے میں دھکا دے دیا۔ اس کے حلق سے وحیانہ غراہٹ ابھری اور دوسرے ہی لمحے وہ گڑھے کے اندر تھا۔ او پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی منتر پڑھتا میں نے لائین کی لو اونچی کر کے..... اس کا گلوب سر کا یا اور اسے گڑھے میں اچھال دیا..... پٹرول سے تر بہ تر خشک جھاڑیوں اور پرالی نے چشم زدن میں آگ پکڑ لی۔ جگدوش کا

بدبیت وجود شعلوں کی زد میں آ گیا۔ آگ کے سامنے وہ بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ سوئی میرے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ جگدوش کی بھیانک اور جگر پاش چیخوں سے پورا تاریک ویرانہ لرزنے لگا۔

قمر صاحب بھی ہمارے ساتھ آ ملے تھے۔

ہم تینوں گڑھے سے ذرا دور کھڑے..... جگدوش مردود کے منحوس وجود کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اس کا بھی چیلارام جیسا حشر ہوا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد..... جگدوش کی اذیت ناک اور آخری دل ہلا دینے والی چیخ ابھری اور پھر..... ہر سوسناٹا چھا گیا۔

جگدوش مردود و ملعون کے جہنم واصل ہوتے ہی..... میں اور سوئی..... پرست چیخ مار کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

پھر قمر صاحب نے ہم دونوں کے سروں پر..... ازراہ شفقت ہاتھ پھیرتے ہوئے ملائمت آمیزی سے کہا۔

”چلو بچو..... ظالم شیطان اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

میں اور سوئی نے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر ایک نظر..... بھڑکتے ہوئے شعلوں کی جانب دیکھا اور..... قمر صاحب کے ساتھ قدم بڑھا دیئے..... ذرا فاصلے پر ان کی کار ہماری منتظر تھی..... اور ایک نئی اور خوشیوں بھری زندگی بھی..... جس کے میں اور سوئی حقدار تھے۔

(ختم شد)